بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝

تو خدا جس شخص کو راہِ راست دکھلانا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام (کی دولت) کے واسطے (صاف اور) کشادہ کر دیتا ہے۔ اور جس کو گمراہی کی حالت میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو تنگ دشوار گزار کر دیتا ہے گویا (قبول ایمان) اس کے لئے آسمان چڑھنا ہے جو لوگ ایمان نہیں لاتے خدا ان پر برائی کو اسی طرح مسلط کر دیتا ہے۔ اور (اے رسولؐ) یہ (اسلام) تمہارے پروردگار کا (بنایا ہوا) سیدھا راستہ ہے۔ عبرت حاصل کرنے والوں کے واسطے ہم نے اپنے آیات تفصیلاً بیان کر دیے ہیں۔ (سورۃ الانعام: آیت ۱۲۵، ۱۲۶)

فصلنامه
راہ اسلام
شماره : ۱۹۲ – اپریل تا جون۲۰۰۵ء

امام خمینیؒ
حالات وخدمات

(خصوصی شمارہ)

خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران۔ ۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی -۱۱۰۰۰۱
فون :-۲۳۳۸۳۲۳۲،۳۳،۳۴ فیکس:- ۲۳۳۸۷۵۴۷
http://www.iranhouseindia.com
director@iranhouseindia.com

راہ اسلام

ایڈیٹر،پرنٹروپبلشر:

جلال تملہ

معاونین علمی:

ڈاکٹر علی محمد نقوی

ڈاکٹر اخترمہدی رضوی

تزئین کار	:	مجید احمدی وخانم عائشہ فوزیہ
کمپوزنگ	:	قاری محمدیاسین
پریس	:	اے۔ ایس ٹائپ سیٹر4903گراؤنڈ فلور چاندنی چوک دھلی۔۱۱۰۰۰۶
ناشر	:	خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ۱۸ ۔تلک مارگ۔نئی دھلی ۔۱۱۰۰۰۱

راہ اسلام میں شائع ہونے والے ہر مقالے کا
اسلامی جمہوریہ ایران کے نظریات کے مطابق ہونا لازمی نہیں ہے۔

اس شمارے میں

اداریہ	ادارہ	۷
حالات وخدمات:		
حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ	ادارہ	۱۱
امام خمینیؒ کا تاریخ ساز پیغام گورباچف کے نام	امام خمینیؒ	۳۶
مت سہل ہمیں جانو!	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	۴۴
امام خمینیؒ کی زندگی کی خصوصی داستانیں	حجۃ الاسلام شیخ علی اکبر آشتیانی	۴۹
امام خمینیؒ اور اسلامی انقلاب کے فضائل وکمالات	حجۃ الاسلام والمسلمین سید حسن خمینی	۶۱
امام خمینیؒ اور امت اسلامیہ کی قیادت	مولانا حسن عباس فطرت	۷۸
امام خمینیؒ اور.... اسلامی جمہوریہ کا قیام: تاریخی جائزہ	پروفیسر سید عزیز الدین حسین	۹۴
اعتقاداتی مباحث:		
امام خمینیؒ اور قرآن	استاد جعفر سبحانی	۹۸
امام خمینیؒ اور اسلامی وحدت واتحاد	مولانا اسحاق مدنی	۱۱۴
امام خمینیؒ کے افکار وعقائد کی روشنی میں وحدت واتحاد	حجۃ الاسلام سید احمد خمینی	۱۲۷
عیسیٰ مسیحؑ سے متعلق ہر بات ایک معجزہ تھی	امام خمینیؒ	۱۳۸

اداریہ: محمد اسلام

امام خمینیؒ اور عصری قیادت

اس دنیا میں انسان کی تخلیق سے قبل خداوند عالم نے زمین کا فرش بچھایا اور اسے طرح طرح کے گل بوٹوں سے آراستہ کیا اور اس میں ایسی دلکش چیزیں بھی خلق کیں جن کی رعنائیوں کو دیکھ کر انسان متوالا اور ان مخلوقات کا دلدادہ بن جائے۔ بالخصوص ایسے حالات میں جب کہ اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کردیا گیا ہو اور اسے یہ بھی بتادیا گیا ہو کہ یہ تمام نعمتیں خداوند عالم نے حضرت انسان کے لئے خلق کی ہیں۔ نعمت ورعنائیوں کی فراوانی میں راہ حق کی نشاندہی کے لئے قائد وقیادت کی موجودگی لازم ہوجاتی ہے اور خداوند عالم نے اسی مطالبہ کی تکمیل کے لئے حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت خاتمؐ تک الٰہی قائدوں اور رہنماؤں کا ایسا اہتمام کیا کہ دنیا کی کوئی قوم کل خداوند عالم کی بارگاہ عالیہ میں یہ فریاد نہ کرسکے کہ تو نے تاریکیوں اور گمراہیوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں ہماری ہدایت ورہنمائی کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔

واضح رہے کہ خداوند عالم اپنے بندوں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے بالکل انوکھا انداز اختیار کرتا ہے وہ فرعون جیسے گنہگار، نافرمان اور باغی بندے کے لئے حضرت موسیٰؑ جیسے مقدس نبی کو اس کے پاس بھیجتا ہے۔ دنیوی حکمراں جب کسی کے پاس اپنا نمائندہ بھیجتے ہیں تو اس کام کیلئے ہم منصب اور ہم رتبہ کا انتخاب کرتے ہیں لیکن خداوند عالم فرعون کے پاس موسیٰ علیہ السلام کو بھیج کر یہ اعلان کرنا چاہتا ہے کہ ہم نے جن لوگوں کو اس دنیا میں انسان کی شکل میں بھیجا ہے وہ ہمیں بے حد عزیز ہیں چاہے انسان کی شکل میں وہ فرعون ہی کیوں نہ ہو بلکہ ہم تو فرعون کی ہدایت ورہنمائی کے خواہاں ہیں۔ پتہ چلا کہ ہمارے اور خدا کے درمیان رابطہ کی

بنیاد عشق ومحبت ہے۔ خدا وند عالم کی انسان دوستی ہی ہماری زندگی کی ضمانت ہے۔ وہ ہم لوگوں کو دوست رکھتا ہے اسی لئے اس نے ہم لوگوں کو زندگی کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے اور ہماری آئندہ کی خوشحالی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہماری ہدایت کا خواہاں ہے۔

پس ہم مسلمانوں کو خود شناسی سے کام لیتے ہوئے بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ خداوند عالم نے ہماری ہدایت ورہنمائی کے لئے اس پیغمبر عظیم الشان کا انتخاب کیا ہے جو خداوند عالم کا حبیب اور رحمت اللعالمین ہے۔ جی ہاں ! ہمارے پیغمبر کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں ہے بلکہ وہ خداوند عالم کی ایسی رحمت ہیں جس کا سایہ تمام لوگوں پر ہے۔ اسی وجہ سے پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اہلبیت بندگان خدا کی ہدایت ورہنمائی کی راہ میں ہر طرح کے مصائب جھیلتے ہیں لیکن کوئی ایسا کام انجام نہیں دیتے جس سے پیغمبر کی رحمت پر حرف آجائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حسینؑ مظلوم نے اپنی شہادت سے قبل یہ نعرہ بلند کیا تھا۔

"ان کان دین محمد لم یستقم الا بقتلی فیا سیوف خزونی"

یعنی اگر نانا کے دین کو میرے قتل کے بغیر بقا حاصل ہونے والی نہیں ہے تو اے تلوارو! آؤ میرے گلے لگ جاؤ۔

جی ہاں ! پیغمبر اکرم، ان کے اہلبیت وائمہ علیہم السلام کے بعد غیبت کبریٰ کے زمانے میں امت اسلامیہ کی قیادت ورہنمائی کی یہ ذمہ داری باصلاحیت علماء وفقہاء کے سپرد کی گئی ہے اور امام خمینی کا ولایت فقیہ کا فلسفہ درحقیقت اسی مکتب فکر کا نچوڑ اور فقہ جعفری کا عظیم عطیہ ہے جس کے ذریعہ امام خمینی نے بیسویں اور اکیسویں صدی کے نام نہاد اور اسلام دشمن دانشوروں کی اس بات کا منہ توڑ جواب فراہم کر دیا کہ اسلام اور جمہوریت کے درمیان تال میل ممکن نہیں ہے۔ یہ وہی جماعت ہے جس نے ماضی قریب میں دین اور سیاست کے درمیان جدائی اور علیحدگی کا راگ الاپتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کو ذلت آمیز زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

جی ہاں ! سیاسی بیداری سے مالا مال قائد کی حیثیت سے امام خمینی نے ہی یہ اعلان

کیا کہ مذہب اور سیاست کے درمیان کسی قسم کا اختلاف یا علیحدگی ممکن نہیں ہے بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے سیاست عین دیانت اور دیانت عین سیاست ہے۔ اسلام میں سیاست کا مطلب شریعت اسلامی سے دوری وعلیحدگی ہرگز نہیں ہے بلکہ اگر سیاست مذہبی اصول واقدار سے الگ ہوجائے تو پھر اس میں لوٹ کھسوٹ، تباہی وغارتگری اور نابودی وچنگیزی کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہ جاتا اور اگر سیاست دین ومذہب کے دامن سے وابستہ رہے تو پھر اس میں مکر وفریب، سود وطلبی جمع خوری، زرپرستی وذخیرہ اندوزی کا امکان نہیں رہ جاتا۔ ان اصولوں کی پیروی کرنے والا قائد پوری طرح نڈر رہوا کرتا ہے اور طاقتور دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہوئے انھیں یہ بتادیتا ہے کہ خداوند عالم کی لازوال طاقت پر بھروسہ کرنے والے بڑی طاقتوں سے گھبرایا نہیں کرتے بلکہ اپنی ایمانی قوت کے ذریعہ باطل کی نیند حرام کردیتے ہیں۔ البتہ ایسے قائد کو اپنی ایمانی اور انقلابی سرگرمیوں کے دوران گرانقدر قربانیاں پیش کرنی پڑتی ہیں۔ جلاوطنی کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے اور مصائب کو گلے لگائے ہوئے چاہنے والوں کو خاک وخون میں غلطاں دیکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ امام خمینی کو بھی ان سبھی مراحل سے گزرنا پڑا اور عراق میں جلاوطنی کی زندگی کے دوران سابقہ شاہی حکومت کے جلادوں نے نجف اشرف میں جب ان کے بڑے بیٹے مصطفیٰ خمینی کو بیرحمی کے ساتھ شہید کرڈالا اور اس کے بعد ان کا ردعمل معلوم کرنے کے لئے جب رائیٹر نیوز ایجنسی کے نمائندہ نے ان سے پوچھا کہ خمینی صاحب! بڑے افسوس کی بات ہے کہ دشمنوں نے آپ کے نوجوان بیٹے کو قتل کرڈالا۔ کیا ایک لمحے کے لئے بھی آپ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ اگر آپ انقلابی سرگرمیوں سے دور رہتے تو آپ کو اپنے نوجوان بیٹے کی موت کا یہ دردناک منظر نہ دیکھنا پڑتا۔'' امام خمینی نے اس کی ہمدردانہ گفتگو کا مختصر مگر درس آمیز جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ ''مصطفیٰ ایک گرانقدر ودیعہ وعطیہ الٰہی تھے جو اس کی بارگاہ عالیہ میں واپس چلے گئے۔'' دوسری طرف اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ان کے اردگرد جمع لوگوں نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ان کے دوسرے فرزند سید احمد خمینی کو ایران

کا صدر یا وزیر اعظم بنادیا جائے تو آپ نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ ''احمد جہاں ہیں وہیں ٹھیک ہیں۔''

جی ہاں ! جو لوگ حقیقی اسلام محمدی کی پیروی کرتے ہیں اور امریکی اسلام کو اچھی طرح پہچانتے ہیں وہ خود پرستی اور مرتبہ واقتدار کی ہوس میں مقصد کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے چاہے ان کی ذات بری طرح پامال ہی کیوں نہ ہوجائے کیونکہ عظیم الٰہی مقصد کی راہ میں مجاہد کی ذات اور اس کی اولاد وملاک کی نابودی وپامالی مقصد کی بقا کی ضمانت ہواکرتی ہے۔ امام خمینی اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ ان کے بیٹے مصطفیٰ خمینی کی شہادت انقلاب کی راہ میں شہادت سے ہم آغوش ہونے والے دیگر شہیدوں کی طرح اسلامی انقلاب کو کامیابی عطا کرنے میں مدد ومعاون ہوگی۔

جی ہاں ! یہ امام خمینی جیسے وسیع القلب قائد کی ذات تھی کہ ملت اسلامیہ کے ہر فرزند کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ دشمنوں نے ان سے ایک مصطفیٰ چھینا تو خداوند عالم نے اس پدر امت کے اردگرد ہزاروں نہیں لاکھوں مصطفیٰ جمع کردئے اور ان کی وفات کے موقع پر ساری دنیا نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ ایرانی عوام اپنے پدر امت کا سوگ کس انداز میں منارہی ہے اور ہر سال ان کی وفات کی برسی کے موقع پر صرف ایران ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کے دور افتادہ دیہاتی علاقوں میں ان کی یاد میں مجلس عزا کی تشکیل ان کی عظمت ومقبولیت کی دلیل ہے۔

جی ہاں غور طلب بات ہے کہ امام خمینی کے پاس ایسی کونسی گرانقدر چیز موجود تھی جس کے ذریعہ انھوں نے عصری قیادت کی اتنی بڑی ذمہ داری کو ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا کہ دنیا انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ دولت و سرمایہ کچھ اور نہیں بلکہ عشق کا گنجینہ ہے جس کے ذریعہ انھوں نے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی ہے اور آئندہ آنے والی نسلیں بھی خمینی کے عشق کی گرویدہ رہیں گی۔ حافظ شیرازی نے شاید ایسے مرحلہ کے لئے ہی یہ شعر لکھا ہے۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

❁❁❁

حضرت امام خمینیؒ

حالات وعظیم خدمات

انقلاب اسلامی ایران کے قائد عظیم الشان امام خمینیؒ کی جانگداز موت نے دُنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات کو اتنا برانگیختہ کردیا کہ تاریخ کے دامن میں اس کی مثال نظر نہیں آتی۔ ان کی وفات کی خبر پھیلتے ہی عالم اسلام رنج وغم اور نالہ وشیون کے دریا میں ڈوب گیا اور غمزدہ انسانوں کا سیلاب مسجدوں اور دینی مرکزوں کی طرف اُمنڈ پڑا اور سوگواری وعزاداری کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ لوگ سر و سینہ پیٹ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے مسلسل اشک جاری تھے۔ سڑکیں سیاہ پوش عزاداروں سے بھری ہوئی تھیں اور کاروبارِ حیات کی پرواہ کیے بغیر لوگ نالہ وشیون میں مشغول تھے۔ کسی میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ دوسرے کو تعزیت پیش کرسکے۔ گویا ہر آدمی خود کو صاحبِ غم سمجھ رہا تھا۔ سماج اور سماجی سرگرمیوں سے لاپرواہ اور کم متاثر ہونے والے لوگ بھی رنجیدہ اور غمزدہ لوگوں میں شامل تھے اور پورے ملک پر ہنگامِ حشر جیسی کیفیت طاری تھی۔ تمام اسلامی ممالک میں مختلف اعتبار سے رنج وغم کا مظاہرہ کیا جارہا تھا۔ سامراجی تسلط والے ملکوں میں زندگی بسر کرنے والے مسلمان بھی گرفتاری وزدوکوب اور خوفناک سزا جیسے خطروں کے باوجود اپنے اندرونی جذبات کو روک نہ سکے اور امت اسلامیہ عالم کے قائد امام خمینیؒ کی عزاداری میں مصروف ہوگئی۔

یہ تمام حوادث انسان کو اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ خود اپنے آپ سے یہ سوال کرے کہ درحقیقت امام خمینیؒ کون تھے؟ انھوں نے ایسا کونسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ ان کی وفات نے امت اسلامیہ کے قلب کو اتنا مجروح کردیا؟ ایک ایسا آدمی جو قم، نجف اشرف اور بالآخر جماران کے اپنے حقیر و ناچیز مکان کے باہر بھی نہیں آیا تھا، اس نے دُنیا بھر کے کمزور

اور پسماندہ لوگوں سے ایسے تعلقات کیسے قائم کر لیے کہ آج اُن کی موت نے تمام لوگوں کو اس قدر غمزدہ بنا دیا کہ ان کے غم میں ہزاروں نوحے پڑھے گئے اور لاکھوں آنکھیں اشکبار ہوئیں؟ واقعی یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کون تھے؟ اور انھوں نے کیا کارنامہ انجام دیا؟

ولادت، بچپن اور ابتدائی تعلیم

امام خمینیؒ ۲۰؍جمادی الثانی ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء شہر خمین کے محلّہ سادات میں پیدا ہوئے۔ یہی تاریخ دختر پیغمبر حضرت فاطمہ زہرا(س) کی سالگرہ اور ولادت کا دن ہے۔ اس گھر میں ان کے دو بڑے بھائیوں اور تین بہنوں کی ولادت پہلے ہی ہو چکی تھی لہٰذا ان کے بچپن کا زمانہ انھیں لوگوں کے ساتھ شروع ہوا۔

امام خمینیؒ کے والد محترم آیت اللہ مصطفیٰ موسوی بھی ۲۲؍رجب ۱۲۷۸ھ کو اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے اور آٹھ برس کی چھوٹی سی عمر میں اپنے والد جناب احمد موسوی کی شفقتوں سے محروم ہو گئے تھے۔ اپنے والد کی موت کے بعد مرحوم مصطفیٰ موسوی پر گھریلو ذمہ داریوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور ان ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے اسلاف کی فقہ و اجتہاد کی راہ و روش کو جاری نہ رکھ سکیں گے لیکن ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ انھیں علم دین حاصل کرنے سے نہ روک سکا۔ چنانچہ خمین میں مرحوم آقا مرزا احمد خوانساری کی خدمت میں ابتدائی تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ حوزۂ علمیہ اصفہان کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں جو اس زمانے میں غیر معمولی شہرت کا حامل تھا۔ وہاں انھوں نے مشہور زمانہ اساتذہ سے علوم شرعیہ میں مہارت حاصل کی اور ان علوم میں مکمل مہارت حاصل کرنے کے لیے نجفِ اشرف روانہ ہو گئے۔ وہاں وہ علمی سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں اور اس زمانے کے مراجع تقلید سے اجازۂ اجتہاد حاصل کرنے کے بعد فخر المجتہدین کے لقب سے مشہور ہو جاتے ہیں اور اس طرح علمی مدارج طے کرنے کے بعد آیت اللہ مصطفیٰ موسوی اپنے وطن خمین واپس آ جاتے ہیں اور وطن والوں کے شرعی امور کی نگرانی کا کام شروع کر دیتے ہیں۔

عتباتِ عالیات میں اقامت کے دوران آیت اللہ مصطفیٰ موسوی نے علماء کی جدوجہد اور سیاسی امور میں اس طبقے کی مداخلت کو قریب سے دیکھا تھا اور تحریم تمباکو کے سلسلے میں آیت اللہ شیرازی کے فتوے کے گہرے، وسیع اور نمایاں اثرات اور شرمناک تجارتی امتیازات کی واپسی کی صورت میں سامراجیت کے شکست کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ چنانچہ خمین آنے کے بعد انھوں نے گوشہ نشینی اور درویشانہ زندگی اختیار کرنے کے بجائے اور ایک مسئلہ کو مجتہد کی شکل اختیار کرنے کے بجائے ہمت کی آستین اوپر چڑھائی اور سماجی میدان میں داخل ہوگئے اور انتہائی دلیرانہ اور بے باکانہ انداز میں معاشرہ کے کمزور و پسماندہ ومحروم عوام کی حمایت میں سرگرم ہوگئے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے علاقے کے ظالموں اور قاتلوں کی اعلانیہ مذمت شروع کردی اور اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ان کا گھر مظلوموں اور محروم و پسماندہ لوگوں کی پناہ گاہ بن گیا اور مظلوم و بے سہارا عوام ان کے سایہ میں پناہ حاصل کرنے لگے۔

علاقے کے غنڈوں، ظالموں اور قاتلوں کو شاہی دربار کی حمایت حاصل تھی لہٰذا یہ لوگ شرارت پر آمادہ ہوجاتے ہیں اور آیت اللہ مصطفیٰ موسوی کو ختم کردینے کا منصوبہ بنا لیتے ہیں۔ آخرکار علاقے کے غنڈے خمین کے راستہ میں ان پر قاتلانہ حملہ کر کے انھیں شہید کردیتے ہیں اور اس طرح آٹھ برس تک خمین والوں کی مخلصانہ خدمت انجام دینے کے بعد صرف ۴۲ سال کی عمر میں وہ شہادت کے عظیم مرتبہ پر فائز ہوجاتے ہیں۔

بچپن اور حوزۂ علمیہ میں آمد سے پہلے ان کی تعلیم

والدگرامی آیۃ الحاج مصطفیٰ موسوی کی شہادت کے موقع پر امام خمینیؒ کی عمر چار یا پانچ مہینے کی تھی لیکن بعد میں والد کی شہادت کا پورا واقعہ سننے کے بعد انھیں اپنے والد سے بڑی محبت پیدا ہوگئی اور وہ اپنے والد کی اس راہ و روش کی مدح و ستائش کرنے لگے کہ وہ مظلومین اور ستم رسیدہ لوگوں کی حمایت کیا کرتے تھے۔ بہرحال بچپن کے ابتدائی مراحل سے گزرنے کے بعد امام خمینیؒ تعلیم حاصل کرنے اور گوناگوں معلومات فراہم کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتے

ہیں۔ ابتدائی مرحلہ میں وہ مقامی عالمِ دین ملا ابو القاسم سے علم حاصل کرتے ہیں اور انھیں سے قرآن پڑھنا سیکھتے ہیں۔ اس کے بعد سات سال کی عمر میں وہ اپنی والدہ کے چچازاد بھائی شیخ جعفر سے ادبیات عرب کا درس حاصل کرتے ہیں۔ پھر ابتدائی تعلیم مرحوم میرزا محمود افتخار العلماء سے حاصل کرتے ہیں اور اس کے بعد اپنے ماموں مرحوم الحاج میرزا محمد مہدی کی شاگردی کے ساتھ ہی ساتھ اپنے بڑے بھائی آیت اللہ آقای پسندیدہ سے منطق، مطول اور سیوطی پڑھنا شروع کردیتے ہیں اور اس طرح امام خمینیؒ ۱۷ سال کی عمر تک اپنے وطن خمین میں ہی تعلیم حاصل کرتے رہے پھر اسی سال انھوں نے اصفہان جانے کا ارادہ کیا لیکن شیخ عبدالکریم اور ان کے مدرسہ کی شہرت نے انھیں اراک پہنچا دیا۔ وہاں انھوں نے حوزۂ علمیہ کے مشہور اساتذہ مرحوم محمد گلپائگانی اور مرحوم آقای عباس اراکی سے درس حاصل کرنا شروع کردیا۔ ایک سال کے بعد جب آیت اللہ حائری نے اراک سے قم کوچ کرنے کا فیصلہ کیا تو امام خمینیؒ بھی ان کے ہمراہ قم چلے گئے۔

قم میں امام خمینیؒ کی تعلیم

امام خمینیؒ اپنی مخصوص ذہانت کے ساتھ نوتشکیل شدہ حوزہ علمیہ قم میں درس حاصل کرنے لگے اور پانچ برس کے اندر یعنی ۲۲ سال کی عمر میں انھوں نے ادیب تہرانی، سیّد محمد تقی خوانساری، سیّد علی یثربی کاشانی، آیت اللہ شاہ آبادی اور شیخ علی اکبر یزدی جیسے نامور اساتذہ کی شاگردی میں دینی تعلیمات کے بلند مدارج طے کرلیے اور مرحوم شیخ عبدالکریم حائری کے درس میں شامل ہونے لگے۔ دس سال کے دوران (۱۳۴۵ھ لغایۃ ۱۳۵۵ھ) وہ اس صاحبِ عظمت استاد کی شاگردی میں اپنی علمی، فقہی اور اصولی بنیادوں کی تکمیل کے بعد ۳۳ سال کی عمر میں درجۂ اجتہاد پر فائز ہوگئے۔

اس مدت کے دوران امام خمینیؒ نے علمِ فقہ میں ممتاز حیثیت حاصل کرتے ہوئے

علومِ ہیئت و فلسفہ وحکمت وعرفان میں بھی خصوصی شہرت و مہارت حاصل کرلی اور استادِ کامل شمار کیے جانے لگے۔

رضا خاں کے خلاف امام خمینیؒ کی جدوجہد

ظلم وگھٹن اور قتل و غارتگری پر مشتمل رضا خاں کی ۱۶ سالہ حکومت کو قومی اور معنوی اعتبار سے ملک وملّت کے لیے ایک خسارہ و سانحۂ عظیم شمار کیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں آزادی کو بھی ختم کردیا گیا جو انقلاب مشروطیت اور فوجی بغاوت کے دوران حاصل تھی۔ اس طرح مکمل اقتدار کی باگ ڈور رضا خاں کے ہاتھوں میں آگئی اور ملک کی تمام تنظیمیں یعنی قوتِ عدلیہ، مقننہ و عاملہ رضا خاں کی ذاتی خواہشات کی غلام ہوگئیں اور وہ برطانیہ کے اشارہ پر رقص کرنے لگا۔

ایران میں برطانوی سیاست کو بروئے کار لانے کے لیے رضا خاں کی حتیٰ الامکان کوشش یہ تھی کہ دین کی جڑوں کو خشک کردے اور سرزمینِ ایران میں اتاترک کا کردار ادا کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے وہ طبقۂ روحانیت کو کمزور بنانے میں مشغول ہوگیا اور حکومت کی طرف سے بے پردگی کا حکم جاری کردیا، مذہبی مجالس و اجتماعات پر پابندی عائد کردی اور علماء کو فوج میں بھرتی کرنے کا حکم صادر کردیا۔ امام خمینیؒ تقریباً اسی زمانہ میں حوزۂ علمیہ قم میں داخل ہوئے تھے جب رضا خاں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔ اٹھارہ سالہ امام خمینیؒ ان اوّلین علماء میں تھے جنھوں نے رضا خاں کی اعلانیہ مخالفت کی اور اپنے اٹل موقف کے ذریعہ اس کے سامراجی منصوبوں کو پورا نہیں ہونے دیا۔ رضا خاں برطانوی سامراج کے جن منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا اس کے خلاف بھرپور جدوجہد کے لیے امام خمینیؒ نے مدرسۂ فیضیہ میں ہفتے میں دو مرتبہ دینی اجلاس کا انعقاد کیا تاکہ اسلامی روایات اور اخلاقی محاسن کی ترویج کے ذریعہ اسلام دشمن سامراجی پروپیگنڈوں کا مقابلہ کیا

جائے لیکن رضاخاں نے ان مذہبی اجلاس کی راہ میں رُکاوٹ پیدا کردی۔ آخرکار امام خمینیؒ ان اجتماعات کو ایک دُور افتادہ محلّے میں قائم کرنے پر مجبور ہوگئے جبکہ اس علاقے میں لازمی وسائل و امکانات کا فقدان تھا۔

امام خمینیؒ نے برطانوی سامراج اور اس کے غلام رضاخاں کے خلاف اپنی اسلامی جدوجہد کو جاری رکھنے کا اٹل فیصلہ کر رکھا تھا لہٰذا دنیا کی کوئی طاقت انھیں اس کام سے روک نہیں سکتی تھی۔ منقول ہے کہ ایک دن امام خمینیؒ نے ایک مسجد کے منتظم سے پوچھا کہ ''اگر رضاخاں تم سے یہ کہے کہ اپنا لباس اُتار ڈالو تو تم کیا کرو گے؟ اس نے جواب دیا کہ میں اپنے لباس کے احترام میں گھر کے اندر ہی بیٹھا رہوں گا اور گھر سے باہر نہ نکلوں گا۔ اس موقع پر امام خمینیؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں تو حسبِ معمول اپنا لباس پہن کر مسجد جاؤں گا اور لوگوں کے درمیان تبلیغ و ہدایت کا کام جاری رکھوں گا۔''

ایران تحریک کی چوکھٹ پر

فوجی تکنیک کی ترقی اور صنعتی راہ و روش کے فروغ کے ساتھ ساتھ تیل سے وابستہ بڑی حکومتوں کے درمیان رقابت شروع ہوگئی اور ایرانی تیل کے موضوع پر امریکہ، برطانیہ اور روس کے درمیان اس رقابت نے شدید روپ اختیار کرلیا اور ان میں سے ہر ایک اپنے ایجنٹوں اور غلاموں کے ذریعہ ایرانی تیل پر اپنا غاصبانہ قبضہ جمانے کی کوشش کرنے لگا۔ روس جو اس سے قبل آذربائیجان کے وسیع علاقے پر قبضہ کرچکا تھا اپنے ایجنٹوں مثلاً آذربائیجان میں پیشہ وری اور کردستان میں قاضی محمد اور ان کے ساتھیوں کے ذریعہ ایران کے دیگر علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے تودہ پارٹی کے ضمیرفروش کارکنوں کے ذریعہ اپنے شرمناک منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا کام شروع کردیا۔ معاہدہ پر کی گئی اپنی دستخط کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نے سرزمین ایران میں اپنی فوجوں کے قیام کو برقرار رکھا اور کسی قیمت پر ایرانی سرزمین خالی کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوا، لیکن جب اس کو امریکہ و برطانیہ کے مقابلے میں اپنی

کمزوری کا احساس ہوا تو اس نے تیل سے مالا مال شمالی علاقے کے بدلے میں ایران سے اپنی فوج ہٹانے کی پیشکش کی۔ امام خمینیؒ کو ان مسائل سے بخوبی واقفیت تھی لہٰذا انھیں مسلمانوں بالخصوص ایرانی مسلمانوں کی زبوں حالی پر سخت افسوس تھا اسی وجہ سے انھوں نے سامراجی چنگل سے مسلمانوں کی آزادی کو اپنا مشن بنا لیا تھا اور گرفتاری کے سیاہ ایام میں بھی وہ ایران اور مسلمانوں کی موجودہ ناگفتہ بہ حالت سے غافل نہیں ہوئے اور ہمیشہ مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی ترقی و خوشحالی کے لیے پوری طرح کوشاں رہے۔

۱۳۵۵ھ میں آیت اللہ شیخ عبدالکریم حائری کی وفات کے بعد امام خمینیؒ نے ایک آگاہ و مہربان مرجعِ تقلید کے انتخاب کے لیے بڑی کوشش کی کیونکہ امام خمینیؒ کی نظر میں مرجعیت کی شرط فقط فقہ و اصول ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے لیے موجودہ سیاسی و سماجی حالات سے آگاہی اور شجاعت و درایت کا ہونا بھی لازمی تھا۔ چنانچہ امام خمینیؒ عہدۂ مرجع تقلید کے لیے آیت اللہ بروجردی کا انتخاب کرتے ہیں کیونکہ ظلم و گھٹن کے ماحول کے خلاف انھوں نے اسلامی موقف اپنایا اور آخر تک رضاخاں کی مخالفت میں سرگرم رہے۔ اسی وجہ سے امام خمینیؒ ان کی مرجعیت کی تبلیغ کرتے رہے اور وقتاً فوقتاً انھیں اسلام دشمن سازشوں نیز ملک کے مختلف علاقوں میں بیرونی طاقت کے ایجنٹوں سے آگاہ بھی کرتے رہے اور جب کبھی سیاسی امور میں آیت اللہ بروجردی کو اپنے نظریہ کا اعلان کرنا ہوتا تھا تو وہ پہلے امام خمینیؒ سے مشورہ کر کے ان کی رائے ضرور معلوم کرلیا کرتے تھے۔ مرجعیت کی اس مہم کے ساتھ ہی ساتھ امام خمینیؒ ظلم و استبداد و سامراجیت کے خلاف اپنی اسلامی تحریک کو کامیاب بنانے میں بھی لگے رہے۔ طبقۂ روحانیت کے کمزور اور طاقتور پہلوؤں کی مکمل شناخت ہونے کی وجہ سے انھوں نے حوزۂ علمیہ اور دینی مراکز میں ایک فکری تبدیلی و بیداری کا ماحول پیدا کردیا۔ امام خمینیؒ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ اگر وہ موجودہ مسائل سے تنہا ٹکراتے رہے، اکیلے ہی اسلام دشمن سازشوں کی نابودی کی کوشش کرتے رہے تو انھیں وسیع کامیابی حاصل نہ ہوگی اور آیت اللہ مدرّس یا آیت اللہ کاشانی

کی طرح ان کی اسلامی تحریک بھی ناکام ہو جائے گی اور وہ فقط معدودے چند سامراجی سازشوں کو نابود کرسکیں گے۔ لیکن اگر انہیں کچھ ہم فکر وہم عقیدہ ساتھی مل گئے تو وہ سامراجی سازشوں کو ناکام بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ملک سے سامراج کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے کا موقع مل جائے گا اور عالم اسلام میں پھیلے ہوئے ان کے مکر وفریب کے جال کو تباہ و برباد کردیا جائے گا۔

آیت اللہ بروجردی اور آیت اللہ کاشانی کی وفات کے بعد حکومت اس بات کی جی توڑ کوشش کرتی ہے کہ آئندہ مرجع تقلید کے انتخاب میں مداخلت کا موقع مل جائے۔ حکومت کی نظر میں سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ کسی غیر ایرانی عالم دین کو مرجعِ تقلید بنادیا جائے کیونکہ آیت اللہ بروجردی اور ان کے بعد آیت اللہ کاشانی کے جنازہ میں لاکھوں مسلمانوں کی شرکت سے ارباب حکومت کو مرجعِ تقلید کی مثالی طاقت ومقبولیت کا بخوبی اندازہ ہوگیا تھا اور ان لوگوں کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ اگر کبھی عوام الناس کا اُمنڈتا ہوا یہ سیلاب حکومت کے منصوبے کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائے تو کیا ہوگا؟

صوبائی اور شہری انجمنوں کا جھگڑا

آیت اللہ بروجردی اور آیت اللہ کاشانی کی وفات کے بعد حکومت کا خیال تھا کہ اب رُوحانیت کا مسئلہ ختم ہوگیا اور چونکہ مرجعیت کے لیے کوئی غیر اختلافی شخصیت اُبھر کر سامنے نہیں آرہی ہے لہٰذا اب مرجعِ تقلید کا انتخاب و اعلان کوئی مشکل کام نہیں رہ گیا ہے لہٰذا وہ بڑی تیزی کے ساتھ ایسے قدم اُٹھانے لگتی ہے کہ آیت اللہ بروجردی اور آیت اللہ کاشانی کی زندگی میں وہ ان اقدامات کے سلسلے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ان اقدامات میں صوبائی اور شہری کونسلوں کی تشکیل کا قانون بھی شامل تھا۔ حکومت کی طرف سے منظور شدہ اس قانون کے بموجب جب قومی کونسل کے لیے منتخب ہونے والوں اور انہیں منتخب کرنے والوں کا مسلمان ہونا لازمی نہیں رہ گیا تھا نیز قرآن مجید کی قسم کھا کر حلف برداری کرنے والی شرط کو بھی عمداً نظر انداز کردیا گیا تھا۔

یہ قانون اسلامی مقدسات کی توہین اور ملک کے آئین میں اعلانیہ مداخلت کو نمایاں کرتا تھا۔ جیسے ہی علماء اور طبقۂ رُوحانیت کو حکومت کے اس قانون کی اطلاع ملی ان کے درمیان ایک ہلچل سی پیدا ہوگئی اور انھیں ایک مناسب و مؤثر ردِعمل کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ امام خمینیؒ اور قم میں مقیم دوسرے کچھ علماء نے شاہ اور مختلف صوبوں کے نامور علماء کے نام ٹیلی گرام بھیج کر اس مسئلہ میں اپنی پریشانی و سخت مخالفت کا اعلان کردیا۔ بات فقط طبقۂ علماء ہی تک محدود نہ رہی بلکہ مسجدوں اور عام محفلوں میں بھی لوگوں نے اس قانون پر اعتراض کرنا شروع کردیا کہ اگر یہ قانون واپس نہ لیا گیا تو عوام اس جدوجہد میں علماء کی حمایت کے لیے ہمہ تن آمادہ ہیں۔

اس کے بعد اسلام دشمن حرکتوں کے خلاف کی جانے والی جدوجہد میں ایک نیا مرحلہ شروع ہوجاتا ہے اور حکومت کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کی بدعنوانیوں کے خلاف علماء کی جدوجہد ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ حکومت علمائے قم کو قانون کی واپسی سے آگاہ کردیتی ہے۔ ضمنی طور پر اس تحریک کے دوران ایرانی عوام امام خمینیؒ کے چہرے سے اور زیادہ آشنا ہوجاتے ہیں اور حکومت کے خلاف علماء کی جدوجہد میں امام خمینیؒ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ اس واقعہ کے بعد امام خمینیؒ کی مقبولیت میں غیرمعمولی اضافہ ہوجاتا ہے اور دوسری طرف حکومت امام خمینیؒ پر کڑی نگاہ رکھنے لگتی ہے۔ واضح رہے کہ شرمناک قانون کی واپسی کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے جملہ علمائے قم کے نام ٹیلی گرام روانہ کیا جاتا ہے اور امام خمینیؒ کو جان بوجھ کر اس فہرست میں شامل نہیں کیا جاتا ہے تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ حکومت کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بہرحال حکومت کی طرف سے ملنے والے اس ٹیلی گرام سے علمائے تہران مطمئن ہوجاتے ہیں اور عوام اپنی کامیابی پر محفلِ چراغاں کرنے کا ارادہ کرتے ہیں لیکن اپنی غیرمعمولی ہوشیاری و دانشمندی کی وجہ سے امام خمینیؒ

لوگوں کو اس کام سے روک دیتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ جب تک حکومت اس قانون کی واپسی کا باقاعدہ اعلان نہیں کرتی ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔ صوبائی علماء کے نام ٹیلی گرام بھیج کر امام خمینیؒ انھیں بھی اپنے اس فیصلے سے آگاہ کردیتے ہیں۔ آخرکار ایک پریس انٹرویو کے دوران وزیر اعظم یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ صوبائی اور شہری انجمنوں کے سلسلے میں جو قانون پاس کیا گیا ہے اس پر عمل درآمد نہ کیا جائے گا۔

اس طرح ملّتِ اسلامیہ ایران امام خمینیؒ کی دانشمندانہ قیادت کے سایہ میں پہلی بار کامیابی کا مزہ چکھتی ہے اور امام خمینیؒ کو ''زعیم و رشیدِ ملت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

انقلاب سفید کے پردے میں سامراجی اصلاح

امریکہ کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ تھا کہ شاہی حکومت کو اپنے عوام کا اعتماد حاصل نہیں ہے چنانچہ اس حکومت کی تقویت اور ایران پر اپنے سامراجی تسلط کو قائم رکھنے کے لیے یہ لازمی تھا کہ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے وہ کوئی نیا ہتھکنڈہ استعمال کرے تاکہ ایرانی ذخائر و امکانات کی لوٹ کھسوٹ جاری رہ سکے اور دوسری طرف فریبانہ اصلاحی پروگرام کے ذریعہ عوام کے درمیان روحانیت بالخصوص امام خمینیؒ کے اثر ورسوخ کو ختم کیا جاسکے۔ چنانچہ شاہی اقتدار کے تحفظ کی خاطر چھ نکاتی نام نہاد سفید انقلاب کا اعلان کیا جاتا ہے اور استصواب عامہ کے لیے اسے عوام کے سامنے پیش کردیا جاتا ہے۔ امام خمینیؒ اس سامراجی ہتھکنڈے سے اپنے عوام کو محفوظ رکھنے کے لیے استصواب عامہ میں شرکت پر شرعی پابندی عائد کردیتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ ملّتِ ایران کو اس امریکی سازش کے خلاف اپنے ردِعمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ تہران اور قم میں لوگ مساجد میں اور مراجعِ تقلید کی رہائش گاہوں پر جمع ہوگئے۔ آخرکار ایرانی عوام نے اس استصواب کی مخالفت کا اعلان کردیا۔ اس عوامی تحریک کو روکنے کے لیے پولیس نے فوری طور پر مداخلت کی اور زدوکوب کر کے کچھ لوگوں کو گرفتار بھی کرلیا۔ ادھر

علمائے قم کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے شاہِ ایران قم کی طرف روانہ ہوجاتا ہے لیکن شاہ کی آمد کی اطلاع ملنے کے بعد بھی قم کے علماء وعوام اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے ہیں۔ شاہ اہلِ قم کے اس رویہ سے سخت ناراض ہوجاتا ہے چنانچہ حرم میں داخل ہوئے بغیر وہ شاہی قافلے کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں پر مشتمل ایک مختصر سے اجتماع میں تمام علماء و طبقۂ روحانیت کو گالیاں دینا شروع کردیتا ہے اور عوام کی نظر میں اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ ذلیل ورسوا کرلیتا ہے۔ آخرکار بہمن ماہ کی چھ تاریخ کو نمائشی استصوابِ عامہ منعقد ہوتا ہے اور شاہ کے نام نہاد سفید انقلاب کو منظوری حاصل ہوجاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد ۱۳۴۲ھ ش مطابق ۱۹۶۳ء کو نوروز کے موقع پر عام عزاداری کا اعلان کیا جاتا ہے اور لوگ امام خمینیؒ کی اس تحریک کا شاندار استقبال کرتے ہیں اور علماء وعوام کے درمیان قریبی تعلقات کے عظیم الشان مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس دوران امام خمینیؒ نے اپنی متعدد تقریروں میں شاہی حکومت کی بدعنوانیوں پر زبردست تنقید کی اور ''امسال علماء کے لیے عید نہیں'' نامی اپنے بیان میں شاہی حکومت کی اسلام دشمنی کو بالکل بے نقاب کردیا اور ٹھوس دلائل کے ذریعہ یہ ثابت کردیا کہ شاہی حکومت اسلام اور مسلمانوں کی نابودی کی خواہاں ہے۔ امام خمینیؒ اس نام نہاد سفید انقلاب کو انقلابِ سیاہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دوسری طرف حکومت اپنے جملہ وسائل و امکانات کو بروئے کار لاتے ہوئے اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ شاہی منصوبوں کے خلاف اُٹھنے والی ہر آواز کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ حکومت کے زرخرید غلام پورے ملک میں اسلامی تحریک کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کردیتے ہیں اور شاہی سلامتی تنظیم کو یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ مخالفین کو گرفتار کرکے انھیں جیل خانوں میں ڈال دے۔

حکومت کی یہ کوشش تھی کہ وہ طبقۂ علماء سے براہِ راست نہ ٹکرائے لہٰذا وہ یہ پروپیگنڈہ کررہی تھی کہ علماء شاہ کی سلامتی اور اس شاہی حکومت کی بقا کے لیے دعا کررہے ہیں۔ اس بے بنیاد پروپیگنڈہ کی وجہ یہ تھی کہ شاہی افسروں کو علماء کی غیر معمولی طاقت کا اندازہ ہوگیا تھا۔

اسی وجہ سے وہ اس عظیم طاقت سے نہیں ٹکرانا چاہتے تھے اور مختلف النوع مکروفریب کے ذریعہ وہ شرمناک منصوبے کو کامیاب بنانا چاہتے تھے۔

اسی بنیاد پر فروردین ماہ کی دوسری یا تیسری تاریخ کو شاہی افسروں کی ایک جماعت کو سادے لباس میں قم روانہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ امام خمینیؒ کی قیادت وہدایت کے سایہ میں اور علماء وعوام کے باہمی تعاون سے منعقد ہونے والی مجالس میں گڑبڑی پیدا کر کے وہاں باہمی اختلافات کی آگ بھڑکا دیں۔ ان مجالس کا مقصد انقلاب سفید کے پردہ میں پیش کی جانے والی اسلام دشمن سامراجی سازشوں کے سلسلے میں عوام کو بیدار کرنا تھا۔ ان شاہی افسروں نے لٹیروں اور ڈکیتوں کی طرح مدرسۂ فیضیہ پر دھاوا بول دیا اور مدرسۂ فیضیہ اور اس کے اردگرد قتلِ عام کا بازار گرم کردیا۔ اس قتلِ عام کی وجہ سے لوگوں میں خوف و وحشت ومایوسی پھیل گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاہی حکومت کے خلاف علماء کی اسلامی وعوامی تحریک لاثانی شکست سے دوچار ہوجائے گی، لیکن امام خمینیؒ نے بڑی بہادری سے حالات کا مقابلہ کیا اور لوگوں کو ڈھارس اور دلاسہ دیتے رہے۔ انھیں اس بات کا زبردست خطرہ تھا کہ شاہی جلاّد ان کے مکان پر بھی حملہ آور ہوسکتے ہیں لیکن وہ ہمت وحوصلہ سے کام لیتے ہوئے اپنے گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور خود آگے بڑھ کر زخمی لوگوں کا استقبال کرتے ہیں اور ضروری علاج فراہم کرنے کے لیے انھیں اسپتال روانہ کرتے ہیں۔ اس شرمناک واقعہ کے بعد امام خمینیؒ اپنے ایک بیان میں شاہی حکومت کی اس وحشیانہ وغیرانسانی حرکت کی بھرپور مذمت کرتے ہیں۔ دھیرے دھیرے اس واقعہ کی خبر ایران کے دیگر علاقوں اور اسلامی ملکوں میں بھی پہنچ جاتی ہے اور عالم اسلام میں شاہی حکومت کے مظالم کے خلاف غم وغصہ کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ آیت اللہ حکیم شاہی حکومت کے نام ایک اعتراض آمیز ٹیلی گرام روانہ کرتے ہیں اور دوسرے ٹیلی گرام میں علمائے قم کو نجف اشرف آجانے کی دعوت دیتے ہیں۔ امام خمینیؒ آیت اللہ حکیم کے ٹیلی گرام کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جس منزل پر ہیں وہاں سے واپسی کے

امکانات مفقود ہیں اور ہم لوگوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ ہم نے جو راہ اختیار کی ہے اسی پر گامزن رہیں، کامیابی یا شہادت دو چیزوں میں سے ایک بہرحال حاصل ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک ایسے ملک میں، جہاں ذلیل خاندان حکومت کر رہا ہو سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنا ذلت و رسوائی کے برابر ہے اور قرآن کریم کی پیروی کرنے والے اس ذلت و رسوائی کو برداشت کرنے والے نہیں ہیں بلکہ مُردوں جیسی زندگی پر باعزت موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ امت اسلامیہ بالخصوص علمائے اعلام باہمی اتحاد اور اسلامی اخوت کے ذریعہ سامراجی سازشوں کو شرمناک شکست سے دوچار کر سکتے ہیں۔

بہرحال مدرسۂ فیضیہ کے شہیدوں کے چالیسویں کے موقع پر مجالسِ عزا کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ حکومت کو خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ مجالسِ عزا پر پابندی لگا دی جاتی ہے اور پورے ملک میں چھوٹی بڑی انقلابی سرگرمیوں کو کچلنے کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ اسی دوران جہاد و ایثار کی تعلیم دینے والا محرم کا مہینہ آ جاتا ہے اور لبا عبداللہ الحسینؑ کی عزاداری کے ساتھ ہی ساتھ فیضیہ و دیگر علاقوں کے شہداء کی عزاداری ملک کے ہر گوشہ میں حیرت انگیز جوش و خروش پیدا کر دیتی ہے۔ حکومت احتمالی حوادث کو روکنے کے لیے یکے بعد دیگرے متعدد اقدام کرتی ہے اور لوگوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ عزائے حسینؑ مظلوم کو مظاہروں میں تبدیل کرنے سے پرہیز کریں۔

دوسری طرف امام خمینیؒ علماء و واعظین کے نام اپنے پیغام میں ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنی تقریروں میں حکومت کی بدعنوانیوں کو پوری طرح بے نقاب کر دیں اور اس کی اسلام دشمن سیاست سے اپنی نفرت و بیزاری کا مظاہرہ کریں۔ مار پیٹ اور گرفتاری سے خوفزدہ نہ ہوں کیونکہ اسلام خطرے میں ہے اور وہ لوگ ذمہ دار ہیں۔

بہرحال اسی سال تہرانی عوام نے یومِ عاشورہ کو سیاسی مظاہرہ میں تبدیل کر دیا اور اپنے فلک شگاف نعروں کے ذریعہ امام خمینیؒ اور ان کے اغراض و مقاصد کی حمایت کا اعلان بھی

کردیا۔ ادھر شہر قم پر انقلابی جوش و خروش طاری ہوجاتا ہے۔ حکومت مراسم عاشورہ کی سرگرمیوں کو روکنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے اور طرح طرح کے ہتھکنڈے بھی استعمال کرتی ہے لیکن امام خمینیؒ کی سوجھ بوجھ اور ثابت قدمی کی وجہ سے اس کی ہر کوشش ناکام ہوجاتی ہے۔

۱۵ خرداد کا خونیں انقلاب

شاہی حکومت امام کو عوام سے دور رکھنے اور ان کی مقبولیت کو محدود رکھنے میں پوری طرح ناکام ہوگئی اور ان کی ہدایت کے مطابق ملتِ اسلامیہ ایران نے شاہی حکومت کے خلاف عظیم الشان مظاہرے برپا کیے۔ شاہی حکومت کے خلاف عوامی احتجاج و بغاوت پر قابو پانے کے لیے شاہی حکومت ۱۵ خرداد کی شب میں امام خمینیؒ کو گرفتار کرلیتی ہے اور رات کی تاریکی میں انھیں قم سے تہران منتقل کردیتی ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی اہلِ قم گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور "یا موت یا خمینیؒ" کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ لوگ روضۂ معصومۂ قم کی طرف بڑھنے لگے۔ قم کے علاوہ تہران، شیراز اور ملک کے دیگر شہروں میں بھی امام خمینیؒ کی گرفتاری کے خلاف احتجاجی مظاہرے کیے گئے اور لوگوں نے حکومت کے اس شرمناک اقدام کے خلاف عوامی نفرت و بیزاری کا اعلان بھی کیا۔ ابھی اس مظاہرہ کے شروع ہونے کے بعد تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ فضا میں گولیوں کی آواز گونج اٹھی اور قم، تہران اور دیگر شہروں میں ہزاروں لوگ خاک و خون میں غلطاں ہوگئے۔

کچھ دنوں بعد حکومت پر عوام اور علماء کے غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے امام خمینیؒ کو قید خانہ سے آزاد کرکے تہران میں ایک ساواک افسر کے گھر میں نظر بند کردیا جاتا ہے۔ اس دوران امریکی اشارہ پر اس کے زرخرید غلام امینی نے ۱۹۶۱ء میں جس ایرانی قومی کاؤنسل کو منسوخ کردیا تھا، نمائشی چناؤ کے ذریعہ دوبارہ اس کی تشکیل کی اور ایرانی وزیر اعظم اسد اللہ علم، جس کے ہاتھ ہزاروں بے گناہوں کے خون میں ڈوبے ہوئے تھے اور جس نے ۱۵ خرداد اور

کئی دوسرے قتل عام بھی کرائے تھے، منصور کو اپنا جانشین بنا دیتا ہے۔ اس تبدیلی کے ذریعہ شاہی حکومت کا مقصد ایرانی عوام کے دل سے ۱۵ خرداد کے قتل عام کی یادوں کو محو کرنا تھا تاکہ قوم اور حکومت کے درمیان دوستی اور صلح کا ماحول پیدا ہو سکے۔ اس نمائشی تبدیلی کے بعد منصور کی حکومت عوام کو دھوکا دینے اور صلح و دوستی کی زمین ہموار کرنے کے لیے اپنے وزیر داخلہ کو امامؒ کے پاس ملاقات و گفتگو کے لیے بھیجتی ہے اور قتل عام کی ساری ذمہ داری سابقہ حکومت پر ڈال دیتی ہے اور ان سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ شاہی حکومت اور علمائے اسلام کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرنے کا ذریعہ و وسیلہ بن جائیں۔ اس ملاقات کے چند روز بعد امام خمینیؒ کی رہائی کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔

شہر قم اور حوزۂ علمیہ کے لوگوں کے درمیان امام خمینیؒ کی موجودگی سے عوام کو غیر معمولی رُوحانی تازگی محسوس ہوتی ہے اور امام خمینیؒ کی قیادت میں اسلامی تحریک کو نئی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ قید خانہ سے رہائی کے چار دن بعد اپنی پہلی تقریر میں امام خمینیؒ اپنے اسلامی موقف پر ثابت قدم رہنے کا اعلان کر دیتے ہیں اور اپنی اس تقریر کے دوران وہ یہ بھی اعلان کر دیتے ہیں کہ حکومت کی بدعنوانیوں کے خلاف ان کی جدوجہد جاری رہے گی اور علماء و حکومت کے درمیان صلح و دوستی کا یہ پروپیگنڈہ محض ایک دھوکا ہے۔ اس کے بعد ۱۵ خرداد انقلاب کی سالگرہ سے قبل اپنی منصوبہ بند پالیسی کے تحت شاہی حکومت ملک کے اکثر واعظین کو گرفتار کر لیتی ہے اور کسی بھی قسم کی مجلس ترحیم و تعزیت پر پابندی لگا دیتی ہے۔ امام خمینیؒ شہداء کی سالگرہ کے موقع پر قومی عزاداری کا اعلان کرتے ہیں کہ ایسے حالات میں ترکِ نصیحت اور خاموشی میرے نزدیک گناہِ عظیم اور سیاہ موت کے استقبال کی حیثیت رکھتی ہے۔

ملّتِ ایران امام خمینیؒ کے اس بیان کا استقبال کرتے ہوئے اجتماعات اور مظاہروں کا سلسلہ شروع کر دیتی ہے اور عوام و پولیس کے درمیان براہِ راست ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔

۱۹۶۳ء میں رونما ہونے والے حوادث کی روشنی میں شاہی حکومت کو اس حقیقت کا

بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ حکومت کے خلاف جاری انقلابی سرگرمیوں میں امام خمینیؒ کا اہم اور فیصلہ کن کردار ہے اور وہ مخالف جماعت کی قیادت کر رہے ہیں۔ لہٰذا شاہی حکام یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ انھیں گرفتار کر کے جلاوطن کردیا جائے۔ اس سلسلے میں فوری قدم اُٹھاتے ہوئے اسی سال ۱۳ آبان کو انھیں گرفتار کر کے ترکی میں جلاوطن کردیا گیا۔

امام خمینیؒ کی جلاوطنی

امام خمینیؒ نے اپنی جلاوطنی کے گیارہ مہینے ترکی میں بسر کیے۔ اس کے بعد شاہی حکومت نے امام خمینیؒ اور ان کی اسلامی تحریک کے خلاف نئی شیطانی سازش کا جال بچھاتے ہوئے انھیں ترکی سے نجفِ اشرف جانے پر مجبور کردیا اور اس طرح نجف میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے ہوئے امام خمینیؒ ایرانی عوام اور اپنی اسلامی تحریک کی قیادت کے فرائض انجام دیتے رہے اور اہم مواقع پر ایرانی عوام و ملّتِ اسلامیۂ عالم کے نام تاریخ ساز پیغامات بھی جاری کرتے رہے۔

ایران دوبارہ مرکزِ انقلاب بن جاتا ہے

امام خمینیؒ کی جلاوطنی و ناموجودگی کے زمانے میں شاہی حکومت کو یہ موقع مل گیا کہ ملک و ملّت کو فساد و تباہی کی طرف راغب کردے، ملکی معاملات میں اغیار و اجانب کی مداخلت کو رواج حاصل ہوجائے اور قومی سرمایہ کی خاطر لوٹ کھسوٹ پر کوئی پابندی نہ رہے، ملک پر مسلط ساواکی نظام کی مدد سے شاہ کو اپنے ان شرمناک منصوبوں میں قدرے کامیابی حاصل ہوگئی۔ وہ نیزہ کی نوک پر اپنی حکومت اور سامراجی سیاست کو باقی رکھنا چاہتا تھا۔ امام خمینیؒ سے انتقام لینے کے لیے ایک شاہی ایجنٹ کی جانب سے امام خمینیؒ کی توہین و اہانت کے لیے اطلاعات نامی اخبار میں ایک مقالہ شائع کیا گیا جس میں امام خمینیؒ کے خلاف جھوٹے اور بے

بنیاد الزامات کی بھرمار کی گئی تھی جس نے پوری ملّتِ اسلامیۂ ایران کے جذبات برانگیختہ کردیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے قم، تبریز، یزد، شیراز، تہران اور بتدریج پورے ملک میں عظیم الشان اسلامی انقلاب کی لہر دوڑ گئی، جاں بکف نوجوان انقلابی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے اور سرزمینِ ایران پر جہاد وشہادت اور ایثار وقربانی کا ماحول چھا گیا۔

دوسری طرف عراقی حکومت کی طرف سے عائد کی گئی پابندیوں کی وجہ سے ایران میں رونما ہونے والے حوادث کی مکمل اطلاع امام خمینیؒ تک نہیں پہنچ پاتی تھی اسی وجہ سے وہ لوگوں کی بروقت ہدایت اور اسلامی انقلاب کی خاطرخواہ قیادت نہیں کرپاتے تھے چنانچہ انھوں نے عراق سے فرانس چلے جانے کا فیصلہ کیا اور پیرس سے اسلامی انقلاب کی بھرپور خاطرخواہ قیادت کے فرائض انجام دینے لگے۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آ گیا جب انھیں یہ محسوس ہوا کہ اب ملّتِ اسلامیہ کے درمیان رہ کر قیادت و رہنمائی کی ضرورت ہے لہٰذا انھوں نے وطن واپسی کے سلسلے میں اپنے اٹل فیصلے کا اعلان کردیا اور جو وقت مقرر کیا تھا اسی وقت پر ایران پہنچ گئے۔ قدرشناس اور آگاہ و بیدار ایرانی عوام اپنے قائد باشعور کا استقبال کرنے کے لیے ہوائی اڈّے پر جمع ہوگئے اور ہوائی اڈّے سے بہشتِ زہرا تک عاشقینِ امام کا جمِ غفیر اکٹھا ہوگیا۔ ایران میں امام خمینیؒ کی آمد کے دس روز بعد ڈھائی ہزار سالہ شاہی حکومت کا کام تمام ہوگیا اور ملّتِ اسلامیہ کے ٹھوس ارادہ و مستحکم قیادت کے سایہ میں ایران میں اسلامی جمہوری حکومت کی تشکیل ہوگئی۔

امام خمینیؒ نے جس اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی تھی وہ معنوی ارمانات کے اصولوں پر مشتمل اور ہر قسم کی اقتدار پسندی سے دور تھی۔ اسلام حکومت کو ایسے معیاری معاشرہ کی تشکیل کا ذریعہ قرار دیتا ہے جہاں برابری، برادری، دوستی، محبت، صلح و صفائی اور عظمت و سربلندی کا بول بالا ہو اور جو انسانِ کامل کی تخلیق کا ذریعہ بن جائے۔ امام خمینیؒ اسلامی احکام اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایسی ہی حکومت کے خواہاں تھے۔ چنانچہ وہ صراطِ مستقیم و فلاح و کمال پر مشتمل

مخلصانہ بندگی کا ماحول فراہم کرنے کے لیے اس راہ پر گامزن ہوگئے۔

سامراجی ایجنٹ اس بات سے بہت ناراض تھے کہ ایران میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھ دی گئی ہے، ناراضگی کے ساتھ ہی ساتھ یہ لوگ ایسی حکومت کی تشکیل سے خوفزدہ بھی تھے۔ لہٰذا انقلاب کے ابتدائی مرحلہ سے ہی اس کے خلاف سازشوں کا جال پھیلانا شروع کردیا اور اس کوشش میں ہمہ تن مصروف ہوگئے کہ امام خمینیؒ اسلامی حکومت کی تشکیل میں کامیاب نہ ہوسکیں اور اسلامی نظامِ حکومت کو ناکوں رُکاوٹوں کا شکار ہوجائے۔

انقلاب دشمن سازشوں کی بھرمار

اسلامی انقلاب کی نمایاں شخصیتوں کے بے رحمانہ قتلِ عام، ملک میں بدامنی وقتل و غارتگری کی ترویج، فوجی بغاوت، ملک میں خانہ جنگی اور مسلط کردہ جنگ پر مشتمل مختلف سیاسی اور فوجی سازشوں کے ساتھ ہی ساتھ عالمی سامراج نے ثقافتی اور سماجی اداروں میں کام کرنے والے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ ملک گیر پیمانہ پر ثقافتی سازشوں کا جال بھی پھیلا رکھا تھا۔ واضح رہے کہ اسلامی انقلاب کے خلاف ثقافتی اور سماجی سازشوں کا سلسلہ اس کی عظیم الشان کامیابی کے فوراً بعد ہی شروع ہوگیا تھا جنھیں مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

مذہبی مطلق العنانی کی تشکیل کا پروپیگنڈہ

اسلامی جمہوریت اور مسئلہ ولایت کے سامنے آتے ہی عالمی سامراج نے اپنے ایجنٹوں کی مدد سے وسیع پیمانے پر یہ پروپیگنڈہ شروع کردیا کہ یہ ملک مذہبی مطلق العنانی کے چنگل میں گرفتار ہوگیا ہے کیونکہ جن بنیادوں پر اس حکومت کی تشکیل عمل میں آئی ہے ان کے تحت عوام کے جائز حقوق اور ان کی آزادی کو خطرہ لاحق ہوجائے گا۔ یہ مرثیہ بھی پڑھا جانے لگا کہ ہزاروں شہیدوں کی عظیم قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والی آزادی کا جلد ہی گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ غرضیکہ اس قسم کے متعدد پروپیگنڈوں کے ساتھ ہی ساتھ عوام کی ہمدردی

کے نام پر مگرمچھ کے آنسو بہائے جانے لگے۔

اگرچہ اسلامی جمہوری حکومت کی تشکیل کے بعد آہستہ آہستہ ان پروپیگنڈوں کی حقیقت عوام پر ظاہر ہونے لگی تھی اور لوگوں کو یہ اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہ محض اسلام دشمن سازشوں کا نتیجہ ہے لیکن پھر بھی ان حالات میں بعض سادہ لوح ذہنوں میں شک اور ذہنی پریشانی کا پیدا ہونا یقینی تھا لہٰذا کچھ لوگ اسلامی انقلاب سے بدگمان ہوگئے۔

اسلامی قوانین ناقابلِ عمل

چونکہ دشمنانِ اسلام کا اس مذہب کی تعمیری اور انسانی تعلیمات پر کوئی عقیدہ و ایمان نہ تھا اسی وجہ سے یہ لوگ شروع ہی سے اسلامی احکام کی تعمیل کے سخت مخالف تھے۔

چنانچہ جب اسلام اور انقلاب دشمن عناصر کے خلاف قصاص کی پالیسی اختیار کی گئی تو ان لوگوں کو پروپیگنڈہ کرنے کے لیے ایک نیا اسلحہ مل گیا اور ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سامراجی ذرائع ابلاغ میں سامراجی اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ عالمی سطح پر یہ کوشش کی جانے لگی کہ الٰہی قوانین کو عملی جامہ نہ پہنایا جائے۔ اس کام میں منافقین اور مغرب زدہ آزاد خیال لوگوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسلامی احکام وقوانین پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انھیں ناقابلِ عمل بتایا گیا۔

حجاب کی مخالفت

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہزاروں خدا طلب اور صاحبِ ایمان شہیدوں کے خون کی قیمت ادا کرنے کے بعد اور ملک کے ۹۸ فیصد عوام کے اعتماد کے سہارے جس مقدس اسلامی جمہوریت کی تشکیل عمل میں آئی تھی اس میں طاغوتی و اسلام دشمن مناظر کی جلوہ نمائی کو جائز کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اسلامی حکومت کی تشکیل کے بعد حکومت کے ذمہ دار افسروں نے یہ اعلان کیا کہ مسلمان خواتین کا باحجاب رہنا لازمی ہے کیونکہ انھیں اپنی مذہبی

روایات کا تحفظ کرنا ہے۔ یہ اعلان شہوت پرست اور شیطان زدہ لوگوں کو اچھا نہ لگا اور انھوں نے اعتراض کرنا شروع کردیا۔

سماج میں اخلاقی مفاسد کی روک تھام اور معاشرہ کی مکمل اصلاح وسلامتی کے لیے اپنائے گئے اس قانون کی مخالفت کرنے والے لوگ سامراجی ایجنٹ تھے جنھوں نے بعض سادہ لوح لوگوں کو بھی اپنا ہم خیال بنالیا تھا۔

اسلامی نظام اور عالم نما افراد:

تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کو ہمیشہ مقدس مآب افراد اور نام نہاد علماء کی ذات سے غیرمعمولی نقصان پہنچا ہے۔ عام لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے عالمی سامراج کچھ ایسے لوگوں کو اپنا زرخرید غلام بنالیتا ہے جو عالم اور مقدس ہونے کا ڈھونگ کرسکیں۔ سماج کے سادہ خیال اور سیدھے سادے لوگوں کے درمیان اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کے بعد یہ عالم نما افراد معاشرہ کو انحراف اور بے راہ روی کی طرف راغب کرنے لگتے ہیں۔

ملک میں اسلامی نظام حکومت کی تشکیل کے بعد بھی عالمی سامراج نے اپنے اس ہتھکنڈے کا بھرپور استعمال کیا لیکن محافظینِ انقلاب نے اپنی سوجھ بوجھ سے دشمن کی اس سازش کو ناکام اور ان عالم نما لوگوں کو سماج کے سامنے بالکل بے نقاب کردیا اور عوام نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ شرعی اقدام کو غیرشرعی قرار دینے والے یہ تمام لوگ وہی ہیں جو شاہی حکومت کے زمانے میں شاہ کا قصیدہ پڑھا کرتے تھے اور اسلامی انقلاب کے دوران خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہے تھے اور اسلامی نظام سے ان کی عداوت ان لوگوں کے اردگرد سامراجی ہتھکنڈوں کی موجودگی کی دلیل تھی۔

یہ محض سادہ خیالی نہیں ہے کہ ملک کی سرحدوں پر دشمن کی فوج نے قبضہ کرلیا ہے اور ان عالم نما لوگوں میں سے ایک یہ اعلان کرتا ہے کہ جنگ میں مداخلت اور دشمن کے وحشیانہ حملات سے ملک وملت کے دفاع میں مصروف سپاہیانِ اسلام کی حمایت امامِ زمانہؑ کے خلاف

جنگ کے مترادف ہے۔ یہ اعلان خود یہ بتا رہا ہے کہ یہ سامراجی خواہش ہے جس کا اعلان ان تمام نام نہاد علماء کی زبان سے کرایا جا رہا ہے۔

بہرحال امام خمینیؒ اس قسم کے حوادث اور ایسے لوگوں سے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک رنجیدہ رہے اور انھوں نے متعدد بار اپنی قوم کے سامنے اس گہرے رنج کا اظہار بھی کیا ہے۔ یہ کج فکر افراد ہمیشہ اس کوشش میں رہا کرتے تھے کہ اسلامی جمہوریہ کی طرف سے کوئی قدم اُٹھایا جائے اور وہ اس کو خلاف شرع قرار دیں۔

یہ لوگ دین سے سیاست کی جدائی و علیحدگی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے امام زمانہؑ کی عالمی حکومت سے قبل کسی حکومت کی تشکیل کو غیر شرعی قرار دیتے ہوئے اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں! اگرچہ یہ لوگ اپنے اس موقف کی وضاحت کے لیے کوئی دلیل پیش کرنے سے عاجز ہیں۔

عالمی سامراج نے ان مقدس مآب افراد کی آڑ لے کر اسلامی جمہوریت پر شدید حملے شروع کر دیئے اور سامراج غلام عناصر اسلامی انقلاب کے خدمت گزاروں کو کمیونسٹ، مذہب دشمن اور کافر و فاجر ثابت کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہوگئے تاکہ اس نظام کو موضوع سوال قرار دے سکیں اور ملّتِ اسلامیہ کے ایک بڑے حصّے کو انقلابی سرگرمیوں سے الگ کر دیں لیکن امام خمینیؒ نے اپنی دانشمندانہ قیادت کے ذریعہ اس سامراجی ہتھکنڈے کو بھی ناکام کر دیا۔

انقلاب کے خلاف انسانی حقوق کا کوڑا

انسانی حقوق درحقیقت ایک دلکش انسانی موضوع کی حیثیت سے عالمی سامراج کے ہاتھوں میں ایک حربہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور عالمی سامراج جہاں ضروری سمجھتا ہے اس حربہ کو استعمال کیا کرتا ہے۔ یہ بات دُنیا کے کسی آدمی سے پوشیدہ نہیں رہ گئی کہ سردست انسانی حقوق تنظیم ایک ایسی کٹھ پتلی کی طرح ہے جس کو دنیا کے آزاد ملکوں کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس کٹھ پتلی کا دھاگہ بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں ہے لہٰذا اشارہ پاتے ہی یہ ان کی مرضی

کے مطابق رقص کرنے لگتی ہے۔

اپنی سامراج دشمن ماہیت کی وجہ سے اسلامی انقلاب سامراجی حملات سے محفوظ نہ رہ سکا اور اس کے خلاف انسانی حقوق سے بہتر اسلحہ اور کیا ہوسکتا ہے! لہٰذا اس انقلاب کے خلاف انسانی حقوق کا یہ کوڑا شروع ہی سے ہوا میں لہرانے لگا۔

حقوقِ بشر کی حفاظت کا ڈھونگ کرنے والوں نے فلسطین، لبنان، افغانستان، عراق وغیرہ میں اپنے غلاموں کی طرف سے بے گناہوں پر کیے جانے والے وحشیانہ مظالم کو پوری طرح نظر انداز کر رکھا ہے۔ ان لوگوں کی آنکھیں ان اعلانیہ مظالم کو دیکھنے سے عاجز ہیں۔ اور دنیا کی آزاد و سامراج دشمن حکومتوں میں قیدخانوں کی زبوں حالی اور حقوقِ بشر کی پامالی کا راگ ہر وقت ان کی زبان پر رہا کرتا ہے، حالانکہ ان لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ جس ملک کی یہ لوگ بات کر رہے ہیں وہ دنیا کے کس حصہ میں واقع ہے۔ مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تنظیم بھی آزادی طلب اور عوامی تنظیموں کو کچلنے میں ہمہ تن سرگرم ہے۔

مسلمان اور اختلاف

دُنیا میں تفرقہ و اختلاف پیدا کرنا سامراج کا کامیاب ترین حربہ رہا ہے اور اب تک وہ اس حربہ کو استعمال کرتے ہوئے دُنیا کے مختلف ملکوں میں اپنے سامراجی مقاصد کو عملی جامہ پہنا چکا ہے۔

چنانچہ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد اس انقلاب کی سامراج مخالف پالیسی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انقلاب دشمن و فتنہ انگیز مراکز کی سرگرمیوں میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا اور امت اسلامیہ کے درمیان تفرقہ و اختلاف پیدا کرنے کا کام شروع کردیا گیا۔

اس سلسلے میں سامراج نے عوام کے درمیان موجود قومی اور مذہبی فرق کا بھرپور استعمال کیا اور قومی و مذہبی جنگ چھیڑ دی۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے فوراً بعد قومی کشمکش

اور شیعہ سنی مسئلہ کی ایجاد سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ عالمی سامراج اس کے ذریعہ اپنے شرمناک مقاصد کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کامیابی انقلاب کے فوراً بعد عوام پسند قومی موضوعات کے تحت قومیت کے احیاء کے لیے وسیع پروپیگنڈہ شروع کردیتا ہے اور قومی جذبات کے پردہ میں آپسی جدائی اور بٹوارہ کا راگ بھی الاپنے لگتا ہے۔ اس مقصد میں کامیابی کے لیے عالمی سامراج سنی اکثریت والے علاقوں میں داخل ہوا اور سنی شیعہ عقائدی اختلافات کو بڑھاچڑھا کر پیش کرنا شروع کردیا تاکہ دونوں جماعتوں کے درمیان جھگڑا پیدا ہوجائے۔

عالمی سامراج نے سنی شیعہ اختلافات کی آگ کو بھڑکانے میں فقط ایران کی سرحدوں کو ہی کافی نہیں سمجھا بلکہ اس نے عالم اسلام میں مسئلہ عرب وعجم کی بات شروع کی اور پھر اسلامی انقلاب کو شیعہ انقلاب بتاتے ہوئے اس عظیم انقلاب کو فقط ایک جماعت کے اندر محدود کرنے کی کوشش کی۔

عالمی سامراج اسلامی ممالک میں انقلابی اقدار کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور مسلمانوں میں اسلامی بیداری کے فروغ سے بہت خوفزدہ تھا لہٰذا اس نے اختلاف وتفرقہ بڑھانے کے لیے بھاری رقم بھی خرچ کی اور اسلامی ممالک میں اپنے مقاصد کی حفاظت کے لیے مختلف النوع افراد وعوامل کا بھرپور استعمال کیا۔ اس سلسلے میں کج فہم و انحرافی لوگ آگے بڑھے اور عالمی سامراج کی ہر ممکن خدمت انجام دینے کے لیے ہمہ تن آمادہ ہوگئے۔

امام خمینیؒ نے اسلامی انقلاب کی کامیابی کی ابتداء ہی میں عوام کو اس سامراجی سازش کی طرف بخوبی متوجہ کردیا تھا اور محافظین انقلاب کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ دانشمندانہ راہ و روش کے ذریعہ دشمن کی اس شرمناک سازش کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ چنانچہ امام خمینیؒ کی قیادت اور ملک کے ذمہ دار افراد کی ذہانت وشجاعت کے ذریعہ دشمن کی یہ سازش کافی حد تک ناکام ہوگئی۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے درمیان ٹھوس اتحاد کی زمین بھی ہموار ہوگئی اور آج عالمی سطح پر سامراج کی اسلام دشمن سازشوں کا مقابلہ کرنے

کے لیے دُنیا بھر کے سنّی و شیعہ مسلمان ایک ہی صف میں کھڑے ہوئے ہیں اور مسلمانوں نے عالمی سامراجیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک عالمی اسلامی محاذ بنا رکھا ہے اور دونوں جماعتیں مثالی اتحاد کے ساتھ اسلام دشمن طاقتوں سے برسرِ پیکار ہیں۔

زہر آلود پروپیگنڈہ

عالمی سامراج اپنے جھوٹے اور بے بنیاد پروپیگنڈے کے ذریعہ مقدس اسلامی جمہوری نظام کے چہرے کو داغدار بنانے کی ہر ممکن کوشش میں سرگرم رہا ہے اور اس سلسلے میں مختلف زہر آلود و بے بنیاد پروپیگنڈوں مثلاً ایران- اسرائیل خفیہ تعلقات! ایران-امریکہ تعلقات! اسرائیل سے اسلحوں کی خریداری! دہشت گرد گروہوں کی برآمد! اور دنیا کے فلاں حادثہ میں ایران کا ہاتھ، کا سہارا لیا ہے۔ ان جھوٹے اور بے بنیاد پروپیگنڈوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دنیا کے تمام ملکوں میں اسلامی انقلاب کے طرفداروں کو اس انقلاب سے بدگمان کردے۔

عالمی سامراج کو اس کام میں متعدد خبر رساں اداروں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبار و رسالوں کی بھرپور حمایت حاصل ہے اور ابتدائی انقلاب سے لے کر اب تک اسلامی جمہوریہ ایران کے نورانی چہرہ کو داغدار بنانے کی بارہا کوشش کرچکا ہے لیکن ہر بار انقلاب کی الٰہی اور رُوحانی برکتوں سے ان زہر آلود پروپیگنڈوں کا بھانڈا پھوٹ گیا اور اسلامی انقلاب کے خلاف عالمی سامراج کی عداوت ناکام ہوکر رہ گئی۔

اقتصادی ناکہ بندی

عالمی سامراج نے اسلامی انقلاب کے خلاف اقتصادی سازشوں کا بھی جال پھیلایا اور ایک بین الاقوامی اقتصادی دباؤ کے ذریعہ اسلامی انقلاب کو نابود کرنے کی ناکام کوشش کی۔

ان سازشوں کی فہرست میں انقلاب کے خلاف اقتصادی ناکہ بندی، تیل کی قیمت میں بھاری گراوٹ، ملک کے مالی ذخائر میں کمی اور قومی سرمایہ کو غیر قانونی طور پر ضبط کیا جانا وغیرہ شامل ہیں۔

امام خمینیؒ نے ان تمام اقتصادی سازشوں کے خلاف اپنی آواز بلند کی اور اپنی ہوشیاری و اقتصادی سوجھ بوجھ کے ذریعہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور عالمی سامراج کی ان شرمناک سازشوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا جبکہ ان میں سے ہر سازش اتنی خطرناک تھی کہ طاقتور ترین حکومتوں کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹایا جاسکتا ہے اور پہلے بھی دنیا کی مختلف حکومتوں کو ایسی سازشوں کے ذریعہ نابودی کا شکار بنایا جاچکا ہے۔

❁❁❁

حضرت امام خمینیؒ کا تاریخ ساز پیغام

میخائل گورباچف کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ساری دنیا اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ ایران میں اسلامی جمہوری حکومت کے قیام سے قبل مشرق ومغرب کی دو عظیم طاقتوں نے دنیا کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یعنی دنیا کے تمام ممالک یا مشرقی بڑی طاقت کے فرمانبردار تھے یا مغربی بڑی طاقت کے اطاعت گزار اور مشرقی بڑی طاقت کی باگ ڈور سوویت یونین کے صدر گورباچوف اور مغربی بڑی طاقت کی قیادت صدر امریکہ جمی کارٹر کے ہاتھوں میں تھی اور عالمی سیاست انھیں لوگوں کے اشارہ پر گامزن تھی اور اسلام ومسلمانوں کی سرکوبی کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔

ایسے انسانیت سوز ماحول میں ۱۱ر فروری ۱۹۷۹ء کو اسلامی انقلاب کی عظیم الشان کامیابی کے بعد امام خمینی نے دنیا میں پہلی بار نہ صرف 'نہ شرقی'' نہ غربی فقط جمہوری اسلامی'' کے نعرہ کے ساتھ دونوں بڑی طاقتوں کی بالادستی کی اعلانیہ تردید کرتے ہوئے خداوند عالم کی لازوال طاقت پر بھروسہ کرنے کی دعوت دی بلکہ پیغمبر اکرم کی سنت وسیرت پر عمل کرتے ہوئے مشرقی عظیم طاقت کے سربراہ گورباچف کی خدمت میں ایک سفارتی وفد بھیج کر انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت بھی دی۔

دعوت اسلامی پر مبنی اس پیغام کی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ اپنے اس مکتوب میں امام خمینی نے عالمی اشتراکی نظام کی ناکامی ونابودی کی آہٹ محسوس کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا تھا کہ'' آپ جس کمیونزم کی بات کر رہے ہیں وہ اب عوام کے درمیان نہیں بلکہ عجائب گھروں میں پائی جاتی ہے۔'' ان کی اس پیشین گوئی کے تھوڑے ہی دنوں بعد سوویت یونین کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ اس مکتوب کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ امام خمینی نے گورباچوف سے یونہی نہیں کہہ دیا کہ اسلام قبول کر لیجئے بلکہ آپ نے فرمایا کہ اپنے ملک کے دانشوروں کی ایک جماعت کے ذریعہ اسلام کا مطالعہ کروایئے۔ میرا یقین کامل ہے۔ اسلام میں ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بھرپور صلاحیت

موجود ہے۔ اگر آپ لوگ بھی اسلام کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے پرچم توحید کے سایہ میں آگے قدم بڑھائیں تو دنیا میں امن وسلامتی کا بول بالا ہوجائے گا۔ واضح ہے کہ امام امت نے اپنی اس تاریخ ساز راہ وروش سے یہ ثابت کردیا کہ اسلام اپنی تبلیغ کے لئے تیروتلوار یا بمباری ودھماکہ سازی کا محتاج نہیں رہا بلکہ ہمیشہ علمی اور منطقی بنیادوں پر ہی اس نے مقبولیت کی منزلیں طے کی ہیں۔ شاید یہی وہ اہم نکات تھے جن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے گورباچوف نے عالمی خبر رساں ایجنسیوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ'' مجھے فخر ہے کہ امام خمینی جیسی عظیم اور قدآور شخصیت نے اپنے پیغام کے لئے میرا انتخاب کیا ہے۔'' اس پیغام کا مکمل متن حاضر خدمت ہے۔

(ادارہ)

جناب محترم گورباچف!

صدر مجلس اعلیٰ، سوشلسٹ سوویت یونین!

آپ کی اور روسی قوم وملت کی خوش بختی و نیک بختی کی اُمید کرتے ہوئے!

جب سے آپ نے اپنا عہدہ سنبھالا ہے یہ احساس ہورہا ہے کہ آپ نے دُنیا کے سیاسی واقعات کے تجزیے خصوصاً دورِ جدید میں روس، جن مسائل سے دو چار ہے، ان کی طرف نئے سرے سے انقلاب آمیز نظر ڈالی ہے اور دنیاوی حادثات و واقعات کے سلسلہ میں آپ کے بے باکانہ فیصلوں سے ہوسکتا ہے کہ موجودہ دُنیا پر حاکم توازن میں خلل پڑے اور ایک بڑی تبدیلی رونما ہونے کا سبب بنیں۔ اس لیے میں نے چند باتوں کی طرف آپ کی توجہ کو مبذول کرنا بہتر سمجھا!

بہت ممکن ہے آپ کا دائرہ فکر اور آپ کے نئے عزائم محض پارٹی کے مسائل اور اس کے ذیل میں روسی عوام کے بعض مشکلات کا حل ڈھونڈ نکالنے تک محدود ہوں پھر بھی، جس نظریہ نے سالہا سال دُنیا کے فرزندانِ انقلاب کو اپنے آہنی حصاروں میں مقید کررکھا تھا، اس نظریہ پر اتنے دلیرانہ انداز سے آپ نے جو تجدیدِ نظر فرمائی ہے، یہ بھی قابلِ تعریف ہے۔ اور اگر اس سے کچھ اور بلند ہوکر آپ غور وفکر کریں، تو سب سے پہلا مسئلہ جو آپ کے لیے یقیناً

کامیابی کا باعث ہوگا، وہ یہ ہے کہ آپ کے بزرگوں کا جو نظریہ خدا سے دوری اور دین دشمنی پر مبنی تھا اور جس نے ملّتِ روس کو زبردست نقصان پہنچایا ہے، آپ اس نظریہ کے بارے میں تجدیدِ نظر کریں۔ اور پھر سے سوچیں۔ آپ یقین کیجیے کہ دُنیاوی مسائل کے واقعی حل کا اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ ممکن ہی نہیں ہے۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ اقتصادی میدان میں غلط طریقۂ عمل اور اقتدار پر قابض گزشتہ کمیونسٹ لیڈروں کی غلط کارگزاریاں مغربی ممالک کے سبز باغ دکھائیں، لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

اگر آپ اس سلسلہ میں سوشلزم اور کمیونزم کے اقتصادیات کی اُلجھی گتھیوں کو مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے سائے میں سلجھانا چاہیں گے تو نہ صرف یہ کہ آپ اپنے معاشرہ کے درد کا علاج نہیں کرسکیں گے بلکہ آئندہ آنے والوں کو آپ کے اشتباہات کا جبران کرنا پڑے گا، کیونکہ اگر آج مارکسزم اپنی اقتصادی و اجتماعی روش میں حائل دیوار کو عبور کرنے سے عاجز ہے تو مغربی دُنیا بھی ان ہی مسائل میں البتہ ایک دوسرے انداز سے دیگر مسائل کے تحت حادثات سے دو چار ہے۔

جناب محترم کورباچوف!

حقیقتوں سے منہ نہیں موڑنا چاہیے آپ کے ملک کی اصل مشکل مالکیت اقتصاد اور آزادی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ آپ کی تمام پریشانیوں کی اصل جڑ خدا پر اعتقاد نہ ہونا ہے، وہی مشکل جس نے مغرب کو بھی تباہی و بربادی کی انتہا تک پہنچا دیا ہے اور پہنچا کے رہے گی۔ آپ کی اصل مشکل مبداء وجود وہستی، خداوند عالم کے مقابلہ میں ایک عرصہ سے جاری فضول ٹکراؤ ہے۔

جناب محترم کورباچوف!

یہ بات سب ہی پر روشن ہوچکی ہے کہ اب اس کے بعد کمیونزم کو دُنیا کی سیاسی تاریخ کے عجائب گھروں ہی میں ڈھونڈھنا پڑے گا۔ کیونکہ مارکسی نظریہ انسان کی واقعی ضروریات کو

پورا کرنے سے قطعی قاصر ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک مادّی نظریہ ہے۔ اور آج مشرق و مغرب کا معاشرہ جس بنیادی بیماری میں مبتلاء ہے وہ ''بشریت کا معنویت پر عدم اعتقاد'' ہے اور اس بحران سے بشریت کو مادیات کے ذریعہ نجات نہیں دلائی جاسکتی۔

محترم کوربا چوف!

ممکن ہے آپ نے مقام اثبات میں مارکسزم کے بعض پہلوؤں سے روگردانی نہ کی ہو، اور آج کے بعد بھی انٹرویو وغیرہ میں اس پر اپنے مکمل عقیدہ اور اعتماد کا اظہار فرمائیں۔ مگر یہ بات آپ خود بھی جانتے ہیں کہ مقامِ ثبوت میں ایسا نہیں ہے۔

کمیونزم پر سب سے پہلی کاری ضرب چینی قیادت نے لگائی اور دوسری اور بظاہر آخری کاری ضرب آپ نے مل کر کمیونزم پر لگائی ہے۔ اب اس وقت دُنیا میں کمیونزم نام کی کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ لیکن میں آپ سے پوری سنجیدگی کے ساتھ اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ مارکسزم کی خیالی دیواروں کو توڑنے میں آپ، مغرب اور شیطان بزرگ (امریکہ) کے زندان میں گرفتار نہ ہوجائیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ دُنیائے کمیونزم کی ستر سالہ کجی کے آخری بوسیدہ نقاب کو بھی اپنے ملک اور تاریخ کے چہرے سے نوچ کر پھینک دیں گے اور اس طرح واقعی ایک قابلِ افتخار کارنامہ انجام دیں گے۔

اب آپ کی طرفدار وہ حکومتیں بھی جن کے دل اپنے وطن واہلِ وطن کے لیے دھڑک رہے ہیں، کسی قیمت پر اپنے ملکوں کے زمینی وزیرِ زمینی ذخیروں کو کمیونزم کی کامیابی کے لیے جس کی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں خود ان کے فرزندوں کے کانوں تک پہنچ چکی ہیں، خرچ کرنے پر تیار نہ ہوں گی۔

محترم کوربا چوف!

جس وقت آپ کی بعض جمہوریتوں میں واقع مسجدوں کے گلدستۂ اذان سے اللہ اکبر اور پیغمبر ختمی مرتبتؐ کی رسالت کی گواہی کی صدا ستر سال کے بعد سنی گئی۔ ''خالص اسلامِ محمدیؐ''

کے سب طرفداروں کی آنکھوں سے فرطِ شوق میں آنسو نکل آئے۔

لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ یہ موضوع آپ کے گوش گزار کردوں کہ ایک بار پھر سے مادّی و الٰہی، دونوں تصورِ کائنات کا جائزہ لیجیے۔ مادّہ پرستوں نے اپنے تصورِ کائنات میں شناخت کا معیار ''حس'' کو قرار دیا ہے اور جو چیز دائرہ حس میں نہ آئے اس کو علم کے دائرہ حکومت سے باہر جانتے ہیں۔ اور ہستی کو مادّہ کا مثل مانتے ہوئے اگر کوئی چیز مادّہ سے مبرّا ہے تو اس کا وجود تسلیم نہیں کرتے۔ اسی لیے یہ لوگ دُنیائے غیب۔ مثلاً وجودِ خدا، وحی و نبوت اور قیامت۔ کو سرے سے افسانہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ الٰہی تصورِ کائنات میں معیارِ شناخت حس و عقل دونوں ہیں۔ لہٰذا عقلی چیزیں بھی علم (سائنس) کے دائرہ حکومت میں داخل ہیں، چاہے انھیں حس اور تجربہ میں نہ لایا جاسکے۔ اس لیے ہستی! غیب و شہود دونوں کو شامل کرتی ہے اور غیر مادّی چیز بھی موجود ہوسکتی ہے۔ اور جس طرح مادّی وجود مجرد سے وابستہ ہے، شناختِ حسی بھی شناختِ عقلی پر منتکی ہے۔ قرآن نے مادّی اندازِ فکر کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے، اور جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ خدا نہیں ہے کیونکہ اگر خدا ہوتا تو دکھائی دیتا۔

''لَنْ نُؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً۔''

ارشاد ہوتا ہے:

''لَاتُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ۔''

قرآن مجید اور اس کے ان استدلالوں سے، جو اس نے وحی، نبوت اور قیامت کے سلسلہ میں فرمائے ہیں، ہم قطع نظر کرتے ہیں، کیونکہ آپ کے نظریہ کے مطابق تو پہلے یہی محلِ بحث ہے۔

اصولی طور پر آپ کو فلاسفہ کے پُر پیچ مسائل، خصوصاً اسلامی فلسفہ کے مباحثہ میں اُلجھانا نہیں چاہتا۔ صرف دو ایک بہت ہی سادہ، فطری اور وجدانی مثالیں سند کے طور پر پیش کرتا ہوں جن سے سیاست دان حضرات بھی فائدہ اُٹھاسکتے ہیں۔

یہ مسلمات میں سے ہے کہ مادّہ وجسم چاہے جو بھی ہو وہ اپنے آپ سے بے خبر ہے۔ انسان کے ایک سنگی یا مادّی مجسمہ کا ہر ہر حصّہ اپنے دوسرے حصّہ سے مخفی و پوشیدہ ہے۔ حالانکہ ہم واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ انسان وحیوان اپنے ہر طرف سے آگاہ و باخبر ہے۔ انسان جانتا ہے وہ کہاں ہے؟ اس کے آس پاس کیا ہورہا ہے؟ دُنیا کے حالات کیا ہیں؟ اس لیے ماننا پڑے گا کہ انسان وحیوان میں ایک دوسری چیز بھی ہے جو مادّہ سے مافوق ہے اور وہ عالم مادّہ سے جدا ہے جو مادّہ کے مرنے سے نہیں مرتی، باقی رہتی ہے۔

فطرتاً انسان اپنے اندر ہر کمال کو مطلق طور پر پائے جانے کا خواہشمند ہوتا ہے اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان دنیا کی قدرت مطلقہ کا طالب ہوتا ہے۔ اور کسی بھی ناقص قدرت سے اس کا دل نہیں بھرتا۔ اگر ایک پوری دُنیا اس کے قبضہ میں ہو اور اس سے کہا جائے کہ ایک دُنیا اور بھی ہے تو وہ فطرتاً اس بات کی طرف مائل ہوگا کہ وہ دُنیا بھی کسی طرح اس کے قبضہ میں آجاتی۔ انسان چاہے جتنا بڑا دانشور ہو، اگر اس سے کہا جائے دوسرے علوم بھی ہیں تو وہ فطرتاً ان علوم کو حاصل کرنے کی طرف مائل ہوگا۔ لہٰذا ایک قدرت مطلقہ اور علم مطلق کی ضرورت ہے جس سے انسان لولگائے۔

اور وہ صرف خدا کی ہی ذات ہے جس سے ہم سب کی اُمیدیں وابستہ ہیں چاہے ہم خود نہ جانتے ہوں۔ انسان کی خواہش ہے کہ ''حق مطلق'' تک پہنچ جائے تاکہ فانی فی اللہ ہوجائے۔ اصولی طور سے ہر انسان کی سرشت میں ابدی زندگی کی خواہش موجود ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ موت سے آزاد ہوجائے اور زندگی جاوید کا مالک بن جائے۔ اگر جناب عالی کو اس سلسلہ میں تحقیق کی خواہش ہوتو ان علوم کے جاننے والے حضرات کو مغربی فلسفہ کے علاوہ مشائی فلسفہ میں فارابی، اور ابوعلی سینا رحمۃ اللہ علیہما کی وہ کتابیں پڑھنے کا حکم دیں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں تاکہ ان پر واضح ہوسکے کہ علّیت ومعلولیت کا قانون ''جس پر ہر طرح کی شناخت کا مدار ہے۔'' اس کا تعلق معقول سے ہے محسوس سے نہیں ہے۔ اسی طرح معانی کلیہ کا ادراک

نیز تمام قوانین کلیہ ''جن پر ہر قسم کے استدلال کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔'' بھی سب کے سب معقول ہیں محسوس نہیں ہیں۔ اور پھر اشراقی فلسفہ میں بھی یہ لوگ سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے آپ کو بتائیں کہ جسم نیز تمام مادّی موجودات بھی اس نورِ محض کے محتاج ہیں جو حس سے منزہ ہے، اور انسان کے لیے خود اپنی ذات اور اپنی حقیقت کا ادراکِ شہودی بھی حسّی وجود سے مبرا ہے۔

آپ اپنے بزرگ دانشمندوں کو حکم دیں کہ وہ صدرالمتالہین رضوان اللہ علیہ خداوند عالم ان کو نبیین وصالحین کے ساتھ محشور کرے، کی کتاب حکمتِ متعالیہ کا مطالعہ کریں تو ان کو معلوم ہو کہ حقیقت علم وعی وجود محض ہے جو مادّہ سے مجرد ہے اور ہر طرح کی فکر مادّہ سے مبرا ہے اور احکامِ مادّہ اس پر جاری نہیں ہو سکتے۔

اب اس سے زیادہ میں آپ کو تھکانا نہیں چاہتا اور عارفین کی کتابوں خصوصاً محی الدین ابن عربی کی کتابوں کا نام نہیں لوں گا۔ ہاں اگر اس بزرگ شخصیت کے مباحث سے آپ واقف ہونا چاہتے ہوں تو چند ایسے ذہین وباخبر افراد کو، جو اس قسم کے علم میں مہارت تامہ رکھتے ہوں، قم روانہ فرمائیں تا کہ چند سال خدا پر بھروسہ کر کے بال سے بھی زیادہ باریک ولطیف عرفانی منازل سے آگاہی حاصل کریں۔ کیونکہ علم وآگہی کا یہ سفر طے کئے بغیر وہاں تک رسائی ناممکن ہے۔

جناب محترم کوربا چوف!

ان مسائل ومقدمات کے ذکر کے بعد اب میں آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ پوری سنجیدگی کے ساتھ اسلام کے بارے میں تحقیق وتفحص کریں۔ اور یہ خواہش اس لیے نہیں ہے کہ اسلام اور مسلمین آپ کے محتاج ہیں، بلکہ اسلام کے آفاقی وعظیم اقدار کی بناء پر ہے جو تمام قوموں کی نجات کا سبب اور باعثِ راحت وآرام بن سکتے ہیں اور یہی بشریت کے بنیادی مشکلات کی گرہیں کھول سکتا ہے۔

اسلام کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کرنے سے ہوسکتا ہے کہ آپ کو مسئلہ افغانستان اور

اسی قسم کے دُنیا کے دیگر مسائل سے ہمیشہ کے لیے نجات دلادے۔ ہم دُنیا بھر کے تمام مسلمانوں کو اپنے ملک کے مسلمانوں کی طرح سمجھتے ہیں اور ہمیشہ اپنے آپ کو ان کے حال میں شریک سمجھتے ہیں۔

آپ نے سوویت روس کے بعض جمہوریوں میں نسبتاً جو مذہبی آزادی دی ہے۔ اس سے لگتا ہے کہ اب آپ یہ خیال ترک کرچکے ہیں کہ مذہب معاشرہ کے لیے افیون ہے۔

سچ بتایئے جس مذہب نے ایران کو بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں ایک پہاڑ کے مانند استوار کررکھا ہے، کیا وہ معاشرہ کے لیے نشہ آور ہوسکتا ہے؟ آیا جو مذہب پوری دنیا میں عدالت و انصاف کے اجرا کا مطالبہ کرتا ہے اور انسان کو ہر قسم کی معنوی و مادّی قیود سے آزاد دیکھنے کا خواہاں ہے وہ معاشرے کے لیے افیون ہے؟

البتہ جو مذہب اسلامی وغیر اسلامی ممالک کے مادّی و معنوی تمام سرمایہ کو بڑی طاقتوں اور حکومتوں کے حوالہ کردینے کا سبب بنے اور برسرِ عام چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ سیاست دین سے جدا ہے، یقیناً ملک وقوم کے لیے مخدر و نشہ آور ہے! لیکن وہ اس صورت میں واقعی مذہب نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اس مذہب کو ہمارے یہاں کے لوگ "امریکی مذہب" کہتے ہیں۔

آخری میں پھر صاف لفظوں میں اعلان کرتا ہوں کہ جمہوری اسلامی ایران عام اسلام کا عظیم ترین و طاقتور ترین مرکز ہونے کی حیثیت سے بڑے اطمینان کے ساتھ آپ کے اعتقادی نظام کے خلا کو پُر کرسکتا ہے۔ بہرحال ہمارا ملک ماضی کی طرح حسن ہمسائیگی اور برابری کے روابط کا قائل ہے اور اس کا احترام کرتا ہے۔

والسّلام علی من اتبع الهدیٰ

(جو ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلام ہو)

روح اللّٰہ الموسوی الخمینی

۲۲ر جمادی الاوّل ۱۴۰۹ھ (یکم جنوری ۱۹۸۹ء)

ڈاکٹر مرتضیٰ کریم

مت سہل ہمیں جانو!

مت سہل ہمیں جانو! پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

عہد آفریں، نابغۂ روزگار، عظیم الشان اور عارف باللہ شخصیت محترم المقام جناب آیت اللہ خمینیؒ جنھیں ہم امام خمینیؒ کے اسم عام سے جانتے ہیں دراصل ایک انقلاب آفریں انسان تھے۔ میں نے اکثر سوچا ہے کہ جب ہم انھیں امام خمینیؒ کہتے ہیں تو دراصل ہم انھیں ایک خطہ یا علاقے میں محدود کر دیتے ہیں۔ مجھ ناچیز کو یہ خیال آتا ہے کہ آیت اللہ خمینیؒ جیسی شخصیات کے فکری سرچشمے اور عملی اقدامات سے چونکہ پوری انسانی برادری سیراب اور مستفیض ہوتی ہے اس لیے انھیں محدود کر دینا مناسب عمل ہرگز نہیں ہوگا۔ حضرت امام خمینیؒ کسی معمولی شخصیت کا نہیں دراصل ایک عہد کا نام ہے۔

راقم نے محترم آیت اللہ خمینیؒ کے حوالے سے جب بھی غور کیا ہے انگشت بدنداں رہ گیا کہ امام خمینیؒ سے قبل عالمِ اسلام کی صورتِ حال بالعموم اور ایران کا سیاسی، سماجی، ادبی، معاشی اور ثقافتی منظرنامہ بالخصوص انتشار، بحران اور غیر اللہ کی تقلید کی راہ پر گامزن تھا۔ آج سے تقریباً چار دہائی قبل امام خمینیؒ نے اسلام دشمن عناصر کی گہری اور منصوبہ بند سازش کو محسوس کیا اور ''اسلامی انقلاب'' اسلامی جمہوریہ کی ضرورت پر پہلے سرگوشی میں اور بعد ازاں پورے گھن گرج کے ساتھ زور دیا۔ انھوں نے اپنے مقصد اور نصب العین کی بابت کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے اور چونکہ وہ سچے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ دعوت دے رہے تھے اس لیے مشکل اور دشوار گزار راستوں پر بھی ایک کارواں بنانے میں کامیاب اور کامران رہے۔

آج امریکی حکومت قرآن شریف کی بے حرمتی میں پیش پیش ہے اور ایران کی سرزمین پاک کو پڑوسی ملکوں پر استعمال کی مانگ کو کبھی مدھم اور کبھی تیز لَے میں اُٹھاتی رہتی ہے۔ فی زمانہ جبکہ دہشت گرد اور مسلمان ہم معنی الفاظ ہوکر رہ گئے ہیں، ایسے میں حضرت امام خمینیؒ کی دعوت کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ انھوں نے دودہائی قبل جو وصیت کی تھی آج اس کا ایک ایک لفظ ہمیں اور ہماری بصیرت کو آواز دے رہا ہے، شرط ہے اس پر کان دھرنے کی۔ ان کے الفاظ ہیں:

''میں تمام موجودہ اور آئندہ نسلوں سے وصیت کرتا ہوں کہ اگر آپ اسلام اور اللہ کی حکومت برقرار رکھنا چاہتے ہیں، ملکی وغیرملکی استحصالیوں اور سامراجی طاقتوں کے ہاتھ اپنے ملک سے دُور رکھنا چاہتے ہیں تو الٰہی مقصد ومحرک کو، جس کی خداوند عالم نے قرآن مجید میں تاکید کی ہے، ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔ اس الٰہی جذبہ ومحرک کے مدمقابل جو کامیابی اور اس کی بقا کا اصل راز ہے، مقصدفراموشی اور اختلاف و تفرقہ پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ دُنیا بھر کے پروپیگنڈہ مشینریاں اور ان کے مقامی ایجنٹ اپنی پوری طاقت کے ساتھ، پھوٹ ڈالنے والی جھوٹی باتیں گھڑنے اور افواہیں پھیلانے کی بھرپور کوشش بلاوجہ نہیں کر رہے ہیں، اس راہ میں اربوں ڈالر یوں ہی نہیں خرچ کر رہے ہیں۔ اسلامی جمہوریہ کے مخالفوں کی اس علاقہ میں مسلسل آمدورفت بے مقصد نہیں ہے اور افسوس کا مقام ہے کہ ان کے درمیان بعض اسلامی ممالک کے ایسے حکمراں اور سربراہ بھی نظر آئے ہیں جو آنکھ کان بند کر کے امریکہ کی غلامی کے لیے حاضر ہیں اور اپنے ذاتی مفاد کے سوا انھیں کسی چیز کی فکر نہیں ہے۔ ان کے ساتھ بعض عالم نما افراد بھی شامل ہیں۔

آج اور مستقبل میں بھی جس چیز کو اہمیت کے ساتھ ایرانی قوم اور مسلمانانِ عالم کے مدنظر رہنا چاہیے وہ تباہ کن پروپیگنڈوں کو ناکام بنانے کا عمل ہے۔ تمام

مسلمانوں، خاص طور پر ایرانیوں اور مزید خصوصیت کے ساتھ عصر حاضر کے لوگوں سے میری وصیت یہ ہے کہ ان سازشوں کے مقابلہ میں اُٹھ کھڑے ہوں اور ہر ممکن طریقہ سے اپنے درمیان اتحاد و یکجہتی کو مستحکم کر کے کافروں اور منافقوں کو (ان کے ناپاک ارادوں میں) مایوس کر دیں۔"

آج جبکہ امریکہ کی سازش نے تمام عالم کے مسلمانوں کے چہرے کو مشکوک بنا رکھا ہے اور عالم اسلام میں انتشار کی بھرپور کوشش جاری ہے۔ امام خمینیؒ کے یہ ارشادات کس قدر بامعنی اور عین حالات کے مطابق نظر آتے ہیں۔

امام خمینیؒ نے کارزار حیات میں کامیابی اور سرفرازی حاصل کرنے کے لیے اور اغیار کو شکست دینے کی خاطر--- اللہ، ایمان، اتحاد، ارتکاز، استحکام، ارتباط کو نسخۂ کیمیا تصور کرتے ہوئے، اپنی قوم کو ان الفاظ کی معنویت بتانے کی سعی کی ہے۔ ان کی زندگی جس جہدِ مسلسل اور دردِ انقلاب سے عبارت ہے اس کے حوالے سے حافظؔ کا یہ شعر بے اختیار زبان پر مچل جاتا ہے:

چون این گرہ کشایم وین راز وا نمایم
دردے و صعب دردے، کارے و سخت کارے

ان کے ارشادات اور ان کے خیالات سے گزرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے دردِ دل کو پوری امت مسلمہ میں منتقل کر دینا چاہتے ہوں۔

حضرت امام خمینیؒ دراصل ایک رُوحانی شخصیت کے مالک تھے--- چنانچہ انقلاب، آمد انقلاب اور نتائج انقلاب کی آہٹ محسوس کرسکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اسلامی انقلاب کے حوالے سے زندگی کے تمام شعبوں میں نمایاں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ کسی نے بجا کہا ہے کہ:

"حضرت امام خمینیؒ محض ایک مردِ زاہد، عارف، فلسفی، مجتہد، مفسر، شاعر اور ادیب نہ تھے بلکہ وہ ایک عظیم سیاسی شخصیت کے حامل بھی تھے اور انھوں نے اپنی شخصیت

کے ہر شعبے کو اُجاگر کرنے والی یادگار تالیفات چھوڑی ہیں جنھیں اہم علمی اور ثقافتی میراث کا درجہ حاصل ہے۔"

میں نے اکثر ایسے مقام پر جبکہ کسی بڑی شخصیت کے یومِ وفات یا یومِ ولادت کی تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے، بار بار سوچا ہے کہ آخر ان بڑی اور عہد آفریں شخصیات کو یاد کرنے کے پیچھے ہمارا کیا مقصد ہوتا ہے یا ہونا چاہیے؟ کیا محض ان کے کارناموں کا ذکر کرکے، سینہ کوبی کرکے، ان کے ارشادات کو یاد کرکے ہماری ذمہ داری پوری ہوجاتی ہے — یا ایسی تقریبات کے انعقاد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کے نصب العین کو، ان کے مقاصد کو، ان کے ادھورے کام کو، ان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی سعی کریں۔ آج جب ہم ان کے انتقال کی سولھویں برسی منارہے ہیں، اس بات پر بھی غور کریں کہ پچھلے سولہ برسوں میں ہم نے ان کے کسی ایک "مشن" کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور اگر ایسا ہے تو ہماری اس میں پیش رفت کیا ہے؟ کیا ہم میں سے کسی نے ان کی "مجاہدانہ زندگی" سے کوئی درس لیا ہے؟ ایک سالک اور رُوحانی پیشوا ہونا تو بڑی بات ہوتی ہے، کیا ہم نے ایک عام مخلص سماجی اور سیاسی کارکن ہونے کی ذمہ داری کو سمجھنے کی کوشش کی ہے؟

اگر حضرت امام خمینیؒ نے اپنی ذات اور جدوجہد سے ایران میں اسلامی جمہوریت اور اسلامی انقلاب کی لے کو تیز کیا اور آخر کار ۱۱؍فروری ۱۹۷۹ء کو کم و بیش پندرہ سولہ سال کی جہدِ مسلسل سے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی تو ہم لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کس بات کے منتظر ہیں؟ ذرا تصور فرمایئے امام خمینیؒ سے قبل کسی نے اسلامی انقلاب کی بابت سوچا تھا؟ امام خمینیؒ نے نہ صرف اسلامی انقلاب کی فکر کی بلکہ اس کے لیے عملی جدوجہد بھی کی اور انجام کار کامیاب ہوئے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ:

"اسلامی دُنیا سے وابستہ علماء و مجتہدین کی سیاسی سرگرمیوں کی ایک لمبی فہرست موجود ہے لیکن حضرت امام خمینیؒ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ اسلامی

جمہوری حکومت کا منصوبہ پیش کیا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنایا۔ یہ اس صدی کے اس عظیم الشان شخص کی دانشمندانہ قیادت اور بلند ہمتی کا ہی نتیجہ تھا کہ ظالمانہ راہ و روش پر قائم دُنیا کی طاقتور ترین شاہی حکومت اور اس کی حمایت میں سرگرم بین الاقوامی سامراجی طاقتوں بالخصوص مغرب کی عظیم طاقت نے امام خمینیؒ کے آہنی ارادے کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔''

حضرت امام خمینیؒ نے تعلیمی نظام اور جامعات میں تعلیم کی گرتی ہوئی صورتِ حال پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور کیا اور مغرب کے نام پر پھیلائی جانے والی عفونت کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا۔ جن حضرات نے امام خمینیؒ کے ان خطبات کا مطالعہ کیا ہوگا جن میں انھوں نے جامعات سے متعلق اصلاحات اور ترجیحات کی بات کی ہے وہ میری بات کی تائید کریں گے کہ حضرت امام خمینیؒ کی نظر بڑی دُوررس اور گہری تھی۔ انھیں یقین تھا کہ انقلاب کی چنگاری کو شعلۂ جوالہ بنانے میں نوجوانوں کا کتنا اہم رول ہوسکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے تبحر علمی اور حکمتِ عملی سے جامعات کے کردار کو صالح شکل دینے کی سعیٔ کامیاب کی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام خمینیؒ جیسی شخصیات تاریخ میں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ سلمان رُشدی کے حوالے سے دیا گیا ان کا فتویٰ ہو یا کورباچوف کے نام اسلامی دعوت — ان کی مدبرانہ شخصیت اور فکری ابعاد کی اہمیت دوبالا ہوجاتی ہے۔ اقبال کا یہ شعر ایسی ہی شخصیات پر صادق آتا ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

❁❁❁

حجۃ الاسلام شیخ علی اکبر آشتیانی

امام خمینیؒ

کی زندگی کی خصوصی داستانیں

حاج احمد آقا نے رحلتِ امام رضوان اللہ تعالیٰ سے متعلق اپنی مادرگرامی کا ایک قول نقل کیا کہ آپریشن سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل حضرت امام خمینیؒ نے ایک خواب دیکھا اور اسے اپنی زوجۂ محترمہ (والدہ حاج احمد آقا) سے بیان کیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہدایت کردی تھی کہ میری حیات میں اس خواب کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ انھوں نے فرمایا:

"امامؒ نے خواب میں دیکھا کہ وہ مرگئے ہیں اور حضرت علیؑ نے ان کا غسل وکفن کیا اور نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اس کے بعد امیر المومنینؑ نے ان کو قبر میں اُتارا اور پوچھا۔ اب تو آرام سے ہو؟ امام خمینیؒ نے کہا: دائیں طرف کچھ درد ہے جس سے مجھے تکلیف ہورہی ہے۔ حضرت علیؑ نے اپنے دست مبارک کو امام خمینیؒ کے جسم پر پھیرا اور فوراً ان کی تکلیف رفع ہوگئی۔"

اگرچہ امام خمینیؒ کی گہری شخصیت اور ان کی عظمت ووسعت گھر کے نزدیک ترین افراد اور ان کے نامور ونمایاں شاگردوں پر بھی پوری طرح واضح نہیں ہے اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ امامِ امت کی شخصیت سے بخوبی واقف ہے لیکن ہر شخص نے اپنی سوجھ بوجھ و ذہنی سطح کے مطابق اس دریائی حکمت وفرزانگی کا ایک قطرہ حاصل کیا اور ان قطروں کو جمع کرنے سے علم ومعرفت کی وہ نہر جاری ہوجاتی ہے جو آئندہ نسل کے تشنگانِ علم کو سیراب کرتی رہے گی۔ اگرچہ امامِ امت کی ہر نقل وحرکت اور ان کی خاموشی وسخن کوئی ایک اہم درس کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا جس آدمی نے ان کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے یا ان کی زبان سے

کوئی بات سنی ہے اس کا فریضہ ہے کہ وہ اس امانت کی حفاظت کرتے ہوئے عوام کی خدمت میں پیش کردے۔

اس اصول کی پیروی کرتے ہوئے ذیل میں حجت الاسلام شیخ علی اکبر آشتیانی کے ذاتی مشاہدات کا اجمالی خاکہ پیش کیا جارہا ہے۔ واضح رہے کہ حجۃ الاسلام آشتیانی کو امام امت کی قربت کا شرف حاصل تھا اور وہ آج بھی شعبۂ پولیس میں نمائندہ ولی فقیہ کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

معاملات پر غور وفکر

مجھے یاد ہے کہ ایرانی ریڈیو وٹیلی ویژن کی مدیریت قطب زادہ کے سپرد تھی۔ حضرت امام ریڈیو سے نشر ہونے والے ایک خلاف اسلام پروگرام کو سن کر بہت ناراض ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں اس ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا تھا کہ: ''قطب زادہ سے کہو کہ کیا تمھیں اسلامی مسائل کا بخوبی اندازہ نہیں ہے اور کیا تم قرآن کے سلسلے میں متعہد نہیں ہو؟ ہمارا انقلاب اسلامی انقلاب ہے تو پھر ہمارے ریڈیو وٹیلی ویژن سے غیر اسلامی پروگرام کیوں نشر کیے جارہے ہیں؟'' جیسے ہی قطب زادہ کو امام کا پیغام ملا وہ ناراض ہوگیا لیکن بعد میں یہ بات واضح ہوگئی کہ قطب زادہ کو اسلام سے کوئی قلبی ارادت نہ تھی بلکہ وہ اسلام سے اپنے خلوص کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب حجۃ الاسلام محتشمی ریڈیو وٹیلی ویژن تنظیم میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے تو ایک مرتبہ رپورٹ پیش کرنے کے لیے امام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رپورٹ سننے کے بعد امام امت نے کہا: ''آپ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والے پروگراموں پر کڑی نگاہ رکھئے۔'' اس کے بعد ارشاد فرمایا: ''ریڈیو سے اذانِ صبح اور دعاؤں کی اشاعت کے بعد ایک نغمہ بھی نشر ہوتا ہے جو کسی حد تک مناسب نہیں ہے۔'' امام کے کمرے سے باہر آنے

کے بعد آقائے محتشمی بڑی حیرت ظاہر کرتے رہے تھے کہ زبردست مصروفیت کے باوجود امام امت ریڈیو ٹیلی ویژن کے پروگراموں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ بہرحال امام امت کی ہدایت و رہنمائی کی وجہ سے اس تنظیم میں ایک انقلاب پیدا ہوا اور ذمہ دار لوگوں کی بھرپور توجہ اور غیر معمولی جدوجہد کی وجہ سے یہ ادارہ اسلامی انقلاب کا ترجمان بن گیا۔

حضرت امام کی سادہ زندگی

آپ لوگ امام خمینیؒ کی سادہ زندگی کے بارے میں بہت کچھ سن چکے ہیں اور ٹیلی ویژن سے شائع ہونے والے پروگرام میں اس کی جھلک اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ سب سے پہلے میں ان کے مکان کا ذکر کرتا ہوں۔ تہران میں وہ جس مکان میں رہتے تھے وہ حجۃ الاسلام جمارانی، ان کے دو بھائیوں نیز ان کے ایک داماد کی ملکیت ہے۔ آقائے جمارانی نے امامؒ کی رہائش کے لیے یہ مکان ازخود پیش کیا تھا۔ لیکن امام خمینیؒ شرعی مسائل کا خاص خیال رکھتے تھے لہٰذا انھوں نے ایک بار مذکورہ تمام مالکان کو جمع کر کے ان سے پوچھا کہ کیا آپ اس بات کے لیے راضی ہیں کہ میں اس مکان میں قیام کروں؟ ان لوگوں نے اپنی رضا ظاہر کردی لیکن امام خمینیؒ نے اس بات پر اکتفا نہ کی اور ان کی عورتوں سے بھی دریافت کیا تو ان لوگوں نے بھی یہ اعلان کیا کہ اس مکان میں امام خمینیؒ کی آمد ہماری عزت افزائی کا باعث ہے۔ امام خمینیؒ کی سادہ زندگی کے بارے میں بس یہ کہنا ہی کافی ہے کہ وہ ہمیشہ معاشرہ کے محروم و پسماندہ ومفلوک الحال لوگوں جیسی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔

حسینیہ جماران میں امام خمینیؒ کی آمد کے بعد آقای جمارانی اس مکان کی تعمیر جدید کے خواہاں تھے تاکہ یہ ایک عمدہ اور شاندار عمارت بن جائے۔ ایک روز امام خمینیؒ نے اپنے بیٹے سیّد احمد خمینی کے ذریعہ آقای جمارانی کے پاس کہلایا کہ تعمیر جدید نہ کرائیں۔ آقای جمارانی نے پہلی مرتبہ یہ سمجھا کہ امام خمینیؒ نے تکلف سے کام لیا ہے لہٰذا انھوں نے اپنا تعمیری

کام جاری رکھا۔ امام خمینیؒ کو یہ بات اچھی نہ معلوم ہوئی لہٰذا انھوں نے آقای جمارانی کے پاس کہلا بھیجا کہ ''اگر تم اس مکان کی تعمیر جدید ہی کرنا چاہتے ہو تو میری وفات کے بعد کرلینا۔''

امام خمینیؒ کی سادہ اور عام آدمیوں جیسی زندگی کے سلسلے میں ایک دوسرا واقعہ یاد آ گیا۔

مسلط کردہ جنگ کا زمانہ تھا۔ زوردار لڑائی چل رہی تھی اور دشمن ہمارے غیرفوجی علاقوں پر میزائیلی حملے کر رہا تھا۔ اس دوران دشمن کے حملوں سے بچنے کے لیے لوگوں نے امن گاہوں کا انتظام کر رکھا تھا لیکن شہر کے عام اور غریب لوگ اپنے گھروں میں رہنے کے لیے مجبور تھے۔ اسی دوران یہ طے پایا کہ امام خمینیؒ کے لیے بھی ایک پناہ گاہ بنادی جائے تاکہ ہوائی حملوں کی صورت میں ان کی جان کی حفاظت کی جاسکے کیونکہ درحقیقت وہ امت اسلامیہ کی جان تھے۔ جب یہ بات امام خمینیؒ کو معلوم ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میں اس پناہ گاہ میں ہرگز نہ جاؤں گا۔ چنانچہ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک امام امتؒ نے کبھی اس پناہ گاہ کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا جبکہ ملک کے تمام ذمہ دار افراد ان سے بار بار یہ اصرار کیا کرتے تھے کہ پناہ گاہ کا استعمال کریں لیکن وہ آخری دم تک اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔ جب حفاظتی معاملات کے افسروں نے زیادہ اصرار کیا تو انھوں نے ارشاد فرمایا: ''آخر مجھ میں اور اس پاسدار میں جو حفاظتی خدمت انجام دے رہا ہے، کیا فرق ہے؟ یہ پاسدار تو میری اور میرے گھر والوں کی حفاظت کرتا ہے۔ میں یہاں سے بالکل نہیں جاؤں گا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میزائل میرے سر سے ٹکرائے اور میں شہید ہوجاؤں۔''

حفاظتی افسروں نے امام خمینیؒ کے کمرے اور حسینیہ کے درمیان پناہ گاہ بنادی تاکہ انھیں کہیں جانا نہ پڑے لیکن وہ کبھی اس پناہ گاہ کی طرف سے نہیں گزرے اور اس جگہ پہنچنے کے بعد وہ راستہ بدل کر اس پناہ گاہ کے قریب سے گزر جایا کرتے تھے۔

امام خمینیؒ کی انکساری

اگرچہ امام خمینیؒ ایک اٹل ارادہ رکھنے والے آدمی تھے لیکن وہ اکثر امور میں بڑی انکساری سے کام لیتے تھے۔ وہ گھر والوں پر حکم نہیں چلاتے تھے بلکہ اپنا کام بذاتِ خود انجام دیتے تھے۔ وہ ایک گلاس پانی کے لیے بھی کسی کو حکم نہیں دیتے تھے اور ہمیشہ اپنی زوجہ کا بڑا احترام کیا کرتے تھے۔

سیرت نبویؐ کی پیروی کرتے ہوئے وہ سلام عرض کرنے میں ہمیشہ سبقت حاصل کرتے تھے اور سلام کہنے میں کوئی ان پر سبقت نہیں حاصل کرسکا۔ وہ کسی مجلس یا محفل میں داخل ہوتے ہی سب لوگوں کو سلام عرض کیا کرتے تھے۔ ان کے گھر والے بھی اس سلسلے میں ان سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ کہتے ہیں کہ جب تک ان کی زوجۂ محترمہ دسترخوان پر نہیں آجاتی تھیں وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

امام کی انکساری اسی جگہ پر ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ خود کو ہمیشہ اسلامی انقلاب اور امت اسلامیہ کا خادم کہا کرتے تھے اور کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ انھوں نے ظالم شاہی حکومت کا نام و نشان مٹایا ہے بلکہ وہ اسلامی انقلاب کی کامیابی اور ظالم شاہی حکومت کی نابودی کا سہرا ایرانی عوام کے سر باندھتے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ:

ایک روز امام خمینیؒ کے داماد آقای محمود بروجردی کے والد کو آقای احمد خمینی نے دعوت پر بلایا۔ اس دعوت میں آقای صانعی، آقای توسلی، آقای جمارانی اور دیگر احباب بھی موجود تھے۔ آقای محمود بروجردی کے والد کے احترام میں امام خمینیؒ بھی نماز پڑھنے کے بعد اس محفل میں آگئے۔ یہ محفل اس زمانے میں منعقد ہوئی تھی جب آیت اللہ خامنہ ای اقوامِ متحدہ کے سفر پر گئے ہوئے تھے۔ محفل میں موجود لوگوں نے اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں آیت اللہ خامنہ ای کی تقریر پر تبصرہ کرنا شروع کیا کہ انھوں نے عالمی سطح پر اسلام کا تعارف کس مؤثر انداز میں کرلیا ہے۔ اس موقع پر آقای محمود بروجردی کے والد اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے اور

سب لوگ خاموشی سے ان کی بات سنتے رہے۔ انھوں نے امام خمینیؒ کی سلامتی کی دعا کرتے ہوئے کہا کہ امام خمینیؒ کے مبارک وجود کی برکت ہے کہ آج اقوامِ متحدہ جیسے عالمی ادارہ میں اسلام کا چرچا ہے۔ امام خمینیؒ نے اپنی مخصوص انکساری سے کام لیتے ہوئے کہا: ''یہ ملّت اسلامیہ کا کارنامہ ہے کہ اس نے اپنا راستہ ڈھونڈ لیا ہے اور ملک کے ذمہ دار افراد اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ اب چاہے میں رہوں یا نہ رہوں یہ قوم اپنے راستہ پر گامزن رہے گی۔ یہ میدانِ عمل میں عوام کی موجودگی کی وجہ سے ہم لوگوں کو عزت و افتخار حاصل ہوا ہے۔'' اس کے بعد امامِ امت نے ارشاد فرمایا: ''میں مطمئن ہوں کہ ملّتِ ایران میدانِ عمل میں باقی رہے گی بلکہ اس کی سرگرمیوں میں کچھ اور اضافہ ہی ہوگا۔''

اس واقعہ سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ امام خمینیؒ کس انکساری کے ساتھ اپنی خدمات کو حقیر و ناچیز بتاتے ہوئے اس عظیم کارنامہ کا سہرا عوام کے سر باندھ دیتے ہیں۔ امام خمینیؒ کی یہ راہ و روش ہم لوگوں کے لیے انتہائی مناسب نمونہ ہے اور اگر ہم لوگ اس کی پیروی کریں تو انشاء اللہ ہمیں منزل کمال تک پہنچنے میں کوئی زحمت نہ ہوگی۔

احکامِ الٰہی کے اجراء کے لیے امام خمینیؒ کا اصرار

احکامِ الٰہی کے اجراء میں امام خمینیؒ خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد ہے۔ حجۃ الاسلام سیّد محمد لواسانی امام خمینیؒ کے قریب ترین دوستوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ اکثر امام خمینیؒ سے ملاقات کرنے آتے تھے اور بڑی دیر تک محوِ گفتگو رہا کرتے تھے۔

قطب زادہ کی بغاوتی سازش کا بھانڈہ پھوٹنے کے بعد بغاوتی گروہ میں شامل لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا اور ان پر مقدمہ چلا کر ان میں سے بعض کو پھانسی اور بعض لوگوں کو ان کے جرائم کے مطابق دوسری سزائیں دی گئیں۔ پھانسی کی سزا پانے والے ایک مجرم نے آقای

لواسانی سے رابطہ قائم کیا اور ان سے خواہش کی کہ وہ امام خمینیؒ سے اس کی سفارش کردیں تو شاید ان کی سزا میں کچھ کمی ہوجائے۔

آقای لواسانی امام خمینیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اس آدمی کی سفارش کرتے ہوئے کہا کہ آپ اپنے حکم سے اس کی سزا کو ملتوی کرادیں۔ امام خمینیؒ نے فوری طور پر اُن کی خواہش نامنظور کردی لیکن آقای لواسانی کا اصرار بڑھتا رہا۔ امام خمینیؒ نے قدرے توقف اور خاموشی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ''میں آپ سے بڑی محبت وعقیدت رکھتا ہوں لیکن میں لوگوں کی خوشی کے لیے خوشنودی پروردگار کو نظر انداز نہیں کرسکتا ہوں۔ میں رضائے الٰہی پر آپ کے تعلقات کو مقدم نہیں کرسکتا ہوں۔ لہٰذا حکم الٰہی کا اجراء لازمی ہے۔''

اس کے علاوہ احکامِ الٰہی کے اجراء کے سلسلے میں مجھے ایک واقعہ اور یاد آتا ہے کہ انقلاب اسلامی ایران کی عظیم الشان کامیابی کے بعد مجاہدین انقلاب نے ہویدا، رحیمی، ربیعی، نصیری اور دیگر دشمنانِ اسلام کو گرفتار کرلیا۔ ان مجرمین کی تعداد تقریباً ۲۰ افراد پر مشتمل تھی۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ گرفتار کیے گئے تمام لوگوں کو پھانسی دے دی جائے۔ بعض لوگ اپنے مطالبے پر بہت مصر تھے۔ بعد میں طے پایا کہ اس سلسلے میں امام خمینیؒ کی رہنمائی حاصل کی جائے۔ امام خمینیؒ نے بڑی وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ: ''جو لوگ شرعی احکام کے بموجب مفسد فی الارض ہیں ان کے لیے حکم بالکل واضح ہے۔ باقی لوگوں کے بارے میں فیصلہ اسلامی عدالت پر چھوڑ دو تاکہ شرعی اصولوں کے مطابق ان کے بارے میں ضروری فیصلہ صادر کیا جاسکے۔''

پس ہم دیکھتے ہیں کہ وہ امام خمینیؒ جو اپنے عزیز دوست کی سفارش اس لیے رد کردیتے ہیں کہ وہ حکم الٰہی کے مطابق نہیں ہے وہ اس بات کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوتے کہ کسی ایسے آدمی کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا جائے جو شرعی احکام کے مطابق اس سزا کے لائق نہیں ہے۔

اسی طرح جب اپنے بیٹے کی گرفتاری کے بعد مرحوم آیت اللہ طالقانی کچھ دنوں کے لیے روپوش ہوگئے اور پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے آیت اللہ طالقانی سے کہا: ''آپ کا بیٹا منحرف کمیونسٹی جماعتوں سے وابستہ ہے۔ پس اس کی گرفتاری سے زیادہ رنجیدہ و ملول ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کے بعد امام خمینیؒ نے زور دیتے ہوئے کہا: ''خدا کی قسم! اگر احمد معمولی انحراف سے بھی دوچار ہوجائیں اور انھیں سزائے موت سنائی جائے تو میں خود اپنے ہاتھ سے انھیں موت کے گھاٹ اُتار دوں گا۔''

احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی سے امام خمینیؒ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی اور اگر کوئی عالم دین اس مجرمانہ بے راہ روی میں ملوث ہوجاتا تو انھیں اور زیادہ تکلیف ہوا کرتی تھی۔ جب انھیں ایک بغاوت میں شریعت مداری کی شرکت کا پتہ چلا تو وہ گھر کے صحن میں ٹہلتے ہوئے بار بار کہہ رہے تھے کہ میں حیران ہوں کہ ایک عالمِ دین اس باغیانہ کاروائی میں کیسے شریک ہوسکتا ہے اور احکامِ خداوندی اپنے پیروں سے کیسے روند سکتا ہے؟

موت کی آہٹ

جب ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ سنایا کہ امام خمینیؒ کو اسپتال میں داخل کردیا جائے تو گھر والوں سے رخصت ہوتے وقت انھوں نے کہا: ''میں تم لوگوں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہورہا ہوں اور اب میں کبھی گھر واپس نہ آؤں گا۔'' گھر والوں نے کہا: ''نہیں، آپ واپس آئیں اور انشاء اللہ آپ کی صحت ٹھیک ہوجائے گی۔'' لیکن امامؒ نے ان لوگوں سے دوبارہ کہا: ''میں اس بار جانتا ہوں کہ واپسی ممکن نہیں ہے۔'' اس کے بعد انھوں نے آقائے احمد خمینی کی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''ٹیلی فون کر کے اپنے والد سے کہو کہ وہ میرے لیے دعا فرمائیں اور خداوند عالم سے یہ درخواست کریں کہ وہ مجھے قبول کرلے اور میری عاقبت نیک انجام پائے۔

جس وقت وہ گھر سے اسپتال کے لیے روانہ ہو رہے تھے، آقای احمد خمینی دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ امام خمینیؒ نے ڈاکٹروں اور نرسوں کی موجودگی میں انھیں اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا اور انھیں اس طرح بوسہ دیا کہ اب تک ایسا منظر کسی نے نہ دیکھا تھا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امام خمینیؒ کو یہ بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ اب وہ گھر واپس نہ آئیں گے۔

اسپتال میں بھی امام خمینیؒ کی مخصوص عبادتوں میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ وہ مزید ذوق و شوق کے ساتھ ان عبادتوں کو انجام دیا کرتے تھے۔ ان کے قریب رہنے والوں میں سے ایک شخص کا بیان ہے کہ صبح کی اذان میں تھوڑا سا وقت باقی تھا کہ میں اسپتال میں امام خمینیؒ کے کمرہ میں داخل ہوا تو میں نے انھیں عجیب حالات میں دیکھا۔ انھوں نے اس قدر گریہ کیا تھا کہ ان کا نورانی چہرہ بالکل بھیگ گیا تھا۔ پھر بھی ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ اپنے خدا سے اس طرح راز و نیاز کر رہے تھے کہ میں بیحد متاثر ہوگیا۔ جیسے ہی وہ میری طرف متوجہ ہوئے فوراً رومال سے اپنا چہرہ خشک کرنے لگے۔

جس روز ان کا آپریشن ہونے والا تھا میں صبح ان کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت ساڑھے پانچ بجے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ آقای صانعی امام خمینیؒ کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں بھی ان لوگوں میں ملحق ہوگیا اور سلام عرض کرنے کے بعد ان کی خیریت دریافت کی۔

میں نے دیکھا کہ ان کے بستر کے قریب قرآن مجید اور مفاتیح الجنان موجود ہے۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ دیر پہلے امام خمینیؒ دعائے عہد پڑھنے میں مصروف تھے۔ یہ دیکھ کر میں بالکل بے چین ہوگیا۔ پھر بھی میں نے اپنے آپ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد انھیں آپریشن کا کپڑا پہنایا گیا۔ آپریشن کا کپڑا پہننے کے بعد وہ اس کمرے کی طرف چل پڑے جہاں آپریشن ہونا تھا۔ اس کے بعد میرے اوپر ایسا گریہ طاری ہوا کہ میں ان کے پیچھے آپریشن روم تک نہ جا سکا۔

اس کے علاوہ ایک اور واقعہ نقل کرتا ہوں جس سے یہ معلوم ہوجائے گا کہ امام خمینیؒ

نے موت کی آہٹ محسوس کرلی تھی۔ ہفتہ کے دن آیت اللہ خامنہ ای نے امام خمینیؒ سے ملاقات کی اور کہنے لگے۔ ''انشاء اللہ خداوند عالم آپ کو جلد ہی صحت عطا کردے گا۔'' امام خمینیؒ نے کہا:
''آپ دعا کیجئے کہ میری عاقبت نیک انجام ہو اور مجھے قبول کرلے۔''

اس کے علاوہ گھر سے اسپتال کی طرف جاتے وقت انھوں نے کہا کہ ''اسپتال کا ماحول بچوں کے لیے مناسب نہیں ہوتا لہٰذا بچوں کو اسپتال نہ لے جائیں۔'' حالانکہ اب یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے سفرِ آخرت میں کسی کی محبت رُکاوٹ پیدا کرنے پائے اور ان کی اس خواہش پر مقصد تمام دنیاوی دلچسپیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا تھا۔

بیت المال کی حفاظت

الحاج آقای احمد خمینی یہ بتارہے تھے کہ جلاوطنی کے دوران نجف اشرف میں جب امام خمینیؒ کے فرزند والا مقام و عالم، عارف و دانشمند و مجتہد الحاج آقای مصطفیٰ خمینی شہید ہوگئے تو خبرِ شہادت ملنے کے بعد امام خمینیؒ پوری طرح ثابت قدم و بردبار رہے اور گھر کے ایک گوشہ میں جاکر تلاوتِ کلام پاک کرنے لگے۔ اور جب آقای احمد خمینی یا گھر کے دیگر افراد گریہ کرتے تو وہ ان کو تسلی دیتے تھے۔ اس سلسلے میں جو دوسرا واقعہ پیش آیا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام خمینیؒ شرعی مسائل کی پیروی میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ گھر والوں نے ٹیلی فون کے ذریعہ تہران سے رابطہ قائم کرنا چاہا تا کہ یہ افسوسناک خبر تہران والوں تک بھی پہنچا دیں۔ لیکن امام خمینیؒ رنج و غم کے اس ماحول میں بھی اپنی شرعی ذمہ داری سے غافل نہیں ہوئے اور اپنے گھر والوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے: ''گھر کا یہ ٹیلی فون بیت المال کی ملکیت ہے اور تم اپنی ذاتی خواہش کے تحت تہران سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہو لہٰذا یہ کام جائز نہیں ہے۔'' اگر انسان قدرے غور و فکر سے کام لے تو اسے اس حقیقت کا اندازہ ہوجائے گا کہ اولاد کی شہادت کے

بعد بھی وہ اپنی شرعی ذمہ داری سے غافل نہیں ہوئے اور ایسے حالات میں بھی وہ بیت المال کو ذاتی مقصد کے لیے خرچ کرنے پر رضامند نہیں ہوئے۔

فضول خرچی کے سلسلے میں امام خمینیؒ کا ردِّ عمل

اپنی دس سالہ قربت ونزدیکی کے دوران میں نے دیکھا کہ امام خمینیؒ سادہ زندگی اور فضول خرچی سے مکمل پرہیز کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ میں نے متعدد بار دیکھا کہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر ایک طرف چل پڑتے تھے۔تھوڑی دیر بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ بے مقصد جلنے والے بلبوں کو بجھانا چاہتے ہیں۔

وہ گھر آنے والے ٹیلی فون کے سلسلے میں بڑی وضاحت سے بتادیتے تھے کہ بھائیو! افراط اور فضول خرچی سے بچو اور خرچیلے کام مت کرو۔ پانی پیتے وقت وہ گلاس میں بچے ہوئے پانی کو کاغذ سے ڈھک دیتے تھے اور اس کو بعد میں استعمال کیا کرتے تھے۔ اور اگر ان کے بدن میں کسی جگہ زخم ہوجاتا تھا تو وہ کاغذی رومال کو کئی حصوں میں تقسیم کرکے اس کا ایک ہی حصہ استعمال کرتے تھے۔

امام خمینیؒ اپنے گھر کے جملہ اخراجات کو خود اپنے کنٹرول میں رکھتے تھے۔ مالی امور کے ذمہ دار افسران گھر کے کسی سامان کی خریداری امام خمینیؒ کی منظوری کے بعد ہی کیا کرتے تھے۔

معاملات میں نظم وترتیب

دوسری اہم بات یہ ہے کہ امام خمینیؒ ہر کام میں نظم وترتیب کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے پاس ہر دن ورات ۲۴ گھنٹے کا خصوصی پروگرام مرتب رہا کرتا تھا۔مثلاً وقت مطالعہ، وقت نماز ودعا، مسلمانوں کے مسائل پر غوروفکر کا وقت، ملاقات کا وقت اور سونے ودیگر ذاتی کام انجام دینے کا وقت۔شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی پربرکت زندگی کا بھرپور استعمال کیا۔

امام خمینیؒ اوّل وقت نماز کے لیے کھڑے ہوجاتے تھے اور نہایت خضوع وخشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔ نماز سے قبل وہ تلاوتِ قرآن میں مشغول رہا کرتے تھے۔ مغرب و عشاء کی نماز کے بعد وہ گھر کے صحن میں قبلہ رو کھڑے ہوکر پانچ منٹ تک دعا پڑھا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک موثق آدمی سے بیان ہے کہ امام خمینیؒ صحن خانہ میں یہ دُعا پڑھا کرتے تھے: تحصنت بدارٍ سقفها لا اله الا الله و نورها محمد رسول الله و بابها ولی الله و ارکانها لاحول ولاقوّ الا بالله۔ اور امام خمینیؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ روزِ جمعہ کے آخری لمحات میں سات مرتبہ اللهم صلی علی محمد و آل محمد و ادفع عنّا الهلاء المبرم من السماء انت علی کل شیئٍ قدیر پڑھنا چاہیے۔

امام خمینیؒ ہر رات نمازِ شب پڑھا کرتے تھے اور اسی وجہ سے وہ نمازِ صبح سے دو گھنٹہ قبل اُٹھ جاتے تھے اگر وقت ساتھ دیتا تو وہ دیگر مستحب نمازیں بھی پڑھ لیا کرتے تھے اور اگر نمازِ صبح میں کچھ وقت باقی رہتا تو وہ مختلف اخباری اطلاعات کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔

امام خمینیؒ کو بیرونی ممالک کے ریڈیو سے نشر ہونے والی خبروں کو سننے کا بڑا شوق تھا چنانچہ وہ بیرونی ممالک کے ریڈیو برابر سنا کرتے تھے۔ ایرانی ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والے ایک پروگرام میں ملت اسلامیہ اس بات کا مشاہدہ کرچکی ہے کہ بیماری کے زمانے میں بھی امام خمینیؒ نے نمازِ شب ترک نہیں کی اور ریڈیو نیوز سننا ان کی خاص دلچسپی تھی چنانچہ آپریشن کے تین روز بعد انھوں نے کہا کہ ٹیلی ویژن کا انتظام کیا جائے تاکہ اس سے استفادہ کیا جاسکے۔

حجۃ الاسلام والمسلمین سیّد حسن خمینی

امام خمینی اور اسلامی انقلاب کے فضائل وکمالات

بیسویں صدی کو "عظیم انقلابوں" کی صدی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایسی صدی جو اپنے ابتدائی سالوں سے لے کر آخر تک دنیا کے مختلف مقامات پر مختلف تحریکوں اور انقلابوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ایران میں انقلاب مشروطیت، روس میں انقلاب اشتراکیت، چین میں موزے تنگ کا انقلاب اور دنیا کے دیگر مقامات پر چھوٹی بڑی تحریکیں اس حقیقت کی زندہ گواہ ہیں۔

انقلاب مشروطیت کے علاوہ مارکسزم کو اپنا آئیڈل بنانا اور طبقاتی کشمکش کے راستے پر چل نکلنا، ان تمام تحریکوں اور تبدیلیوں کا مشترکہ باب اور اہم قدر مشترک تھی۔ درحقیقت مذکورہ انقلابوں کا فریم ورک اور مطمحِ نظر، اقتصادی مفادات، انسان کے متعلق کسی خاص نظریہ اور مذہب اور معنویت سے پاک حکومتی ڈھانچے کے قیام سے عبارت ہیں جیسا کہ فرانس کے انقلاب کبیر نے ترقی پسند دور میں جدیدیت کے نظریہ کے ذریعہ، انسانی معاشرے اور دنیا کے متعلق نئی بصیرت کا راستہ ہموار کیا جو مغربی آئیڈیالوجی کے قالب میں ظاہر ہوا۔ اس کی بنیاد مادیت پرستی پر استوار ہے۔ سوشلزم نے معاشرتی مساوات کا نعرہ لگا کر مذکورہ تحریکوں میں اپنے ظہور کو ثابت کیا۔ اس کی روح بھی مادہ پرستی اور روحانیت اور معنوی ثمرات کا انکار ہے۔ درحقیقت بیسویں صدی کے انسان نے روحانیت، دینی اور نظریاتی اصولوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے، جامع کوششوں کا آغاز کیا تاکہ معاشرہ، تاریخ اور اپنی (انسان کی) بالکل نئی تعریف پیش کرسکے اور اپنے سیاسی نظام کی بنیاد رکھ سکے۔ یہ سب کچھ اس اصول پر ایمان لانے کے بعد ممکن تھا جس میں دین کو اقوام کے لیے تریاق اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی و

مادی خوشحالی کی ضد سمجھا جاتا ہے۔

اسلامی انقلاب کی بیسویں صدی کی آخری دہائیوں یعنی ۱۹۷۹ء میں ظہور پذیری نے اپنی مثال آپ قسم کی خصوصیات کے ذریعے انسانی معاشرے اور کائنات کی ایک نئی تعریف پیش کی۔ دو ساختی انسان نے، اپنے معنوی پہلو پر بھروسہ کرتے ہوئے اور رہبانیت کی دینی بنیاد پر مبنی سیاست کی تعریف و عملداری پر اصرار کرتے ہوئے طاقت کے استعمال میں اخلاقی اور عرفانی قدروں کو مدنظر رکھ کر دوسری ملینیم کے آخری انقلاب میں عملی کردار کی ایسی بنیاد رکھ دی ہے جس کی ان خصوصیات نے اسے دوسرے انقلابوں اور تحریکوں سے ممتاز بنادیا ہے۔ درحقیقت اگر دنیا کے ہر حصے کے دوسرے انقلابات اپنے مادی رجحانات کے سبب اپنی ماہیت اور روح کو دین و مذہب اور اخلاقی و روحانی اقدار کی نفی میں زندہ محسوس کرتے ہیں اور دین اور دینی اصولوں کا مقصد عوام اور اقوام کی پسماندگی گردانتے ہیں، انسانوں کی آزادی کو مذہب اور مذہبی آداب و رسوم سے دوری کا مرہون منت سمجھتے ہیں تو ان افکار کے مقابلے میں اس صدی کے آخر میں ایسا انقلاب ظہور پزیر ہوا جس کی جڑیں اور جس کا مبداء وحی اور اس سے برخاستہ اقدار میں ہیں جس نے دین اور اس کی نظریاتی بنیادوں پر تکیہ کیا ہے۔ اس نے مختلف نظریوں کے میدان میں تحریک کی ایک نئی تھیوری پیش کی۔ اس نئی تھیوری کے بانی نے جو اس عظیم عوامی تحریک کی رہنمائی کررہے تھے دینی ماحول کے بطن سے قیام کیا جو خود ممتاز فقہاء اور دین و مذہب اپنے مفہوم میں نہ صرف اقوام کے لیے تریاق ہی نہیں بلکہ انسانی تاریخ سازی اور معاشرے کی اصلاح کے لیے عظیم ترین حد کی توانائی بھی ہے۔

یہاں ایک بنیادی اور اہم سوال بھی ذہن میں اُبھرتا ہے وہ یہ کہ ایران کے اسلامی انقلاب کی اس اہم خصوصیت کا راز کیا ہے کیونکہ دینی فکر اور اس کے معنوی ثمرات ایک بار پھر اتنے عظیم طوفان کو برپا کرسکے ہیں کہ جس نے نہ صرف ایران اور عالم اسلام بلکہ تمام عالمی تعلقات اور اس کے دوسرے کونا کوں شعبوں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں؟

اس سوال کا جواب اس کی دینی فکر اور معنوی تخلیقی ثمرات کے معجز نما کردار میں تلاش کیا جاسکتا ہے کیونکہ ایران کا اسلامی انقلاب دوسری سیاسی اور اجتماعی تحریکوں کے مقابلے میں ایک تاریخی انقلاب ہے۔ سیاسی تحریکوں کا مقصد فقط طاقتوروں کی اکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے۔ معاشرتی تبدیلوں کا مطمع نظر متعلقہ انقلابی معاشرے کے تعلقات اور دوسرے سیاسی، معاشی رابطوں میں ردّ و بدل ہوتا ہے جبکہ تاریخی انقلابوں میں زمان اور مکان کی حد بندیوں سے ماورا انقلابی فکر اور فلسفہ پر زور دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی انقلابات چونکہ جامع پیغام کے حامل ہوتے ہیں لہٰذا وہ زمان و مکان اور قوم سے ماورا انقلابات کہلائیں گے۔ اسلامی انقلاب کا پیغام حقیقت میں فرانس کے انقلاب کی ضد اور اس کے نتائج کے برعکس ہے یعنی یہ پیغام درحقیقت دینداری، ایمان کی گہرائی، روحانیت، بدعنوانیوں کے دلدل، تباہی و بربادی اور ظلم و ناانصافی سے انسان کی نجات اور آزادی کا پیغام تھا اور یہ پیغام تاریخ کے تمام انسانوں اور نسلوں، سب زمانوں اور تمام مقامات و میدانوں کے لیے ہے۔

امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

''میرا مطمع نظر کوئی خاص مقام نہیں ہے، میرا مقصود ظلم کے خلاف جہاد ہے۔ یہ جہاد جہاں پر بہتر طور پر ہوسکے وہاں ہوگا۔'' (صحیفہ نور جلد ۴ صفحہ ۱۱۰)

امام خمینیؒ دینی فکر کے مجدد

اسلام بھی دوسرے الٰہی ادیان کی طرح ہمیشہ جہالت پسندوں اور دشمنوں کی طرف سے تحریف و تخریب کا نشانہ رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ یہ بھی واضح ہے کہ کسی بھی فلسفہ یا سوچ کی طاقت اور ترویج خصوصاً دینی فکر و نظر کی تائید جس طرح اپنی درست سمت اور خالص حالت میں تعمیری بھی ہے اور باعث نجات بھی۔ اسی طرح اپنی تحریف شدہ صورت میں ویسی ہی مہلک اور غلامی کا موجب بھی ہے۔ اسلامی فکر کے میدان میں امام خمینیؒ کی بصیرت اور اس کے

دوسروں تک پہنچانے کے عمل سے اسلامی انقلاب کی فکری بنیادوں اور جڑوں کی تعمیر کی گئی۔ امام خمینیؒ کا عقیدہ یہ ہے کہ سیاست دین سے ماخوذ ہے اور جہاد، انقلاب، اصول اور اس کی بنیادیں اسلامی اصول کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ امام خمینیؒ کی بصیرت کی رو سے عالمی تسلط اور استکبار کے خلاف جہاد اور اس طرح ظلم وستم اور بے انصافی کے خلاف جدوجہد ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے۔ امام خمینیؒ کی اسلامی تعبیر یہ ہے کہ اسلامی فکر تمام مادی اور معنوی میدانوں میں انسان کی طاقت اور حکمرانی کی ضمانت ہے۔ امام خمینیؒ نے ہمیشہ مسلمان عوام کو خالص اسلام کی طرف لوٹانے کے لیے ہمہ گیر جدوجہد کی ہے۔ امام خمینیؒ کے نظریہ کے مطابق خالص اسلام وہ ہے جس میں آگاہی، آزادی، معاشرتی انصاف ہو، اسلام میں ظالموں اور استکبار کے خلاف جہاد کی دعوت عام ہے۔ خالص اسلام یعنی محرومیوں، مستضعفوں اور پابرہنہ عوام کے اسلام کا امریکی اسلام کے مقابلے میں، جو مستکبرین اور ستمگروں کا اسلام ہے، امام خمینیؒ کے ذریعے احیا ہوا جس کے نتیجے میں اسلام نے نہ صرف ایرانی معاشرے اور عوام کے رگ و پے میں بلکہ اس سے بڑھ کر عالم اسلام میں سرایت کر کے اپنی ماہیت پالی۔ بنیادی طور پر دینی فکر کا احیاء ''دین'' کو پورے معاشرے میں نافذ کرنے کی کوشش اور معاشرے میں دین کے نفاذ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی تو دین داروں کی بصیرت اور التزام کا موجب ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں میں انصاف کا قیام اور ظلم سے انکار کی جانب ایک اجتماعی عوامی تحریک ہے۔

امام خمینیؒ کی بصیرت کے مطابق دین کی ذمہ داری زندگی کے تمام شعبوں میں انسان کی ہدایت اور رہنمائی کرنا ہے۔ وہ سیاست کو آلام سے جدا کرنے کو اصلی اور خالص دین کی بربادی قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ سوچ دراصل عالمی استکبار، اسلامی ممالک میں ظلم پسند، وابستہ حکومتوں اور مغرب زدہ، نمک خوار اور خودفروش ایجنٹوں سے تشکیل شدہ شرمناک جماعتوں کی طرف سے پھیلائی گئی ہے۔ حضرت امام خمینیؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں:

''یہ (جو کہتے ہیں) کہ دیانت (دین) سیاست سے الگ ہو اور علمائے اسلام کو سیاسی اور معاشرتی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے یہ استعمارگروں نے کہا ہے اور دنیا میں افواہ اڑائی ہے۔ یہ بے دینوں کا مقولہ ہے۔ کیا حضرت پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں سیاست دین سے الگ تھی؟ یہ سب باتیں استعمارگروں اور ان کے سیاسی ایجنٹوں نے گڑھی ہیں۔ تا کہ وہ دین کو دنیوی امور میں مداخلت اور مسلمانوں کے معاشرے کی صف بندی سے روک سکیں اور ساتھ ہی علمائے اسلام کو عوام سے اور آزادی اور خودمختاری کے لیے جہاد کرنے والوں سے الگ کردیں اور وہ اسی صورت میں عوام پر غلبہ حاصل کرسکتے ہیں اور ہمارے وسائل کو لوٹ سکتے ہیں۔ ان کا مقصد یہی ہے۔'' (ولایت فقیہ صفحہ ۱۶)

مختصر یہ کہ امام خمینیؒ کی سیاسی بصیرت دین سے الگ ہرگز نہیں ہے۔ ان کے افکار میں دین کا ایک خاص اور اہم مقام ہے۔ دنیوی و اخروی سعادت، ظاہری، باطنی، مادی اور معنوی احکام کا سرچشمہ دین ہی ہے اور مجموعی طور پر دین کی ذمہ داری ہر اس چیز کا بیان ہے جو انسان کی سعادت سے متعلق ہو۔

دوسری طرف جس اسلام کے مبلغ امام خمینیؒ ہیں وہ ایسا دین ہے جو زندگی اور اجتماعی میدانوں میں عام لوگوں میں دنیا کے معاملات کو معقول اور خردمندانہ طریقے سے چلانے کی اہلیت ثابت کرے اور قابل محسوس مفادات کی حفاظت اور لوگوں کے محاسبے کی طاقت رکھتا ہو۔ اسی لیے امام خمینیؒ ایک آگاہ اور زمانہ شناس مفکر کی حیثیت سے ہر قسم کی کج فکری اور کجروی کو باطل گردانتے ہیں اور اسے دین کی سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں پرورش اور ترویج میں مخل سمجھتے تھے۔ انھوں نے مایہ دار اجتہاد کی بنیاد رکھی جس کے پرتو میں زمان و مکان کے عناصر اور عینی حالات و واقعات کی شناخت کے حوالے سے درپیش مسائل کو حل کرنے میں رہنمائی ملتی ہے۔

امام خمینیؒ نے دین کو ایک زندہ اور نجات دہندہ نظام کے طور پر پیش کیا، ایسا دین جو

انصاف، آزادی، استقلال اور خود ارادیت کی دعوت دیتا ہے نہ کہ ان کے خلاف۔ امام خمینیؒ اس اسلام کی بات کرتے ہیں کہ جو عوام کے بنیادی حقوق کا پاسدار، انسانی تکریم کا محافظ اور آزادی و معاشرتی انصاف کا حامی ہے اور یہ بذات خود معاشرتی، سیاسی میدان میں اسلام کی سب سے زیادہ دلپذیر خصوصیت شمار ہوتی ہے کہ انسان کے فطری حقوق سے مقابلے کے بجائے، ان سب کا محافظ و داعی ہے۔ امام اس کے متعلق فرماتے ہیں:

''مطمئن رہیے جو کچھ بھی معاشرے کے حق میں ہے، انصاف کا قیام، ظالم ہاتھوں کا توڑنا، خودمختاری اور آزادی کی ضمانت، اقتصادی نشوونما اور دولت کی معقول، قابل قبول تقسیم وغیرہ یہ سب کچھ مکمل طور پر اسلام میں موجود ہے اور وہ کسی غیر منطقی تاویل کا محتاج نہیں ہے۔ (۳۲صحیفہ نور، جلد ۲، صفحہ ۱۸)

امام خمینیؒ اور اسلامی وحدت

حضرت امام خمینیؒ دینی فکر کے مقاصد اور ارمانوں کی ترویج اور عملی تصویر کے لیے ایمان اور عقیدہ پر مبنی ''وحدت'' اور ''جہاد'' کا واضح عقیدہ رکھتے تھے۔ ''وحدت'' مختلف میدانوں کے لیے، خصوصی طور پر عالم اسلام کی وحدت اور ''جہاد'' خصوصی طور پر عالمی تسلط پر مبنی نظام کے خلاف، اگرچہ ایران کے اسلامی انقلاب پر مکتب تشیع کی گہری چھاپ تھی اور اس انقلاب کے اصلی جوہر اسی مکتب کے پرتو میں شکل پذیر ہوئے لیکن یہ انقلاب کبھی بھی صرف شیعہ مذہب کے لیے نمونہ نہیں بنا بلکہ دشمنوں کی طرف سے تمام تر کوششوں اور سازشوں کے باوجود اس عظیم تحریک کی لہروں نے پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پوری دنیا کے مسلمانوں کے دلوں کو اپنی طرف متوجہ کیا کیونکہ یہ انقلاب اسلامی ہے اور اسلام جیسے جان فزا مکتب کے ذریعے پرورش پا رہا ہے۔

امام خمینیؒ اپنی بار بار کی تقاریر میں کامیابی اور آزادی کے لیے وحدت و اتحاد اور بھائی

چارے کی اہمیت پر زور دیتے رہے ہیں خصوصاً استکبار اور غیر ملکی تسلط پسندوں اور اسی طرح اندرونی لٹیروں اور ظالموں سے نجات کے لیے اتحاد اور بھائی چارہ ضروری ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''اگر مسلمان اسلامی احکام پر عمل کریں، اتحاد کی روح کو برقرار رکھیں اور اختلافات اور تنازعہ سے ہاتھ کھینچ لیں جو کہ ان کی شکست کی اصل وجہ ہیں تو لا الہ الا اللہ کے پرچم کے سائے میں اسلام دشمنوں اور عالمی غارتگروں کے ہاتھوں سے محفوظ ہو جائیں گے مشرق و مغرب کا اثر و رسوخ اپنے عزیز ممالک سے ختم کر دیں گے کیونکہ ان کی تعداد بھی سب سے زیادہ اور وسائل بھی نہ ختم ہونے والے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی غیر متناہی طاقت ان کی نصرت کے لیے موجود ہے اور سپر طاقتیں ان کی محتاج ہیں۔'' (تبیان وحدت ص ۲۰۰)

امام خمینیؒ کا نظریہ وحدت وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ مجموعی طور پر تمام مسلمانوں یا مستضعفین کا دین کے جامع مقاصد اور ترقی و کمال کے حصول کے لیے متحد ہونا، جس کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں ان میں سب سے اہم عالمی استکبار کے خلاف اسلامی امت کا اتحاد ہے جو کہ مسلمان معاشروں کے مشترکہ اصولوں، مقاصد اور ایک جیسے ارمانوں پر توجہ دینے ہی کی صورت میں وقوع پذیر ہوگا۔

امام خمینیؒ کے نقطہ نظر میں اسلامی جدوجہد کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ تمام طبقے اس کے دو اہم ارکان یعنی اسلام اور وحدت پر پابند ہو کر یک زبان ہو جائیں۔ لازمی طور پر حضرت امام خمینیؒ کے پیش نظر ان دو اہم عوامل کا وہ کردار بھی ہے جس کے سبب امت اسلامی کی نجات اور خوشحالی بھی حاصل ہو۔ آپ فرماتے ہیں:

''اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ صدر اسلام والی عزت اور عظمت پھر سے حاصل کر لیں تو انھیں اسلام اور اتحاد پر کاربند ہونا چاہیے۔ یہ اسلام کے محور پر وہ اتحاد تھا جس

نے مافوق الفطرت طاقت اور شجاعت کی ایجاد کی۔'' (صحیفہ نور ج۸، ص ۲۳۰)

امام خمینیؒ کے کلام سے یہ واضح ہے کہ امت اسلامی میں مذہبی اختلاف کو مدنظر رکھتے ہوئے اتحاد کا تقاضا، عقائد اور مذہب میں اتحاد نہیں ہے بلکہ ان کی اصل مراد امت اسلامی کا سیاسی اتحاد ہے جو دین کے مجموعی اصولوں اور مسالک کے مشترکات پر عمل پیرا ہوکر حاصل کیا جائے۔

دوسرا اہم نکتہ جسے امامؒ کی تھیوری اور عملی مکتب میں خاص اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے اتحاد ایک تاکید یا مصلحتی ہتھیار نہ تھا بلکہ اس عظیم شخصیت کی تاکید، وحدت و اتحاد کے تمام مذہبی و دینی مفاہیم پر تھی کیونکہ وہ اسلامی امت اور معاشرے کو ہر قسم کے اختلافات سے محفوظ رکھنے کو ایک شرعی اور الٰہی ذمہ داری تصور کرتے تھے۔

ظلم اور ناانصافی 'استحصال اور امتیازی سلوک کے خلاف جہاد ان اہم ترین مدارج میں سے ایک ہے جسے امام خمینیؒ نے تمام دنیا میں اور خصوصی طور پر عالم اسلام میں پھیلانے کا بیڑا اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی پوری توانائی عالمی ظالمانہ نظام اور تسلط پسند نظام کے جامع نیٹ ورک کی ماہیت اور اصلیت کو بے نقاب کرنے میں صرف کی اور ان شرمناک اور شیطانی سازشوں کو فاش کردیا جو ماضی اور حال میں ستمگر ظالموں کی طرف سے مظلوم اور مستضعف اقوام پر روا رکھے گئے۔ اس سلسلے میں آپ فرماتے ہیں:

''ظالم کی حمایت، مظلوموں پر ظلم کی طرح ہے۔ سپر طاقتوں کی حمایت انسانیت پر ظلم ہے۔ جو ہم سے یہ مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ ہم ان کی حمایت کریں، وہ یا تو جاہل ہیں یا پھر ایجنٹ! ظالم کی حمایت یعنی اس کا مزید ظلم وستم کے لیے ہاتھ بٹانا تمام انبیاء کی تعلیمات کے خلاف ہے۔'' (صحیفہ نور جلد ۱۹، صفحہ ۱-۲۰)

امام خمینیؒ اچھی طرح جان چکے تھے کہ عالمی استکبار نے ایک وسیع اور جامع نیٹ ورک

کے ذریعے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اس قدر وسیع کہ گویا مستضعفین اور محروم اقوام کے لیے یہ باور کرنا کہ وہ ان کے تسلط سے نجات پا سکتے ہیں نہایت مشکل اور دشوار ہو گیا ہے۔ غلام اور مستضعف عوام نے گویا بے انصافی اور غلامی کو اپنا حتمی مقدر سمجھ رکھا ہے اور گویا تسلط پسند عالمی طاقتوں کی غلامی کو اپنی اور اپنے معاشرے کی بقاء اور زندگی کے لیے اہم ضرورت کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ امامؒ جانتے تھے کہ سب سے پہلے محروم اقوام کو ہوش میں لانا چاہیے اور انھیں شدید مایوسی کے دلدل سے نجات دلانا چاہیے اور یہ چیز صرف تسلط پسند نظام کی تحقیر کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ضروری ہے کہ مستضعفین اور عالم اسلام کو یہ دکھایا جائے کہ نہ صرف تسلط پسندوں کے آگے ہتھیار ڈالنا آخری حربہ نہیں بلکہ تسلط پسندانہ نظام مکمل طور پر تسخیر پذیر ہے۔ لہٰذا امام خمینیؒ نے اپنی تحریک کے آغاز ہی سے امریکہ اور سپر طاقتوں کے دوسرے نیٹ ورک کے خلاف آواز بلند کی اور بار بار اپنے اہداف و مقاصد کو واضح طور پر بیان کیا۔ امام نے اس جہاد میں مظلوم اقوام خصوصاً مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ محروموں کی نجات اور آزادی کا راستہ صرف مستکبرین اور تسلط پسند استکبار کے خلاف جہاد ہی سے میسر ہے۔ لہٰذا امام خمینیؒ نے مظلوموں اور مستضعفین کو اپنے پامال شدہ حقوق کے لیے بیدار کیا اور انہیں اپنی قومی اور اسلامی حیثیت کی حفاظت کی دعوت دی۔ امامؒ فرماتے ہیں:

> ''میرے عزیز بھائیو اور بہنو! آپ جس ملک میں بھی ہوں اپنی قومی اور اسلامی حیثیت کی حفاظت کریں۔ ہمارے تمام مادی اور معنوی مفادات تو سپر طاقتیں لے جاتی ہیں اور ہمیں غربت اور سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور دفاعی وابستگی اور غلامی میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ ہوش میں آیئے اور اپنے اسلامی تشخص کا ادراک کیجیے ظلم کے آگے سر تسلیم خم نہ کیجیے اور پورے اعتماد کے ساتھ عالمی لٹیروں، جن میں امریکہ سرفہرست ہے، کی سازشوں کا پردہ چاک کر دیں۔'' (صحیفہ نور جلد ۱۹، صفحہ ۲۲۶)

اور دوسری طرف امامؒ نے مسلمان اور مظلوم اقوام کے درمیان جہاد و شہادت طلبی کے

کلچر کو فروغ دیا اور یہ باور کرلیا کہ ظلم اور ظالم کے خلاف ڈٹ جائیں اپنے پامال شدہ حقوق کو حاصل کریں۔ آپ فرماتے ہیں:

''میں نے اپنی ناچیز جان اور خون اسی حکم کے نفاذ کے لیے اور مسلمانوں کی حفاظت جیسے مقدس فرض کی خاطر تیار کرلی ہے اور میں شہادت جیسے عظیم مرتبے پر فائز ہونے کے انتظار میں ہوں۔ طاقتیں، سپر طاقتیں اور ان کے ایجنٹ اطمینان رکھیں کہ اگر خمینیؒ اکیلا بھی رہ جائے تب بھی اپنے مشن کو جو کہ کفر، ظلم، شرک اور بت پرستی کے خلاف جہاد ہے، جاری رکھے گا۔'' (صحیفہ نور جلد ۲۰، صفحہ ۱۱۳)

عالمی تسلط پسندانہ نیٹ ورک کے خلاف جہاد کے متعلق امام خمینیؒ کے غیر متزلزل ٹھوس موقف نے ایک طرف تو دنیا پر چھائے ہوئے ناپسندیدہ نظام کے محافظوں اور تسلط پسند حکمرانوں کی روح و جان پر خوف و ہراس طاری کردیا تھا اور دوسری طرف مستضعفین اور تاریخ کے تحقیر شدہ لوگوں کے افسردہ دلوں کو ایمان، آزادی اور فتح اور کامرانی کی امید کی کرن سے منور کردیا تھا اور یہی وہ چیز ہے جو امام خمینیؒ کی شخصیت کے جاذبہ و دافعہ کی معیار قرار پائی۔ عالمی تسلط پسندانہ نظام نے اپنی پوری طاقت، اقتدار کا رعب اپنے تمام وسائل اور ہتھیاروں کو استعمال میں لاتے ہوئے امام خمینیؒ کے افکار اور ارمانوں کی تحریف و تخریب کے لیے کمر باندھ لی۔ دوسری طرف حق طلبی، ارمان پسندی استکبار اور ظلم سے رہائی اور حقیقی خودمختاری اور آزادی حاصل کرنے کی زبردست لہر دنیا کے اکثر مقامات پر مستضعفین اور محرومین کے جان و قلب اور ضمیروں میں موجزن ہوگئی۔ مسلمانوں نے اپنا انسانی اور اسلامی تشخص ڈھونڈ لیا اور آزادی اور خودمختاری کے راز کو پالیا اور یہ باور کرلیا کہ یہ نعمتیں ایمان اور اسلام اور اسلامی اخلاق پر پابندی ہی کی مرہون منت ہیں اور اسی میں انھیں تلاش کیا جانا چاہیے اور تب ہر اس چیز کے خلاف جہاد کے لیے تیار ہوئے جو کہ انسان کی عظمت ترقی اور انسانی اقدار کی سربلندی کے خلاف ہوں اور اس راستے میں کسی قسم کے خوف و ہراس کو اپنے دل میں جگہ نہ دی اور اسی

وقت سے مغرب استکباری کلچر کے محافظ کے طور پر اپنی تمام تر کوششوں اور طاقت کے ذریعے اسلام کے مقابلے پر آ کھڑا ہوا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کو اپنا اصلی دشمن قرار دینے لگا ہے لیکن مسلمان اقوام نے اپنے امامؒ سے یہ سبق اچھی طرح سیکھ لیا ہے کہ ایمان، اتحاد اور جذبہ قربانی کے ذریعے، استکبار اور ظلم کی بلند و بالا عمارت کو تباہ کر کے اس کے کھنڈرات پر آزادی اور معاشرتی انصاف کی عمارت نو کو تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ اب ہم امام خمینیؒ کے فقہی اور عرفانی نظریات کے حوالے سے اپنی گفتگو کو آگے بڑھائیں گے جو اس عظیم اسلامی انقلاب کے لیے بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

امام خمینیؒ کا عرفانی تصور کائنات

اب ہم انقلاب اسلامی کے حوالے سے امام خمینیؒ کے عرفانی نظریات کا مختصر جائزہ لیں گے۔ انسانی تاریخ میں معروف اور ممتاز چہروں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(i) سلاطین (ii) حکماء (iii) انبیاء

ان تینوں گروہوں کی اہم خصوصیت ان کے گفتار اور کردار کی مطابقت سے متعلق ہے۔ گفتار کی صداقت کردار سے ظاہر ہوکر ہی تاریخ میں ان کے معیار کا تعین کرسکتی ہے۔

سرکش سلاطین اور حکمراں پوری تاریخ میں ہمیشہ لہولعب اور شر وفساد میں مبتلا رہے ہیں۔ اقتدار کی حفاظت و وسعت اور ہر لحاظ سے اپنے تسلط کو قائم رکھنے سے آگے ان کی سوچ کبھی نہ بڑھی۔ ان کے سامنے عوام اور ان کے انسانی حقوق کی کوئی وقعت نہ تھی اور نہ ہی عزت، شرافت، اور تکریم انسانی کا پاس۔ انصاف، مساوات، انسانی حقوق، بہبود و رفاہ اور دوسری مثبت قدریں ایسے نعرے تھے جن کے بہانے وہ انصاف پسندوں، مخلص حریت پسندوں اور دوسرے عوامی رہنماؤں کی سرکوبی، ان کی نفی اور اجتماعی بربادی کا سامان کرتے رہے۔ حقیقت میں ان کے عمل اور کردار میں واضح اور گہرا تضاد تھا۔ اس خود پسند حکمراں طبقے نے

شعور و آگہی کی وسعت کے لیے انسانی افکار پر نہ تو کسی قسم کا کوئی مثبت اثر چھوڑا ہے نہ ہی محبت اور پیار کے لیے ان کے دلوں میں کوئی امید کا چراغ روشن کیا ہے۔ بلکہ ان سرکش، تسلط پرست اور مغرور حکمرانوں کا سارا زور پوری تاریخ میں علم و آگہی کے پیکر دانشوروں کو قید و بند میں مبتلا کرنے اور آزادی و انصاف کے متوالوں کو محبوس کرنے پر صرف ہوتا رہا ہے جو آئندہ بھی جاری رہے گا اور چراغ عقل کو انسان شناسی میں پہلے سے زیادہ مشتعل کرتا رہے گا۔ جبکہ خدا کے نیک بندے ان سب باتوں سے ہٹ کر انسان کے باطن میں موجود کشش اور عرفانی جذبوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ وہ انسانوں کو صراط مستقیم کا نمونہ ودیعت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک فلسفی اپنے شاگرد پیدا کرتا ہے اور پیغمبر اور انبیاء، اولیاء پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت تک پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔ فلسفی انسانوں کے شعور اور عقل پر رسائی حاصل کرتا ہے۔ جبکہ انبیاء اور انسان کے دل وفطرت اور طبیعت کو اپنا گرویدہ بنالیتے ہیں۔ فلسفی محقق پروان چڑھاتا ہے اور پیغمبر ایثارگر اور سرفروش!

یہی وہ زاویہ نگاہ ہے جس کے ذریعے امام خمینیؒ کی پہچان ممکن ہے، ایسا شخص جس نے بیسویں صدی کا سب سے عظیم اور گرانقدر انقلاب تخلیق کیا ہے اور اسی کی بدولت گذشتہ صدی کا نام ''انقلابوں کی صدی'' رکھا گیا ہے۔

ایسی شخصیت جس نے مسلمانوں کے دلوں کو مبارزہ و جہاد جیسے عالی جذبوں سے سرشار کیا۔ امریکہ اور غول پیکر استکبار کے خلاف مزاحمت کی طاقت اور غاصب اسرائیل کے ساتھ کسی قسم کی سودے بازی کی نفی جیسی نعمت سے مسلمانوں کو نوازا ہے۔

انقلاب اور امام خمینیؒ ایک ہی وقت اور ایک ہی جگہ میں دو چیزیں جو نہ تو ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کو تحت الشعاع میں قرار دیتے ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی شناخت کا ذریعہ ہے۔

اسلامی انقلاب پیغام الٰہی ہے اور امام خمینیؒ اس کے پیامبر، انقلاب اسلامی ایران کے اسرار

کا ادراک تب ہی ممکن ہے جب آپ امام خمینیؒ کی شخصیت کا صحیح طور پر ادراک کرلیں، ایسے مقام پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس عظیم اسلامی انقلاب کو نہ سمجھنے کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کی معروف و مشہور ترین ہستی اب تک لاعلمی کے دبیز پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی اور ناشناختہ رہ گئی ہے۔

اکثر مبصرین اسلامی انقلاب کے فلسفے اور اس کی بنیادوں کے ادراک اور اس کے ظہور کے علل و اسباب نہ جاننے کے بجائے، اس کی کیفیت اور اس کے سیاسی اور اقتصادی حالات کے متعلق پورا زور صرف کر رہے ہیں جبکہ انقلاب کے بنیادی فلسفے کا ادراک، انقلاب کی پیش رفت اور اس کی حفاظت کے لیے بہتر طور پر کردار ادا کرسکتا ہے۔ اس کے لیے یہی ایک راستہ ہے کہ امام خمینیؒ کے انقلابی افکار کے عرفانی پہلوؤں کو اُجاگر کیا جائے۔

۱۹۷۹ء میں وقوع پذیر ہونے والے انقلاب کے بارے میں امام خمینیؒ جو عرفانی نکتہ نظر رکھتے ہیں۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، امام خمینیؒ کے مکتوبات اور بیانات میں بکثرت ایسے شواہد موجود ہیں جن کے مطابق اسلامی انقلاب کو زمینی عوامل اور مشیت الٰہی پر مشتمل ایک واقعہ کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔ افراد میں ایسی توانائی کہاں جو اس قدر عظیم تحریک کا آغاز کریں اور اتنی بڑی طاقت پیدا کردیں۔ یہ انسان کا کام نہیں ہے۔ ایک مملکت کے تمام عورتوں، مردوں بچوں اور بوڑھوں کا یوں متحد ہوجانا، اس میں خدا کارساز ہے۔ یہ خدا کا ہاتھ ہے۔ یہ الٰہی ارادے کا نتیجہ ہے جس نے ملک کے تمام طبقات کو ایک دوسرے کا بھائی بنادیا ہے اور تمام مادی اصولوں کو غلط ثابت کردیا ہے۔ یہ خدا کا ہاتھ اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا اپنا ارادہ ہی ہے۔'' (صحیفہ نور جلد ۶، ص ۱۱۳)

حضرت امام خمینیؒ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ سے یہ حقیقت پوری طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ وہ مجسم طور پر عرفانی افکار کے پرتو تھے۔ وہ ہمیشہ عرفانی افکار پر

کاربند رہے۔ اسی طرز فکر ونظر نے ان کے کلام اور خاموشی پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ نصف صدی پر محیط ظلم وستم کے خلاف مزاحمت اور کسی قسم کی تھکاوٹ سے پاک ٹھوس تحریک کا یارا ایک ایسے انسان کو ہی ہوسکتا ہے جس کا توکل اور بھروسہ قدرت مطلق اور کائنات پر ہمیشہ حکم فرما رہنے والی ذات پر ہو۔ ایسا انسان کامل، جو اس راستے پر دیوانہ وار آگے بڑھ رہا ہو اور جس کا مقصد رضائے الٰہی کے سوا کچھ نہ ہو اور اس کا ذکر وفکر سلوک الی اللہ اور دیدار حق ہو۔ ایسا انسان کامل، جو فنافی اللہ ہو، دراصل یہی حق اور حریت انسانی کے راستے کے رہنماؤں کا رہنما اور مجاہد ہو۔ ان کا نظریہ کچھ یوں ہے، فرماتے ہیں:

''وہ سالک جو چاہتا ہے کہ اس کا نام زندہ اور امر ہوجائے، اسے چاہیے کہ خداوند متعال کی رحمتوں کو اپنے قلب تک آنے دے۔ وہ اللہ کی رحمانی اور رحیمی صفات کا پرتو بنے، اس کی علامت اور مذکورہ رحمتوں کے حصول کے آثار اس طرح ہیں کہ وہ مخلوق خدا پر مہربان ہو اور اس سے پیار کرے۔ ہمیشہ خدا سے خیر و برکت کا طلبا گار ہو، یہ طرز انبیاء عظام اور علماء کرام علیہم السلام کا طرز نگاہ ہے۔ البتہ ان کے سامنے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک پہلو معاشرتی اصلاح، (نظام حکومت) اور شہری نظام ہے اور دوسرا پہلو انفرادی سعادت اور ان کا مقصود یہی سعادت کاملہ ہے۔'' (آداب الصلوٰۃ ۲۳۵)

یہ انہیں معہد عرفانی افکار کا نتیجہ ہیں جن کی بنیاد پر مخلوق کے اس عظیم مرشد نے حق کی طرف معاشرے کی حرکت میں ایک غیر معمولی تحریک پیدا کی ہے اور اپنا راستہ ہموار کرتے ہوئے ایک شدید اور جانکاہ مبارزہ کے ذریعے سالکان حق کو ظلم و نا انصافی اور غلامی کے خلاف بھرپور قیام کی دعوت دی کہ آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سیر وسلوک کے راستے میں حائل ایک بہت بڑا پتھر پاش پاش ہوگیا جو کہ وقت کا بڑا طاغوت تھا۔ آپ نے اس شاہی نظام کو ڈھادیا عالمی استکبار اور امریکہ جیسے عالمی غنڈے کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا اور مسلمانوں کے ازلی دشمن اور

قدس کے غاصب یہودیوں اور اسرائیل کو وحشت زدہ کردیا۔

امام خمینیؒ کا نظریہ ہے کہ ''تزکیہ نفس'' کا فقدان، غلط اور ناپائیدار محرک، خود پسندی، ہوس پرستی، دنیا طلبی وغیرہ..... جن کی جڑیں شرک اور بے ایمانی میں پوشیدہ ہیں، یہ انسانی مقام اور مبارزہ کے راستے کی وہ رکاوٹیں ہیں جن کے ہوتے ہوئے انسان کبھی بھی انقلاب برپا نہیں کرسکتا اور اگر کوئی قیام اور مبارزہ شروع بھی ہوجائے تو اس کا جاری رہنا مشکل ہے اور اگر کسی طرح کچھ چل بھی نکلے تب بھی اس کا جاری و ساری رہنا اور اپنے مطلوبہ اہداف تک پہنچنا ناممکنات میں سے ہے اور یہ حقیقت تمام اسلامی تحریکوں کی تاریخ سے ثابت شدہ ہے۔

امام خمینیؒ کا عقیدہ یہ ہے کہ غیر خدا کی پوجا اور غیر خدا کی طرف رجوع انسان کو ظلمانی اور نورانی پردوں میں محبوس کردیتا ہے۔ تمام دنیاوی امور اگر انسان کو دنیاداری میں لگادیں اور خدا کی طرف سے غفلت کا باعث بن جائیں تو ظلماتی حجابوں کا باعث بنتے ہیں۔ تمام عوالم اجسام خدا اور بشر کے درمیان ظلماتی پردے ہیں اور اگر یہ دنیا لقاء اللہ اور آخرت کے سامان کا وسیلہ قرار پائے تب تمام ظلماتی حجاب نورانی حجاب میں تبدیلی ہوجائیں گے۔ ''کمال انقطاع'' یہ ہے کہ ہر قسم کے ظلماتی اور نورانی حجاب ہٹادیئے جائیں تاکہ الٰہی مہمان خانے میں جو کہ عظمت اور شرف کی کان کی مانند ہے، داخل ہوا جاسکے۔ (مبارزہ بانفس ص ۱۷) پس معلوم ہوا کہ امام خمینیؒ کی نظر میں انقلاب کا فلسفہ وہی چیز ہے جو انبیاء کا مقصود رہا ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں:

> ''تمام انبیاء کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ ہے، ایک کلمہ پر لوٹ آنا۔ وہ کلمہ اللہ کی معرفت ہے، سارا مقصد اور بات یہی ہے۔ عمل صالح کی دعوت تہذیب و تزکیہ نفس کا حکم، امر بہ معروف وغیرہ سب کا مقصد واحدہ پر لوٹ آنا ہی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ جو انسانوں کی فطرت کا اصلی محور ہے، اس پر سے تمام پردے اور حجاب ہٹادیئے جائیں تاکہ انسان کی محبوب حق تک رسائی ہوسکے اور یہی معرفت حق ہے۔ مقصود اعلیٰ بھی یہی ہے۔'' (صحیفہ نور ج ۱۹، ص ۲۸۳)

یہی وہ مقصد ہے کہ جس سے حضرت امام خمینیؒ نے ایک کامیاب انقلاب کے لیے سیاسی لحاظ سے الہام لیا ہے۔ ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ امام خمینیؒ کے تمام بیانات میں موجود عرفانی جملے، سیاسی پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ امام خمینیؒ نے اس پیغمبرانہ روش پر عمل کر کے ایسے وقت میں جب بیسویں صدی کے اواخر میں پوری انسانیت مادیت پرستی اور آسمانی اقدار کی طرف پشت کرنے کی آگ میں جل رہی تھی، عرفان کی معجزاتی طاقت کا جلوہ دکھایا اور اس طاقت کے ذریعے ایک نئی پر امید دنیا اور عام اخلاقی اقدار اور معروف دینی اصول پر مبنی معاشرے کی تشکیل فرمائی اور حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم اور شاندار ذمہ داری کو نبھانے میں کامیاب ہوئے۔

ہمیں اس بات سے غافل نہیں رہنا چاہیے کہ امام خمینیؒ ان معدودے چند عارفین میں سے ایک ہیں جو عرفان اور معرفت کی سیڑھی سے اوپر جاتے ہیں اور سیر و سلوک کی روح پرور خوشبو کو اپنی روح اور جان میں محسوس کرتے ہیں، تب دوبارہ نیچے آکر، مخلوق کے درمیان واپس لوٹ آتے ہیں اور لوگوں کی زبان میں حقیقت اور حق کی بات کرتے ہیں۔ امام خمینیؒ کا سیاسی عرفان شریعت سے جنم لیتا ہے اور عینیت کی طرف آگے بڑھتا ہے۔ امام خمینیؒ کے افعال و کردار کی عرفانی بنیادیں تیزی سے دینی اور شرعی قالب میں تبدیلی ہوجاتی ہیں اور وہ اخلاقی اور روحانی اقدار کی صورت میں اپنے پیروکاروں کی ارواح اور نظام حیات پر نازل فرماتے ہیں۔

امام خمینیؒ ہمیشہ دعا اور ذکر الٰہی کے ذریعے اپنے حوصلہ بڑھاتے تھے۔ بہت ہی کم مواقع ایسے ہیں کہ امام خمینیؒ نے اپنے لیے کچھ کہا ہو، وہ فانی فی اللہ تھے۔ انھوں نے اپنا وجود اپنے آپ سے خالی کر دیا تھا۔ اسی بنیاد پر اگر آپ ان کے تمام بیانات کا بغور مطالعہ کریں تو ایسی کوئی خواہش، کوئی بات اور کوئی مقصد نہیں ڈھونڈ سکتے جو ان کی ذات کے لیے ہو اور انھوں نے اپنے لیے متعین کیا ہو۔ امام خمینیؒ ہمیشہ انبیاء کے مقصد کو ہی اپنا مقصد قرار دیتے تھے اور جو کچھ انبیاء کا مقصد تھا وہ تمام امور کا الٰہی کرنا تھا۔ تمام جہانوں اور انسانوں کو ایک ہی رب کی حقیقت کی طرف لوٹا دینا تھا۔ انبیاء کی بعثت کا مقصد بھی یہی ہے کہ سب امور کو الٰہی کر دیں۔

امامؒ فرماتے ہیں کہ خدا کی خاطر قیام کریں'' تو یہ وہی اصول ہے جو الہام کا مظہر اور امام خمینیؒ کی سیاسی زندگی کا محرک اور ان کے طرز تفکر کا روشن نمونہ ہے جبکہ تمام چیزیں اسی اصول پر ظہور پذیر ہوئی ہیں اور سب اعمال و اقدامات کا محور یہی اصول قرار پایا ہے۔ یہ اصول امام خمینیؒ کی اعلیٰ عرفانی طاقت سے حاصل کیا گیا ہے۔ جی ہاں! امام خمینیؒ ایک مرشد کامل متعہد، انقلابی سلسلہ عرفانی کے بانی، عظیم مصلح زمان تھے جنھوں نے یہ حقیقت پایہ ثبوت تک پہنچائی کہ حقیقی عرفان کا مقام صرف انسان کے انفرادی افعال نہیں ہیں، چونکہ خداوند متعال ''مطلق وجود'' کا حاکم ہے، لہٰذا اس کی مطلق، حاکمیت انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی اور طاری ہونی چاہیے اور تمام معاشرتی اور اجتماعی تعلقات الٰہی اقدار پر ہی استوار ہونے چاہیے اور اس طرح امام خمینیؒ کی توحید پرستی ان کے انقلابی افکار پر سایہ فگن ہوئی اور بندگی اور سیاست کے مابین سرحدی حدود کو مٹا گئی اور ان کی نظر میں عالم عبودیت اور عالم سیاست اور معاشرتی جہان کے مابین ہر قسم کا فرق مٹ جاتا ہے۔ وہ وجود کو پورے کا پورا خداوند متعال کا مقہور مانتے ہیں اور ایک الٰہی انسان کی ذمہ داری کا تعین یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں پر توحید اور خدا پرستی کو مجسم حالت میں نافذ کرے:

ان کی روح ہمیشہ شاد رہے
ان کا مشن ہمیشہ جاری ہے

حجت الاسلام سید حسن عباس فطرت (پونہ)

امام خمینیؒ اور امت اسلامیہ کی قیادت

عظیم اسلامی انقلاب کے عظیم الشان قائد، جمہوری اسلامی ایران کے بانی، جہانِ اسلام کے پیشوا امام امت حضرت سیّد روح اللہ الموسوی الخمینی قدس سرہ الشریف کی جان سوز و دلگداز وفات حسرت آیات کو سولہ سال ہو چکے ہیں لیکن اس طرۂ دستار اسلام وفرزند زہرا نے اپنی پرشفقت و پرمحن طویل مجاہدانہ قیادت کے آخری دنوں میں ایسے دو اہم اقدام کیے کہ ہمیں لگتا ہے کہ آج ان معنوی وجود کا آفتاب مادّی وجود کے ماہتاب سے بھی زیادہ تابناک ومنور ہوکر عالم اسلام کو متجلی، توانا وہشیار بنائے ہوئے ہے۔ کم وبیش یہی زمانہ تھا جبکہ ہمارے محبوب وفقید امام نے مادّیت کے سب سے بڑے پجاری ومہنت کو ایک زلزلہ افگن تاریخی پیغام بھیجا تھا جس کی جرأت مردانِ الٰہی کے سوا کوئی اور نہ کرسکتا تھا۔ اس پیام میں روسی رہنما کورباچوف کو پیمبرانہ اسلوب میں حیاتِ بشری میں معنویت و روحانیت کی اہمیت بتائی گئی تھی اور بڑے مشفقانہ مگر منطقی انداز میں ان کو اسلام کے مطالعہ کی دعوت دی گئی تھی ساتھ ہی یہ پیشین کوئی بھی کی گئی تھی کہ عنقریب کمیونزم تاریخ کے میوزیم میں محدود ہوکر رہ جائے گا اور اس کا کلیدی سبب عقیدۂ خداپرستی وروحانیت کا فقدان ہے۔ اس عظیم ومنفرد مہم میں تاریخِ اسلام کے طول وعرض میں وہ پیغمبرِ اسلامؐ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے والے تنہا ایک رہبر ملتے ہیں غالباً کل بھی ان کی نظیر نہیں مل سکے گی۔ ابھی اس ندائے دعوت وبشارت کی گونج باقی ہی تھی کہ اس نظیر امت کے لیے آزمائش کی دوسری منزل سامنے آگئی جو اس سے بھی کٹھن تھی۔ اس کے نتائج وعواقب سے بھی حضرت امامؒ آگاہ تھے لیکن جب آپ نے دیکھا کہ سلمان رُشدی کی کفرآمیز کتاب سے مسلمانوں میں بے چینی و انتشار کا طوفان اُٹھ رہا تھا اور اس منحوس کتاب ''شیطانی آیات'' کے

خلاف مسلمانوں نے جان و مال کی بازی لگادی تھی تو آپ سے نہ رہا گیا اور آپ بھی امت کے اس جوش وخروش میں شامل ہوگئے اور اپنے تاریخی فتوے سے صورِ اسرافیل کا کام لیا جس سے دشمنانِ اسلام کا دَم نکل گیا اور مسلمانوں کو حیاتِ نو مل گئی۔ حضرت امامؒ نے کتاب ''شیطانی آیات'' کے دل آزار متن اور مسلمانانِ عالم کے بڑھتے ہوئے ہیجان کو ملاحظہ فرمایا اور سوچ سمجھ کر اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے بڑی جرأت وصلاحیت کے ساتھ حکم دیا:

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

دنیا بھر کے غیرت مند مسلمانوں کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ ''شیطانی آیات'' نامی کتاب جو اسلام، پیغمبر اور قرآن کے خلاف لکھی، چھپی اور شائع کی گئی ہے اس کے مؤلف اور کتاب کے مواد ومضمون سے باخبر ناشر کی سزا موت ہے۔ میں غیرت مند مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ ان افراد کو جہاں کہیں پائیں جلد از جلد موت کے گھاٹ اُتار دیں تا کہ پھر کسی میں، مسلمانوں کے مقدسات کی توہین کرنے کی جرأت پیدا نہ ہو۔ اس (حکم کے نفاذ کی) راہ میں قتل ہونے والے افراد شہید ہیں انشاء اللہ۔ اگر کوئی شخص مؤلف تک رسائی رکھتا ہے، لیکن اسے سزائے موت دینے کی خود اس میں توانائی نہیں ہے تو وہ عوام کو اس کا ٹھکانہ بتائے تا کہ وہ اپنے کیفرکردار تک پہنچ جائے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

روح اللہ الموسوی الخمینی

۸ رجب المرجب ۱۴۰۹ھ

اس فتوے نے ساری دُنیا کے سمندر میں طغیان پیدا کردیا اور مشرق سے مغرب تک ایک سنسنی پھیل گئی اور زخم خوردہ مسلمانوں کے دل کو مرہم مل گیا۔ برطانوی حکومت اور دوسرے غیرمسلم ممالک کے افراد حکومت نے اس فتویٰ پر جو ردِّعمل ظاہر کیا اس کی تو کسی حد تک توقع بھی تھی لیکن مسلم ممالک و اشخاص کی خاموشی اور استہزا نہ صرف قابلِ حیرت بلکہ لائقِ تعزیر و ملامت

بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس فتوے کے بعد دُنیائے اسلام کے غیرت دار مسلمانوں نے حضرت امام خمینیؒ کی رہبریت کو صدقِ دل سے قبول کرلیا اور ان کے بدخواہوں کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ آج بھی امامؒ کا فتویٰ زندہ و برقرار ہے اور رُشدی کے طرفداروں کو کچل رہا ہے۔ مغربی ممالک میں اب ایسے قوانین بن رہے ہیں جس کے تحت پیغمبرِ اسلامؐ کے حضور میں ہر چھوٹی بڑی گستاخی کو جرم قرار دیا جارہا ہے۔

حضرت امام خمینیؒ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دَور کے ان دو واقعات کا ذکر صرف بیانِ واقعہ کے طور پر نہیں کیا گیا بلکہ بتانا یہ ہے کہ ہماری دنیا میں امام امت ہی ایک ایسے منفرد رہبر تھے جن پر ماحول، وقت، زمانہ، تقاضائے عمر، مصلحت، رعایت جیسے عوامل اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ ارمان و حرکت و عمل سے بھرے ہوئے پرشور ایام شباب میں امام فقید نہایت خاموشی اور متانت کے ساتھ حالات کا بغور مشاہدہ کرتے نظر آتے ہیں۔ درس و مطالعہ کے سوا ان کا کوئی قول و عملی کردار بعثت و انقلاب کی راہ میں دکھائی نہیں دیتا۔ آج سے ستر پچھتر سال قبل وہ اپنے اساتذہ کے چہیتے اور قابلِ فخر شاگرد تھے اور ان کی صلاحیت و استعداد کا شہرہ تھا۔ اس کے بعد وہ فلسفہ و اخلاق، سیر و سلوک و عرفان، تفسیر و حدیث و فقہ اور اجتہاد کے درس میں نمایاں و ممتاز حیثیت کے مالک اور اپنے بزرگ علماء کے معتمد اور مشاور تھے۔ ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی مگر عملی اقدام سے وہ خود کو الگ رکھے ہوئے تھے اگرچہ تمام انقلابی علماء اور رہنماؤں سے ان کا ربط تھا لیکن باقاعدہ وہ کسی سے ملحق نہیں ہوئے تھے البتہ اگر اس زمانے کی تحریر، تقریر، درس و تصنیفات کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو لگتا ہے آپ کو آنے والے زمانے میں اپنی مسئولیت و رسالت کا احساس تھا اور جس طرح درخت کے بیج میں پورا درخت چھپا ہوتا ہے اور وہ زیرِ زمین جانے کے مدتوں بعد چھتنار ہوکر پھیلتا ہے اور اسی وقت اس کی تمام خاصیت و کیفیت و منفعت حواسِ خمسہ سے محسوس کی جاتی ہے۔ اسی طرح ساٹھ کی دہائی کے بعد حضرت امام خمینیؒ نے حکومت اسلامیہ، ولایت فقیہ، عدلیہ و انتظامیہ و مقننہ کا جو تفصیلی و منضبط خاکہ پیش کیا اور

انقلاب کی کامیابی کے بعد اسے عملی جامہ پہنا کر دنیائے عرب و شرق کو چکاچوند و حیرت زدہ کر دیا اس کا بنیادی تصور ان کی ابتدائی تصنیفات میں موجود ہے جس میں ایک کتاب ''کشف اسرار'' ہے جو انقلاب سے پچاس سال قبل لکھی گئی۔

''کشف اسرار'' نہایت جامع و پرحکمت کتاب ہے۔ اگرچہ وہ ایک مخالف اسلام، پہلوی حکومت کے پالتو کتے کی بک بک بنام ''اسرار ہزار سالہ'' کے جواب میں لکھی گئی ہے اور اس وقت جبکہ بعض وجوہ سے کوئی اس کارِ اہم کے لیے آگے نہیں بڑھا تو حضرت امامؒ نے مرض چشم کے ہوتے ہوئے اس قلمی جہاد پر کمر کس لی اور اسلامی و جعفری عقائد کو آیاتِ قرآنی، فلاسفہ کے بیانات اور محکم و مسکت دلائل و شواہد کے ساتھ پیش کرتے ہوئے نا ہنجار رضا خان کی حکومت کی اسلام شکن حرکات اور جبر و استبداد و وحشیانہ پن کو بھی بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا۔ عصرِ حاضر کے چند کم نظروں اور فتنہ پروروں نے کتاب مذکور کے بعض اجزاء کو ان کے سیاق و سباق سے جدا کر کے امامؒ کی شخصیت کو داغدار بنانے کی ناکام کوشش کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام خمینیؒ کی بے تاب رُوح اسلام پرستی اور انقلابی افکار کے تانے بانے کو نزدیک سے دیکھنے اور چھونے کے لیے اس مختصر سے رسالے کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔ یہ صرف میرا اپنا ذاتی خیال نہیں بلکہ ''انقلاب اسلامی ایران'' کے پیچ و خم اور اس کے فلسفہ کے ماہر و شناسا پروفیسر حامد الگار کا بھی یہی کہنا ہے۔

انقلاب اسلامی ایران اور اس کے بے مثال قائد حضرت امام خمینیؒ دُنیائے اسلام و مستضعفین عالم کے لیے جس قدر باعث شرف و برکت و سرفرازی ہیں اُتنے ہی مظلوم و مقہور و عبرت و حسرت کا نمونہ ہونے میں بھی وہ آپ اپنا جواب ہیں اور وہ یوں کہ آج کے روشنی یافتہ ترقی پسند آزادیٔ انسان کے دَور میں بھی ذرائع ابلاغ و وسائل، رسل و رسائل کی فراوانی کے باوجود یہ دُنیا نہ انقلاب اسلامی کی کامیابی کے پہلے اس اسلامی تحریک اور انقلاب سے آگاہ تھی اور نہ اس کے طویل و خونچکاں ماضی سے واقف اور نہ اسے اس انقلاب کی محکم و سازش ناپذیر

قیادت کا کوئی ادراک تھا حتیٰ کہ ۱۹۷۸ء میں جب اس تحریک نے خونِ ناحق کی دھاروں سے سرزمین ایران کو سرخ سمندر میں بدل دیا تب بھی غیر تو درکنار اُمت اسلامیہ اور عام مسلمان اس کی پرچھائی سے دُور تھے۔ اگر کچھ جانتے بھی تھے تو وہی جو معدوم شاہ کی ساختہ پرداختہ اخباری مشینری بتاتی تھی یعنی ''اسلامی مارکسسٹوں کی شورش'' یا استعمار سرخ و سیاہ کا گٹھ جوڑ، شرق و غرب کے تمام ذرائع ابلاغ شاہ کے زیردست تھے اور اسلامی دنیا بھی اسی کو سچ مان لینے میں اپنی بھلائی و ادائیگیٔ فرض جانتی تھی حالانکہ حقیقت کچھ اور ہی تھی، لیکن انقلاب کے بعد اس کی کچھ خاص امتیازی خصوصیات سامنے آئیں۔

۱۔ ملت ایران نے پہلی بار خود کے تئیں دُنیائے اسلام کا ایک حصہ ہونے کا اعلان کیا۔

۲۔ قومی بورژوا حکومت اور اس سے وابستہ ہر گروہ کی نفی کی۔

۳۔ اسلامی بنیادوں پر حکومت اسلامی کی تشکیل مصمم ہوئی۔

۴۔ ایران کے تمام گروہوں اور سیاسی و مذہبی جماعتوں کو اس تحریک میں شامل کیا گیا۔

۵۔ بڑی طاقتوں اور ملک کے اندر موجود ان کے عوامل سے ان کا مقابلہ اور ٹکراؤ ہوا۔

۶۔ ہر بات میں عالم اسلام کے مفاد کو سامنے رکھا گیا۔

۷۔ ایسی قیادت و رہبری کی تلاش کرلی گئی جو کسی خاص گروہ یا مخصوص طبقہ کے مفاد کا پاسدار نہ ہو۔

امام امت کی رہبری کی انفرادیت یہ تھی کہ ان کے پاس نہ کوئی اخبار تھا نہ جدید دَور کی تبلیغ کا کوئی وسیلہ۔ گذشتہ کئی صدیوں کے رہبروں کے درمیان اس صنف میں امام خمینیؒ اور اسلامی انقلاب کے دیگر رہنما تنہا نظر آتے ہیں۔ انقلاب فرانس، انقلاب روس و چین، اٹلی، ہند و الجزائر سب کے پاس ضعیف یا ضعیف تر یا قوی ذرائع ابلاغ رہے ہیں حتیٰ کہ انقلاب مشروطہ کے دَور میں بھی ایران کے باہر کئی اخبارات شائع ہوتے تھے۔ کلکتہ (ہندوستان سے شائع ہونے والا اخبار حبل المتین اس کی ایک مثال ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد تو ہر چہار جانب سے معاندانہ پروپیگنڈہ کی برسات شروع ہوگئی اور سب کی کوشش یہی رہی کہ اس انقلاب کی آگ کو بجھا دیا جائے اور اسے منحرف کردیا جائے۔ اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو اسے محدود کر کے مقامی و مسلکی بنا دیا جائے اور اس کے رہبر عظیم کو عام مسلمانوں اور دنیا کی نظروں میں منفور کردیا جائے۔

حضرت امام خمینیؒ کی بے مثال قیادت کا تجزیہ اگر ان ہی کے اقوال و افکار کی روشنی میں کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ان کی بھاری بھرکم قیادت اور عوام کے بے مثل فداکارانہ جذبہ کو دیکھ کر مادّی دُنیا کے پرستاروں کی عقل دنگ اور زبان گنگ رہ گئی۔ مغربی ممالک، امریکہ و اسرائیل میں انقلاب اسلامی اور امام خمینیؒ کی قیادت کئی سال تک بحث و تحقیق و تجزیہ کا موضوع بنی رہی، مگر ابھی تک وہاں کے لال بجھکڑ کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اسی طرح حضرت امامؒ کی زندگی میں ان کے آئندہ اقدام کا اندازہ لگانے میں ماڈرن آلات بھی کند ہوگئے۔ وجہ یہ کہ امام خمینیؒ کی قیادت کی بنیاد ایمان وتقویٰ پر استوار و قائم ہے۔ ولایت فقیہ کا مطلب ہی ہے متقی علماء کی حکومت۔ تقویٰ کیا ہے اور متقی کون ہے۔ مختصر یہ کہ تقویٰ ہر انسانی فضیلت کا سرچشمہ بھی ہے اور سرتاج بھی۔ دنیا میں حبِ جاہ اور ہر دُنیاوی حرص وخوف سے دُوری مگر اللہ سے بے انتہا خوف وخشیت، نالۂ نیم شبی اور آہ صبح گاہی کے کاسہ میں نجات وغفران کی طلب ہی متقی قائدوں کا سرنامہ امتیاز ہے اور یہ قیادت پیغمبروں کا خصوصیت و سیّد النّبیینؐ و امام المتقینؑ کی میراث ہے۔ ان کی قیادت دین کے خطوط پر ہوتی ہے اسی لیے ان کی سیاست اور ان کے دین میں جدائی نہیں ہوتی۔ امام خمینیؒ نے اپنے پیشرو علمائے حق مثلاً سیّد حسن مدرّس کی طرح اسے عمل و کردار سے ثابت کردیا۔ وہ اپنی عمر کے بیشتر حصہ میں صرف پیشوائے دین، مرجع تقلید، روحانی رہنما، حوزہ علمیہ کے معلم اعلیٰ زینت مسند اجتہاد اسلامی کا آغاز بنے۔ یہی تیاری و مشق بھی شہر علم قم اور مدرسہ فیضیہ و حسینیہ و مساجد میں ہوئی۔ عملی سیاست کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد مسلسل دس سال تک امامؒ نے انتہائی پیچیدہ، وحشت ناک اور پرخطر حالات

اور مصائب و ابتلا کے دور یعنی داخلی شورش و بھیانک دہشت گردی و ہولناک جنگ تحمیلی کے زمانے میں اپنی فہم وفراست، قدرت وطاقت ومقبولیت کے سکے دوست و دشمن کے دلوں پر بٹھائے لیکن ساتھ ہی ساتھ مذہبی کاروبار اور تعلیم وتعلم حوزہ علمیہ، مجلس فتویٰ کو بھی بے انتہا فروغ دیا۔ ایران اور ایران سے باہر تبلیغات اسلامی کا جال بچھا دیا جس سے آج حقیقی اسلام کا اُفق وسیع و روشن تر ہورہا ہے اور یہ آواز ہر جانب سے آرہی ہے کہ اسلام ہی انسان کی ہر جائز خواہشات وضروریات کی مکمل خانہ پری کرسکتا ہے۔

پہلے یہ اشارہ کیا جاچکا ہے اور اسے صاف لفظوں میں یہاں کہنا مناسب ہے کہ حضرت امام خمینیؒ کا ہر عمل تکلیف شرعی کے تحت ہوتا تھا۔ چاہے وطن ہو یا جلاوطنی، قیادت ہو یا عوامی و انفرادی حیثیت۔ چنانچہ جب نجف اشرف سے آپ نے اپنا اخراج منظور کیا تو یہی کہا کہ یہ میری تکلیف شرعی کا تقاضہ ہے۔ اسی طرح جنگ تحمیلی کو مردانہ وار جھیلا تو بھی شرعی ذمہ داری جان کر، اسی لیے سخت سے سخت مصیبت کے عالم میں بھی ان کے قدموں میں لرزش نہیں پیدا ہوئی خواہ وہ پردیس میں ان کے جوان وصالح وقوت بازو بیٹے کی اچانک و پراسرار موت ہو یا دل کے ٹکڑوں اور پارۂ تن کی دلخراش شہادت یا بہتر جاں نثاروں کی یکبارگی و اجتماعی شہادت، صبر و استقامت کے ساتھ وہ صرف خود ایسے حالات میں مثل کوہ جمے نہیں رہے بلکہ امت کو حوصلہ وتوانائی بھی بخشتے رہے۔ ہر مصیبت کے مستقبل کو چیر کر ان کی مومن نگاہیں خوشگوار مستقبل کو دیکھ لیتی تھیں اور وہ اسے بشارت بنا کر عوام کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ یہ بات بھی ان کو تمام رہبروں سے ممتاز کرتی ہے۔ عراق کی بعثی حکومت نے جب اچانک تیس ڈویژن کا لشکر اور ٹینک وتوپ خانے کو ہزاروں کلومیٹر ایران کی سرحد کے اندر داخل کردیا تو عام اختشار و بوکھلاہٹ کے ماحول میں امامؒ نے صدا دی کہ یہ ”جنگ نعمت ہے“ یہ جنگ ملک وسرحد کے لئے نہیں بلکہ اسلام کے خلاف ہے اور جمہوری اسلامی کو نابود کرنے اور انقلاب اسلامی کو برباد کرنے کے لیے ہے۔ اس لیے دشمن کا مقابلہ ملت کے ایک ایک فرد پر واجب ہے۔ اس

صدائے غیبی کا بلند ہونا تھا کہ ساری امت اسی طرح میدان جہاد میں کود پڑی جیسے انقلاب کی کامیابی کے لیے اور اسلامی حکومت کی تشکیل کے لیے میدان میں اُتری تھی اور چند ہفتوں کے اندر عالمی امپریلزم کے خواب تار تار ہو گئے تھے اور جنگ کا پانسہ پلٹ گیا تھا۔

عام رہبروں اور قائدوں کے یہاں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ وہ لوگ دورانِ انقلاب اور تحریک آزادی کے شباب کے دور میں پرجوش تقریر، اشتعال انگیز تحریروں کا استعمال کرتے ہیں۔ خفیہ ریڈیو اسٹیشن، پمفلٹ و اخبار سے کام لیتے ہیں لیکن امام خمینیؒ نہایت سکون کے ساتھ اپنا کام کرتے ہیں اور پندرہ سال کی جلاوطنی میں امت کو اس قدر جوش و جذبۂ ایمان سے بھر دیتے ہیں کہ ان کو تاریخ اپنا سرمایۂ افتخار بنا لیتی ہے۔ کوئی یقین کرے یا نہ کرے امام خمینیؒ نے ۱۹۷۸ء تک نجف اشرف میں رہ کر کسی اخبار کی بات نہیں سنی، صرف مشہور فرانسیسی اخبار ''لی مونڈ'' کا نمائندہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور اس نے امام کا پہلا انٹرویو اپنے اخبار میں شائع کیا۔ کیونکہ امام خمینیؒ اخبارات کے غلط رویہ سے ہمیشہ نالاں رہے اور ان کی بات بالکل سچ تھی۔ اس انٹرویو میں امامؒ نے سب کچھ کہہ دیا ہے اور انقلابی حکومت کے خدوخال بھی واضح کر دیئے ہیں اور آپ نے جو کچھ کہا اس میں تاحیات یعنی انقلاب کے بعد بھی سرمو فرق نہیں آیا۔ اب لازم ہے کہ میں یہاں پر انقلاب اسلامی اور اس کی قیادت کی اس انفرادیت کا ذکر کروں جو سورج کی طرح روشن ہے اور اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ حضرت امامؒ نے تبلیغات اور اپنے پیغام کی اشاعت صرف اپنے ملک و ملت کے لوگوں کو سونپی اور یہ سلسلہ نجف سے پیرس تک جاری رہا۔ امامؒ کے فرمودات کو ٹیپ کر لیا جاتا تھا پھر ٹیلی فون کے ذریعہ اسے ایران پہنچا دیا جاتا جس کے بعد ہزاروں لاکھوں کیسٹ ملک کے چپہ چپہ میں پھیل جاتے تھے اور یہ طریقہ انتہائی مؤثر و کامیاب رہا اور بے مثال بھی۔

ہر انقلاب کے لیے ابتدا سے ایک گروہ مصیبت بن جاتا ہے اور اس سے نمٹنا دشمنوں سے لوہا لینے سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے زمانے کے منافقین سے لے کر آج کے

درباری علماء کا ایک مربوط سلسلہ ہے۔ دوسری اصطلاح میں انقلاب اصلی اور انقلاب نقلی کے گروہ کا تصادم نہایت خطرناک ہوتا ہے اور کبھی کبھی انقلاب اصلی کی شکست بھی ہوجاتی ہے جیسے کہ انقلاب مشروطہ ایران ۱۹۰۶ء اور ہندوستان میں جے پرکاش نرائن کے انقلاب ۱۹۷۷ء کا انجام ہوا۔ چین میں ان دونوں گروہوں میں تیس سال تک خونریزی ہوتی رہی۔ لینن کے بعد انقلاب روس اسٹالین ایسے بدخو اور سفاک انسان کے ہاتھ میں آیا جس نے لاکھوں آدمیوں کو مولی گاجر کی طرح اُڑا دیا لیکن یہ حضرت امام خمینیؒ کی رہبری و قیادت کا کمال اور انفرادیت تھی کہ جنگ تحمیلی کے دور میں منافقین اور انقلاب دروغین سے وابستہ کے مختلف گروہوں کو آہستہ آہستہ اس طرح ختم کردیا گیا کہ آج ان کے نام لیوا بھی نہیں رہ گئے۔

امام خمینیؒ کی سادگی مشہور ہے اور اس میں کسی وقت بھی تبدیلی نہیں آئی۔ بعض لوگ اس کے مقابلے میں چند دیگر رہبروں کی مثال بھی پیش کرتے ہیں جس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مگر امامؒ کی سادگی کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں صرف غذا ولباس و مکان ہی کی سادگی نہیں بلکہ گفتگو، تحریر، فکر ونظر، طرز و ادا ہر شئے میں سادگی تھی اور اس کی وہ دوسروں کو تلقین بھی کیا کرتے تھے۔ مثلاً جب آپ پندرہ سال کی جلاوطنی کے بعد کروڑوں افراد کے استقبال کے ساتھ تہران آئے تو پہلی منزل قبرستان بہشت زہرا قرار دی۔ وہ خود کو نہ عالم کہلانا پسند کرتے تھے نہ رہبر۔ وہ پاسداروں کے ہاتھ چومتے تھے، وہ شہادت کی آرزو کرتے تھے اور برادر کہا جانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان کو یہ بھی اچھا نہیں لگتا تھا کہ ان کی تصویریں بکثرت شائع ہوں۔ وہ بے انتہا پابند وقت اور تہجد گزار تھے اور دوسروں کو اس کی نصیحت کرتے تھے۔ اتنی مصروفیت اور بلند مقام پانے کے بعد بھی عام لوگوں کا کام کرنے میں ان کو کوئی انکار نہ تھا۔ نکاح خوانی، استخارہ، دستار بندی، قرآن خوانی، قرآن و دینیات کی تعلیم ایسے کام بھی مرحوم امامؒ نے اپنی عظیم رہبری کے پرآشوب دور میں کمال انبساط و آمادگی سے انجام دیئے ہیں حتیٰ کہ اپنی چھوٹی بہو کے اصرار پر امامؒ نے بہت سی عرفانی غزلیں بھی کہی ہیں جو اگرچہ علم ومعرفت کا

ایک سمندر ہیں لیکن میرے خیال میں یہ بھی ایک رہبر قوم کے لیے انسان دوستی و دلداری کا ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعری فکروغور ونظم کے لیے وقت ومحنت چاہتی ہے اور ایسا رہبر جس کی زندگی کا ہر لمحہ تاریخ کی ایک صدی پر بھاری ہو وہ اپنا قیمتی وقت محض اپنے عیال کا دل رکھنے پر صرف کردے بہت بڑی بات اور سبق آموز واقعہ ہے۔ امام مرحومؒ کی انفرادی سادگی یہ بھی تھی کہ وہ دوسروں سے بھی سادگی چاہتے تھے، زندگی میں بھی اور تقریر وتحریر میں بھی۔ ان کی عبارت بہت آسان وسادہ ہوتی تھی، ہر تصنع وجذبات سے عاری۔

یہ سوال اکثر اُٹھتا رہا ہے اور اس پر دنیا کے مختلف الخیال افراد نے اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ امام خمینیؒ کی کامیابی کا راز کیا تھا لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس کامیاب قیادت اور ایسی پرجوش وفداکار امت کو امام خمینیؒ نے اپنی روحانیت ومعنویت اور شب و روز کی تربیت و محنت سے تیار کیا تھا۔ انھوں نے جو کچھ کیا، کہا، دکھایا، سنایا سب کچھ کھلی کتاب کی طرح تھا اور اسلام اصلی کا پرتو۔ انھوں نے ابتدائے زندگی سے آخر تک اس پر حرف بحرف عمل کیا اور بیس تیس سال کی تعلیم وتربیت کی مشقت اُٹھا کر سینکڑوں باعمل و اخلاص وسیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند ہم خیال لوگوں کی جماعت بکھیر دی۔ تعلیم، تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق کی بات تھی، تو امامؒ اس امر پر بہت رنجیدہ رہتے کہ آجکل تعلیم یافتہ افراد میں تہذیب و اخلاق سے آشنائی ختم ہوچکی ہے اور دنیا میں فساد وفحش و بداخلاقی اسی وجہ سے بڑھ رہی ہے۔ وہ ایک واحد قائد تھے جو کہتے تھے اور انھوں نے بار بار کہا کہ انقلاب اور اس کی برکتوں میں میرا کوئی ہاتھ نہیں، نہ میرا قیام ایران کی حکومت کو بدلنے کے لیے تھا بلکہ یہ خدائی کارنامہ ہے۔ ہمارا قیام صرف اسلام کے لیے تھا۔ وہ اسلام جو خالص محمدیؐ اسلام ہے نہ کہ اسلام امریکائی و انقلطی۔ اتنا ہی نہیں وہ یہ بھی کہتے تھے کہ انقلاب کسی ایک فرد کا رہین منت نہیں ہے البتہ جب تک میں ہوں عوام کی اس امانت اسلام کو مٹنے نہ دوں گا کیونکہ اسلام غریب و بے سہارا عوام کی امانت ہے اور یہی ہوا۔ انحراف پسندوں کی ہر سعی بے کار گئی اور عوام نے انھیں رسوا کر کے ان سے بیزاری کا اظہار کیا۔

جنگ تحمیلی حضرت امام خمینیؒ کی عظیم آزمائش اور خدا کی طرف سے ان کا سخت و آخری امتحان تھا جس میں وہ صد درصد کامیاب ہوئے۔ انھوں نے آٹھ سال تک نہ صرف عراق کی درندگی کا منہ توڑ جواب دیا بلکہ ساری دنیا خصوصاً امریکہ سے مقابلہ کیا اور کسی منزل پر گھٹنے نہیں ٹیکے۔ امت کے ہر فرد میں جذبۂ شہادت و دفاع کو بھر دینا اور شمع اسلام و وطن پر پروانہ وار جان نثار کرنے پر آمادہ کر دینا تمام دنیا کو انگشت بدنداں کر گیا۔ امامؒ نے صحیح معنوں میں جہادِ حسینی کا نمونہ دُنیا کی نظروں کے سامنے پیش کر دیا اور ''کل ارض کربلا و کل یوم عاشورا'' رجز کو سب کے دل و دماغ میں اُتار دیا۔ اس جنگ کے دوران بھی امام خمینیؒ کی قیادت بے مثل رہی کہ ایک ہی وقت میں وہ فوج کے اعلیٰ کمانڈر تھے تو دوسری طرف عوام کے دل و دماغ کی ڈور بھی ان ہی کے ہاتھوں میں تھی اور صحیح بات یہ ہے کہ اگر وہ زہر کا پیالہ نہ پیتے اور جنگ کو مجبوراً نہ بند کرتے تو قوم کا بچہ بچہ ان کی رضا کے لیے جان سے گزر جاتا۔ بیس برس تک جنگ جاری رکھنے کا جو نعرہ انھوں نے دیا اسے بھی عوام نے بہ سر و چشم قبول کیا اور جب جنگ بندی قبول کر لیا تو بھی سب نے سمعاً و طاعۃً کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔ یاد رکھنا چاہیے ایسے سخت و پیچیدہ حالات میں عوام اور فوج دونوں پر کنٹرول بہت مشکل امر ہوتا ہے اور اگر ایران میں امام خمینیؒ جیسا عظیم رہبر نہ ہوتا تو ملک میں انتشار و خانہ جنگی کے پھیل جانے کا سراسر خطرہ موجود تھا۔

ایک انفرادیت حضرت امامؒ کی عالمی قیادت کی یہ بھی ہے کہ اوّل و آخر، جنگ و صلح، کوشش و کامیابی ہر مرحلے پر اپنا ناطہ صرف عوام سے قائم رکھا اور ملک کے اندر و باہر کے کمزور و کچلے ہوئے عوام اور علماء ان کے مخاطب رہے۔ انھوں نے کسی بڑے سیاست داں سے نہ رابطہ رکھا نہ کسی ملک کے سربراہ کی طرف آنکھ اُٹھا کے دیکھا نہ خود کسی متکبر حکمراں سے ملے نہ اس کے پاس گئے اور یہیں پر امام خمینیؒ و سیّد جمال الدین اسدآبادی کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ اوّل الذکر نے عوام کے نچلے طبقہ کو نظر میں رکھا اور ان کی تربیت کر کے ان سے کام لیا اور موخر الذکر کا تعلق خواص کے طبقے یا فرمانروایانِ مملکت و رہبرانِ سیاسی و دینی سے تھا۔ امام خمینیؒ

نے اگر سربراہانِ مملکت کو خطاب بھی کیا تو برائے نصیحت۔ وہ فرمانرواؤں سے کہتے تھے کہ اپنے عوام کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لو، ان کا حق دو۔ اسلام کی ترازو پر اپنے اعمال کو تولو، ان کی آزادی کو سلب نہ کرو اور عوام سے یہ کہتے تھے تم اپنی طاقت کو جانو، اپنی شناخت کے لیے قیام کرو اور اپنا حق لینے کے لیے برائے خدا اُٹھ کھڑے ہو۔ علماء سے کہتے تھے کہ وسائل و امکانات نتیجہ وثمر کی پروا کیے بغیر عمل کے میدان میں پیغمبرؐ کی طرح آجاؤ۔ ہمت کرو تو خدا بھی مدد کرے گا۔ اسلام کی فریاد کو پہنچو، قرآن کی فریاد سنو۔ یہی آواز ۱۵ خرداد ۱۳۴۲ ھ ش کو امامؒ نے مدرسہ فیضیہ سے لگائی تھی اور شاہ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ تو اسلام وقرآن سے دشمنی ختم کردے، اسرائیل و امریکہ کی دوستی سے توبہ کر۔ ہمیں تیرا تخت و تاج نہیں چاہیے بلکہ صرف اسلام وقرآن کی عزت وحرمت کو واپس لانا منظور ہے۔

اسرائیل سے معدوم شاہ کی بے انتہا وابستگی امام خمینیؒ کے لیے شروع سے سوہانِ روح بنی رہی ہے اور وہی از ابتدا تا ایں دم واحد مسلم قائد ہیں جنھوں نے اسرائیل کو امریکہ کی ناجائز اولاد کہا اور اس کو تسلیم کرنے کی ہر قیمت پر مخالفت کی بلکہ اقوامِ متحدہ سے اس کی ممبری کو ختم کرنے کے لیے پوری جدوجہد کی لیکن عرب ممالک کی دورخی پالیسی سے وہ اس نیک مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے اور امریکہ اپنی چال چل گیا۔ آج اسرائیل کو تسلیم کرنے کی باتیں اکثر عرب ممالک بے شرمی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ امام خمینیؒ اس مسئلے پر روس سے بھی ناراض تھے کیونکہ اسرائیل کی غیر قانونی حکومت کو تسلیم کرنے والوں میں وہ دوسرا بڑا ملک تھا۔ امریکہ و اسرائیل کے خلاف اگر امام خمینیؒ اپنی تبلیغ بند کردیتے تو شاہ معدوم سے ان کا اتنا شدید اختلاف ہرگز نہ ہوتا۔

اس بات کا ذکر ہم نے اس لیے کیا ہے تاکہ یہ بتایا جاسکے کہ امام خمینیؒ اقتدار پانے سے پہلے ہی عالم اسلام کے ساتھ فلسطینیوں کے ہمدرد و مددگار اور اسرائیل سے نفرت کرتے تھے۔ اخوان المسلمین کو بھی حضرت امامؒ اور ان کے پیروؤں کی حمایت حاصل تھی۔ فلسطین کانفرنس میں وہ اپنے نمائندوں کو خاموشی کے ساتھ بھیجتے تھے۔ قاہرہ میں دارالتقریب المذاہب

اسلامی کی بنیاد و تصور میں وہ آیت اللہ بروجردی کے ساتھ تھے بلکہ اتحاد اسلامی کے مسئلہ میں وہ اپنے پیشرو سیّد جمال الدین اسد آبادی سے زیادہ شدت پسند تھے اور وہ وحدت کلمہ کو توحید کے ہم پلہ گردانتے تھے لیکن اس اتحاد کی بنیاد ملیت یا کسی اور چیز پر نہیں بلکہ اسلام پر تھی۔ یہ ان کا فیصلہ تھا جسے انھوں نے تحقق بخشا اور ان کی زندگی میں ان کو کامیابی ہوئی اور ''لاشرقیہ لاغربیہ اسلامیہ اسلامیہ'' کے ساتھ ساتھ ''لاشیعیہ لاسنیہ اسلامیہ اسلامیہ'' کی صدائیں تمام عالم اسلام کے گوشے گوشے میں گونج گئیں۔ یہ بھی نوٹ کرنے کی بات ہے کہ امام خمینیؒ کی صدائے اتحاد ہر حلقہ اور ہر مرحلہ کے لیے اور ہمیشہ کے لیے تھی وقتی نہیں۔ ملک و ملت کا اتحاد، شیعہ سنی کا اتحاد، مستضعفین عالم کا اتحاد، حوزہ و دانش گاہ کا اتحاد، حکومت و عوام کا اتحاد، علماء اور امت اور خود روحانیوں کے اتحاد کا مطالبہ ملت اسلامیہ میں صرف امام خمینیؒ کی دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اسلامی و غیر اسلامی ملکوں میں اب اسلامی گروہ ایک قوی سیاسی عنصر بن کر ابھر رہا ہے اور سیکولرزم و نیشنلزم و میٹریلزم کی دیواروں کو سیان لگ گئی ہے اور نائیجیریا، اردن، مصر، الجیریا، انڈونیشیا، تیونس اور کئی ملکوں میں اسلامی جماعتوں کی کامیابی کے دروازے بالکل پاٹوں پاٹ کھل گئے ہیں اور عالمی سیاسی تسلط پر اسلام ایک قدرت مند آئیڈیالوجی کے طور پر جلوہ افگن ہو رہا ہے۔ اسلام کے نظام کو تسلیم کیا جانے لگا ہے اور ہر طرف حکومت اسلامی کا شور ہے لیکن امامؒ نے اسلام کا بھی تصفیہ و تنقیہ کیا ہے اور اسلام اصلی، اسلام حقیقی یا اسلام خالص و ناب محمدیؐ کو اسلام امریکائی و مارکسیسٹی سے الگ کیا ہے۔ علماء و روحانیت کو اسلام کا محافظ و اجر اکنندہ بتاتے ہوئے ان کے احترام و رعایت کی نصیحت کے بعد بھی درباری علماء کو اسلام کے جسم کا ناسور اور متحجرین و جمود پسند علماء کو بدگوشت کہا ہے اور اس تفریق کے بعد سنی و شیعہ کی تقسیم دم توڑ دیتی ہے اس لیے کہ دونوں فرقوں میں درباری علماء کل اور آج دونوں زمانے میں رہے اور انھوں نے دشمنانِ اسلام سے زیادہ روحانی لباس کی آڑ میں اسلام کو دانستہ ضرر پہنچایا ہے۔

امام خمینیؒ کے منفرد نظریۂ قیادت و اسلوبِ رہبری کا راز جاننے کے لیے مستکبرین و مستضعفین کی بازیافت پر بھی خصوصی توجہ دینا ضروری ہے جو قرآن مجید کی صدہا سال قدیم اصطلاحیں ہیں۔ امام خمینیؒ نے اپنی عملی سیاست کی بنیاد ان ہی دو زمینوں پر رکھی اور ساری دُنیا کو استکبار و استضعاف میں بانٹ کر مستضعفین کو سینے سے لگایا اور ان کی وکالت فرمائی اور استکبار کے تمام کنبے قبیلے حوالی موالی کو ٹھوکریں لگاتے رہے۔ نتیجتاً جتنا عالم استکبار ان کے خون کا پیاسا ہوتا گیا مستضعفین کا سیلِ رواں امامؒ کے حریمِ سیاست کی طلایہ گردی کرنے لگا جس کی ایک مثال نمیبیا کے سیاہ فام رہنما سام نجوما کی ہے۔ ۲۷ سال کی جلاوطنی کے بعد جب ان کو وطن جانے کا مژدہ و موقع ملا تو پہلے وہ تہران میں امام خمینیؒ کے مزار پر پہنچے اور کہا امام کے مرقد کی زیارت سے مجھے عجیب تازہ قوت ملی ہے۔

مستضعفین و مستکبرین اور ان کے گرگوں اور آلہ کاروں پر امامؒ کی نظر و توجہ برابر رہی اور اسی نظریہ کی کامیابی نے ایران کے کمیونسٹوں اور سوشلزم نوازوں کی فکری جڑیں کھوکھلی کر کے رکھ دیں اور حضرت امام رضوان اللہ علیہ کی رحلت کے چند ماہ بعد ہی نصف کرۂ ارض میں استکبارِ شرق کو مرگِ ناگہانی نے آگھیرا اور بقیہ نصف دنیا بھی اسی روش پر چل پڑی ہے۔

آخر میں امام خمینیؒ کی رہبری کی ایک معرکہ آرا صفت کا بیان بھی ضروری ہے جو ان کی ذات ہی کی طرح کمیاب یا نایاب ہے اور وہ ہے اقتدار کے مرکز ہی نہیں بلکہ دائرے سے بھی اپنی اولاد امجاد، اعزہ و اقارب و احباب کو الگ رکھنا۔ وہ خود کو خادمِ قوم کہتے تھے اسی طرح سے اپنے متعلقین سے بھی غیر سرکاری خدمتِ اسلام چاہتے تھے۔ ان کے برادرِ بزرگ، فرزندِ رشید اور بے شمار قریبی عزیزوں کی زندگی اس کی گواہ ہے۔ انھوں نے اوّل روز سے یہ طے کرلیا تھا کہ حکومت سے ان کے اپنے خاندان کا کوئی شخص فائدہ نہیں اُٹھائے گا۔ اس اصول پر حضرت امامؒ سختی سے قائم رہے اور کوئی دباؤ انھیں اس راہ سے ہٹا نہیں سکا۔

حضرت امام خمینیؒ کی ہستی اعلیٰ خصائل و بے نظیر کردار کے لحاظ سے ایک بحرِ ذخار و

دریائے ناپیدا کنار ہے۔ ان پر ابھی تک میری اطلاع کے مطابق چھوٹی بڑی سو سے زائد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اس سے زیادہ لکھی جا رہی ہیں۔ یہ کیوں صرف اس لیے کہ ''اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ'' کی آیت ان کا سرنامۂ زندگی تھی۔ خدا کے سوا ان کو کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ نہ کوئی نظروں میں سماتا تھا۔ ہم سب سے ان کا یہی تقاضا تھا کہ جو کرو خدا کے لیے، جو سوچو خدا کے لیے ''اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ'' کا وہ جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ وہ ہر تاریخی و عظیم دن کو خصوصاً ۱۵ر خرداد و ۲۲ر بہمن کو ''یوم اللہ'' کہتے تھے، اس لیے ان کے قول کے مطابق ان کی ولادت و وفات کا دن بھی یوم اللہ ہے لیکن خود ان کو ہم کیا کہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ ''مرد اسلام'' تھے یا ''مرد قرآن''، ''مرد سال'' یا ''مرد قرن''، مرد تاریخ''، ''مرد ایران'' یا ''مرد خدا''۔ بیشک ''مرد خدا'' ہی ان کے لیے موزوں و مناسب ہے کیونکہ ان کی نظر میں یا تو خدا تھا یا پھر اس کے نیک بندے مظلوم و لاچار عوام۔

آخر میں برسبیل تذکرہ یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جس طرح حضرت امام خمینیؒ کے جملہ معتقدات و احساسات ابتدائے زندگانی سے آخر دم تک یکساں تھے اسی طرح خانۂ خدا، حج، اہمیتِ کعبہ اور اس عظیم اجتماعِ مسلمین کے تعلق سے امامؒ کے خیالات میں اقتدار و رہبری کے قبل و بعد کے دور میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور آپ رُبع صدی پہلے نجف اشرف کی جلاوطنی کے زمانے میں وہی وظیفۂ شرعی ادا کر رہے تھے جو اقتدار کے بعد آپ نے کیا یعنی حج کے اجتماع سے استفادہ اور عامۂ مسلمین کی خیر خواہی، عراق میں اگرچہ آپ نوجی و بعثی حکومت کی سخت نگرانی میں تھے لیکن جیسے ہی حج کا زمانہ قریب آتا آپ لاکھوں کی تعداد میں اپنا الٰہی و سیاسی پیغام چھپوا کر مخفیانہ طور پر سعودی مملکت میں پہنچاتے تھے۔ امامؒ کے فدائی ہر خطرہ مول لے کر اسے حاجیوں میں تقسیم کرتے تھے اور اتحاد اسلامی کی تحریک کو اندر اندر بڑھاوا ملتا رہتا تھا۔ اس پیغام میں یہی برائت عن المشرکین و وحدت مسلمین کی دعوت ہوتی تھی اور حاجیوں کو بتایا جاتا

تھا کہ حج صرف ایک رسمی اور چند مناسک کی ادائیگی کا کام نہیں بلکہ جہانِ اسلام کے مفاد و مصالح پر غور وفکر کرنے اور ان کی مشکلات کا حل ڈھونڈھنے کا محل و مقام ہے اور ہر حاجی کی تکلیف شرعی یہ ہے کہ وہ اس عظیم اجتماعِ اسلامی میں اپنا فریضہ ادا کرے، اپنا حال دوسروں کو سنائے اور دوسروں کی زبانی ان کی سماجی، معاشی، سیاسی صورتِ حال کو معلوم کر کے فکرمند ہو۔ انقلاب کے بعد اس رہبرِ اعظم نے اپنے وظیفہ ادا کرتے ہوئے اعلیٰ پیمانے پر حج کے عبادی و سیاسی پہلوؤں کو روشن کیا اور مختلف آزار و رکاوٹوں کے باوجود مسلمان امت اس پر عامل رہی۔ مکہ و مدینہ کی زمین اور آسمان وحدتِ کلمہ اور کفرشکن نعروں سے گونجتے رہے یہاں تک کہ امریکہ و اسرائیل کیلئے یہ آوازیں قاتل بننے لگیں اور انھوں نے حکومت سعودی کو مجبور کیا کہ وہ جبر وستم، ظلم و شقاوت، ہیکڑی اور فریب کے زور پر اس عظیم مشن کو اس انوکھی درس گاہ کو بند کردے اور مکہ کی مقدس زمین حرمِ امن الٰہی کو بے گناہ مسلمانوں کے خون سے رنگین کر کے ایرانی زائرین، ایرانی حکام اور رہبرِ انقلاب اسلامی کی تصویر کو عام نگاہوں میں خراب کردے لیکن امامؒ کی رحلت سے چند ماہ پہلے ہی ان کا طلسم ٹوٹ گیا۔ مسلمانانِ عالم کو دوست دشمن کی پہچان ہوگئی۔ اصل ونقل کا فرق واضح ہوگیا اور آج دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوکر اصل حقیقت سامنے آگئی ہے کہ نام نہاد پاسبانِ حرم کو حرم ومقدساتِ اسلامی سے کتنی دلچسپی ہے اور انشاء اللہ دن بہ دن تاریکی کے بادل چھٹتے جائیں گے اور جلد ہی پھر ساری دنیا کے مسلمان حج کے ایام خدائی میں مثل سابق مشرکین سے برأت اور اتحادِ اسلامی کی دعوت کا ملی فریضہ انجام دینے میں آزاد ہوں گے۔ اس وقت اس رہبرِ اعظم کی یاد ہر دل میں ہوگی اور لب پر اس کے لیے دعائے خیر ''وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔'' خلاصہ یہ کہ ان کی حیات بھی اسلام و امت کے لیے نعمت تھی اور ان کی وفات بھی۔ ان کا کام، ان کا امتحان پورا ہوا، وہ کامیاب ہوئے اور اللہ نے ان کو اپنے پاس بلا لیا۔

❁❁❁

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

امام خمینیؒ اور ایران میں اسلامی جمہوریہ کا قیام

تاریخی جائزہ

۴ر جون امام خمینیؒ کی برسی کی تاریخ ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ ایک مختصر مضمون ان کے مندرجہ بالا کارنامے پر لکھ دوں اس لیے کہ ایسی ہستیوں کے کارناموں کو دہرانا، نئی نسل کی تعلیم کا ایک ذریعہ ہے۔

اسلامی جمہوریہ کا قیام مدینہ میں ۶۲۲ء میں عمل میں آیا۔ یہ وہ نظام حکومت ہے جس کو رسول اللہؐ نے دیا اور جس کا دنیا کے کسی کونے میں وجود نہ تھا بلکہ ہر جگہ مطلق العنانیت تھی۔ ظلم و جور اور استبداد کا دوردورہ تھا۔ اسلامی جمہوریہ کی بنیاد عدل و انصاف، سماجی مساوات اور تقویٰ پر تھی۔ مدینہ میں مسلمان، عیسائی، یہودی اور مورتی پوجا کرنے والے تھے اور یہ سب اسلامی جمہوریہ کے شہری تھے۔ ان کو اپنے اپنے مذہبی عقائد پر عمل کرنے کی آزادی تھی۔ غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی جمہوریہ کی تھی۔ رسول اللہؐ کی ۶۳۲ء میں رحلت کے بعد خلافت رسول اللہؐ وجود میں آئی جو رسول اللہؐ کی قائم کردہ بنیادوں پر ۶۶۱ء تک چل سکی۔ ۶۶۱ء میں اسلامی جمہوری نظام ختم ہوا اور اس کی جگہ ملوکیت نے لی۔ امیر معاویہ نے اسلامی جمہوری نظام کے قاعدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین بنایا۔ یزید کے نام نہاد خلیفہ بننے کے بعد اسلامی جمہوری نظام کا شیرازہ تباہ و برباد ہوگیا۔ ۶۸۰ء میں واقعہ کربلا اسی نظام کے خلاف پہلا احتجاج تھا۔ نہ صرف یہ نظام سیاست تک محدود رہا اور نہ رہ ہی سکتا تھا اس نظام نے علماء و دانشوروں کی فکر کو بھی متاثر کیا۔ اگر ہم

اس دور میں لکھی گئی کتابوں کے عنوانات کا مطالعہ کریں تو وہ بھی ملوکیت کی طرف ہوئے رجحان کی بات کر رہے ہیں۔ مثلاً نصیحت الملوک، ذخیرۃ الملوک، آداب السلاطین، مآثر السلاطین وغیرہ وغیرہ۔ ملوکیت علماء کی ایک بڑی تعداد کی سمجھ وفکر کا حصہ ہوگئی۔ ہندوستان میں مولانا ضیاء الدین جو چودھویں صدی عیسوی کے مورخ اور سیاسی مفکر گذرے ہیں اپنی کتاب ''فتاویٰ جہانداری'' میں لکھتے ہیں کہ: ''اب سیاست میں اسلامی قوانین کی پابندی ناممکن ہے۔ اس لیے کہ بغیر ایرانی سیاست کے حکومت کا قائم و جاری رکھنا ناممکنات سے ہے۔'' اس رائے میں وہ تنہا نہیں ہیں بلکہ علماء کی ایک بڑی تعداد بھی اسی رائے کی حامی ہے۔ جہاں تصوف کی ابتداء کی دوسری وجوہات ہیں انھیں میں ایک اہم وجہ مسلمانوں میں ملوکیت کا قیام ہے۔ انھوں نے پوری کوشش کی کہ وہ اس غیر اسلامی نظام کا حصہ نہ بنیں اور جہاں تک ممکن ہو اس سے دوری رکھیں۔ ان مسلم سلاطین نے ملوکیت کے اثر میں اسلام کے بنیادی قوانین کو توڑنا شروع کیا۔ غیر مسلمانوں سے جزیہ وصول کیا گیا۔ مسلمانوں میں تفریق پیدا کی کہ یہ عرب مسلمان ہیں، یہ غیر عرب، یہ موالی ہیں۔ غیر عرب مسلمانوں کو عرب مسلمانوں کی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت نہ تھی اور نہ ہی وہ آپس میں نکاح کرسکتے تھے۔ عربوں نے تو ایرانیوں کو عجمی کہا ہی۔ علماء نے بھی اپنی کتابوں میں ان کو عجمی ہی لکھا۔ بعض کتابوں کے تو ٹائٹل ہی یہی ہیں یعنی ''شعرالعجم'' وغیرہ وغیرہ۔ جب میر سیّد علی ہمدانی ۱۳۷۴ عیسوی میں سری نگر آئے تو کشمیر کے سلطان قطب الدین نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب میر سیّد علی ہمدانی نے سلطان قطب الدین کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کیں تو ان کو پتہ چلا کہ اس نے دو سگی بہنوں سے نکاح کر رکھا ہے لہٰذا انھوں نے ملاقات کی یہ شرط رکھی کہ پہلے وہ ایک بہن سے علیحدگی اختیار کرلے تب ملاقات ہوسکے گی۔ سلطان نے اس پر عمل کیا۔ کیا سلطان قطب الدین کے عہد میں کشمیر میں کوئی عالم نہ تھا جو سلطان کی اس غیر شرعی حرکت پر تنبیہ کرتا؟ ہندوستان میں سنّی و شیعہ علماء نے اسلامی جمہوری نظام کو اپنی کتابوں اور مقالات کا موضوع نہیں بنایا۔ بہت بعد

میں مولانا ابو اعلیٰ مودودی نے ایک کتاب ''خلافت و ملوکیت'' اُردو زبان میں لکھی جسے میں ان کا اہم کارنامہ سمجھتا ہوں کہ انھوں نے مسلمانوں کی سمجھ و فکر میں ملوکیت اور خلافت کو واضح کیا۔ حد تو یہ ہے کہ ہندوستان کی کچھ مرکزی و علاقائی یونیورسٹیوں مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد اور کشمیر یونیورسٹی میں شیعہ اسلامک اسٹیڈیز ہیں۔ ان شعبہ جات کے زیادہ تر سلیبس میں خلافت بنی اُمیہ اور خلافت بنی عباسیہ ہی لکھا ہے۔ خلافت تو ۶۳۲ء سے ۶۶۱ء تک رہی اور حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد خلافت کا خاتمہ ہوگیا۔ بنی اُمیہ اور بنی عباسیہ کو علماء و دانشوروں نے ملوکیت سے نکالنے کی ایک ترکیب یہ کی کہ ۶۳۲ء تا ۶۶۱ء کے دور کو خلافت راشدہ کہا اور ۶۶۱ء تا ۱۲۵۸ء تک کے دور کو خلافت کہا تا کہ بنی اُمیہ و بنی عباسیہ کو تاریخ اسلام میں اہمیت حاصل ہوجائے اور انھیں ملوک کے زمرہ سے باہر نکال دیا گیا۔ بقول مولانا مودودی ۶۶۱ء تا ۱۲۵۸ء کا دور ملوکیت ہی کا ہے۔ اس طرح جدید دور میں ہمارے دانشور یونیورسٹی کے طلباء میں ایک غلط سمجھ پیدا کر رہے ہیں جبکہ اسلامک اسٹڈیز کے یہ سلیبس، بورڈ آف اسٹڈیز سے پاس ہوتے ہیں جس میں اسلامک اسٹڈیز کے دو ایکسپرٹ بھی ہوتے ہیں شعبہ کے دوسرے ممبران کے علاوہ۔

۶۶۱ء میں اسلامی جمہوریہ سے ملوکیت میں تبدیلی کا اثر تمام مسلمانوں نے قبول کیا اور عجیب بات ہے کہ رسول اللہؐ کا قائم کردہ سیاسی نظام تو ۶۲۲ء سے ۶۶۱ء تک چلا اور جس نظام کو امیر معاویہ نے قائم کیا وہ ۲۰۰۵ء تک میں مسلم ممالک میں قائم و دائم ہے۔ ملوکیت اور زمیندارانہ نظام نے مسلمانوں کی سمجھ و فکر کو متاثر کیا۔ حد یہ ہوئی کہ ابتدائی دور کے صوفیاء نے ملوکیت کے اس موروثی نظام سے برأت اختیار کی لیکن بعد کے صوفیاء بھی اسی موروثی نظام کا حصہ بن گئے یعنی شروع دور میں صوفیا اپنا خلیفہ جو ان کے مریدوں میں سب سے اہل ہوتا اس کو بناتے لیکن بعد میں صوفیاء کی خلافت اور سجادہ نشینی بھی موروثی ہوگئی۔ مساجد کی امامت، عہدۂ قضا سب موروثی ہوگئے۔ حالانکہ دوسرے معاملات میں سنی و شیعی علماء میں بہت سے

مسائل پر اختلاف رہا لیکن ملوکیت اور زمیندارانہ نظام کے دونوں حصہ بنے رہے اور بعض علماء بڑی بڑی زمینداریوں کے مالک رہے۔ مسلمانوں نے شریعت کے خلاف زمینداری کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنی جائداد کا متولی پسر اکبر کو بنایا تا کہ زمینداری تقسیم ہونے سے محفوظ رہ سکے۔ وقف نامے اس کا بین ثبوت ہیں۔ مسلم پرسنل لاء بناتے وقت اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ کھیت اور باغ میں باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد میں بیٹیوں کو محروم کر دیا گیا تا کہ زمینداری کی زمینیں محفوظ رہ سکیں۔ حالانکہ ہندوستان میں زمینداری کا خاتمہ ہوگیا لیکن پاکستان میں ابھی بھی موجود ہے۔ سنی و شیعی علماء کی ایک بڑی تعداد نوابوں اور مسلم زمینداروں سے منسلک رہی اور ہم نے آہستہ آہستہ اسلام کے جمہوری نظام کو بھلا دیا۔

ایران میں بھی اکثریت مسلمانوں کی تھی اور وہ بھی اسی ملوکانہ و زمیندارانہ ماحول کا حصہ تھے۔ وہاں شہنشاہ آریامہر تھے۔ ظاہر ہے کہ ایران کا سیاسی نظام بھی غیر اسلامی تھا اور وہاں بھی بڑی تعداد میں شیعی علماء موجود تھے۔ ہندوستان و پاکستان کے شیعی علماء کا بھی تعلق اس دور میں ایران اور ایران کے شہنشاہ آریامہر سے رہا۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اس ملوکیت اور زمیندارانہ نظام کے سمندر میں امام خمینیؒ کو کیسے یہ خیال آیا کہ ایران میں اسلامی جمہوری نظام قائم ہونا چاہیے۔ انھوں نے شہنشاہ آریامہر کے ملوکانہ نظام کے خلاف تحریک چلائی۔ امام خمینیؒ اور ایران کے عوام نے قربانیاں دیں جس کے نتیجے میں ایران میں اسلامی جمہوری نظام قائم کیا جس کو ہم نے ۱۹۶۱ء میں کھو دیا تھا، لیکن مسلمانوں اور مسلم حکمرانوں کی ایک بڑی تعداد بجائے امام خمینیؒ کے اس کارنامہ کو سراہنے کے مخالفت شروع کر دی۔ چاہے وہ عراق کے صدام حسین ہوں یا سعودی عرب اور کویت کے شاہ ہوں سبھی مخالف ہوگئے اور اس انقلاب کو ختم کرنے کے لیے ایران پر جنگ تھوپ دی۔ صدام حسین نے ایران پر حملہ کیا جس میں انھیں کویت سے مدد ملی۔ ہمارا پتہ نہیں کیوں یہ مزاج بن گیا کہ ہم جمہوریت اور جمہوری قدروں سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ دراصل یہی ہمارے زوال کا باعث ہے۔

آیت اللہ جعفر سبحانی

امام خمینیؒ اور قرآن

قرآن مجید ان دو گراں بہا یادگاروں میں سے ایک ہے جو پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنے بعد چھوڑی ہیں۔ محدثین نے پیغمبر اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"انی تارکٌ فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی لن یفترقا حتی یردا علیَ الحوض۔"[1]

میں تمہارے درمیان دو بڑی اور بھاری بھرکم یادگاریں — خدا کی کتاب اور اپنی عترت — چھوڑ کر جا رہا ہوں اور یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گی یہاں تک کہ (روزِ قیامت) حوض کوثر پر مجھ سے ملحق ہو جائیں۔

پس قرآن وعترت دنیا و آخرت کی سعادت مندانہ زندگی کے لیے دو رکن رکین اور دو اصل اصیل شمار کیے جاتے ہیں۔ اس مقالہ میں ہماری گفتگو کا محور امام خمینی رضوان اللہ علیہ کے افکار ونظریات میں موجود مختلف قسم کے قرآنی جلوے ہیں۔ جہاں تک عالم انسانیت کی ہدایت و رہبری میں پیغمبرِ اسلامؐ کی عترت علیہم السلام اور ان کے اقوال و سیرت کی عظمت و اہمیت سے متعلق امام خمینی طاب ثراہ کے افکار ونظریات کا سوال ہے، یہ بحث اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات پیغمبرِ اسلامؐ کی عترت اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں موصوف کے جذبات و احساسات ان کے وصیت نامہ کے مقدمہ میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے آپ کی یہ آخری یادگار مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے جو قرآن وعترت کے بارے میں امام خمینی کے طرزِ فکر کو واضح کرتی ہے۔

ہم نے قرآن کریم کے مختلف پہلوؤں میں سے چند پہلو، جو انھوں نے اپنے دروس اور تقریروں کے دوران خود بیان فرمائے ہیں منتخب کیے ہیں جن کی وضاحت کرتے ہوئے ہم ان کے بارے میں امام خمینی کے نقطۂ نظر کو پیش کریں گے۔ آپ کے افکار و نظریات پیش کرنے کے سلسلہ میں ہم نے مندرجہ ذیل منابع و مآخذ سے استفادہ کیا ہے:

۱۔ ایران سے ترکی کے لیے جلاوطن کیے جانے سے قبل ۱۳۶۹ھ سے ۱۳۸۳ھ کے دوران حوزہ علمیہ قم میں فلسفہ، فقہ، اصول اور تفسیر کے موضوعات پر آپ کے عظیم علمی دروس جن میں مقالہ نگار کو بہ نفس نفیس شرکت کرنے اور آپ کے دسترخوان علم سے خوشہ چینی کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔

۲۔ صحیفۂ نور یعنی امام خمینیؒ کے رہبرانہ ارشادات اور تقریروں کا وہ مجموعہ جو وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی کی جانب سے کئی حصوں میں چھپ کر نشر ہو چکا ہے۔

۳۔ سورۂ حمد کی تفسیر کے ذیل میں امام خمینیؒ کی عالمانہ بحثیں جو ایران ٹیلی ویژن پر نشر ہوئیں اور اس کے بعد "انتشارات جامعۂ مدرسین" کی طرف سے ایک مجموعہ کی شکل میں چھپ چکی ہیں۔

جن مسائل کے بارے میں امام خمینیؒ کے افکار و عقاید کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ قرآن کریم کی وسعتیں۔

۲۔ قرآن کے عرفانی و عقیدتی پہلوؤں کی وضاحت۔

۳۔ مادّی طرزِ فکر پر مبنی تفسیر اور تفسیر بالرائے سے پرہیز۔

۴۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا ساختہ و پرداختہ تحریف قرآن کا افسانہ۔

۵۔ قرآن کریم کی مختلف قرأتوں کی حیثیت جن کی پیغمبرِ اسلامؐ کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔

اب مذکورہ مسائل کا تجزیہ خود امام خمینیؒ کی ہی زبان اور ان کے قلم سے یا پھر جو کچھ میں نے خود ان سے پڑھا اور سنا ہے من و عن پیشِ خدمت ہے:

لیکن اس سے قبل تیمن و تبرک کے طور پر دو حدیثیں۔ ایک پیغمبر اکرمؐ اور دوسری آپؐ کے وصی و جانشین امیر المومنین علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں، پیغمبرِ اسلامؐ کا ارشادگرامی ہے:

"اذا التبست علیکم الفتن کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرآن فانه شافع مشفع وماحصل مصدق۔ من جعله امامه قاده الیٰ الجنة......" ؎

جب اندھیری رات کے مانند فتنے تم کو اپنے گھیرے میں لے لیں تو قرآن کی طرف رجوع کرو۔ یہ وہ شفیع اور گواہ ہے جس کی شفاعت و سفارش اور شہادت و گواہی قبول ہوتی ہے، جو شخص قرآن کو اپنے سامنے رکھتا ہے، وہ اس کی جنت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

امیر المومنین علیؑ فرماتے ہیں:

"واعلموا انه لیس علیٰ احد بعد القرآن من فاقة ولا لاحد قبل القرآن من غنیٰ۔" ؎

یاد رکھو! کوئی بھی قرآن پانے کے بعد فکری و معنوی طور پر فقیر و محتاج نہیں ہے اور اسی طرح کوئی بھی قرآن پانے سے قبل بے نیاز نہیں ہے۔

قرآن کریم کی وسعتیں

قرآن آخری آسمانی کتاب کے عنوان سے پیغمبرِ اسلامؐ کے قلب مبارک پر نازل ہوا تا کہ لوگ اس کی تلاوت کریں اور معاشرہ میں اس کے احکام و قوانین رائج و نافذ کریں، یہ کتاب چونکہ خدا کی جانب سے نازل ہونے والے آخری دستورِ حیات کی حامل ہے، لہٰذا اسے انسانی معاشرہ کے لیے کامل ترین اصولِ زندگی پیش کرنا چاہیے، ایسے اصول و قوانین جو گزشتہ آسمانی کتابوں پر محیط ہوں اور ان کو مکمل کمال عطا کرنے والے ہوں۔

عموماً اپنے دروس میں حضرت امام خمینیؒ مندرجہ ذیل تین آیتوں پر تکیہ کرتے تھے:

وانّہ لتنزیل ربّ العالمین نزل بہ روح الامین علیٰ قلبک لتکون من المنذرین۔"[۴]

یہ پروردگار عالم کی تنزیل ہے جس کو روح الامین نے آپ کے قلب پر اُتارا ہے تا کہ آپ لوگوں کو ڈراتے رہیں۔

استاذ علام طاب ثراہ فرماتے تھے کہ قرآن کریم الفاظ کے جامے میں ڈھلنے اور مفاہیم کی صورت میں قلبِ رسولؐ پر نازل ہونے سے قبل ایک بلندتر واقعیت کا حامل رہا ہے جس نے اس ارفع و اعلیٰ مقام سے تنزل کی وجہ سے لفظ و معنیٰ کی صورت اختیار کی ہے، لیکن اس نزول کی حقیقت کیا ہے؟ اور کس طرح اس بلند و بالا رتبہ و مقام سے ایسے کم رتبہ اور مقام تک اس نے تنزل کیا۔ یہ باتیں ہم پر واضح و روشن نہیں ہیں اگرچہ ارباب معرفت اس منزل میں مطالب بیان کرتے ہیں۔[۵]

قرآن کی عظمت میں بس اتنا کافی ہے کہ خداوند عالم نے اس کتاب کو گزشتہ تمام آسمانی کتابوں کے لیے حافظ ونگہبان اور تمام قدیم و جدید ادوار کے مطالب و واقعات کی صحت و پرکھ کے لیے بے مثل معیار و میزان قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:

"وانزل الیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتاب و مھیمناً علیہ فاحکم بینھم بما انزل اللّٰہ"[۶]

ہم نے اس کتاب کو برحق طور سے تم پر نازل کیا ہے کہ جو گزشتہ کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان کے درمیان حاکم و داور ہے، ان کے بارے میں، جو کچھ تم پر نازل کیا جاچکا ہے اس کے مطابق حکم و فیصلہ کرو۔ دوسری آیت میں خدا فرماتا ہے:

ان ھذا القرآن یقص علیٰ بنی اسرائیل اکثر الذی ھم فیہ یختلفون۔"

یہ قرآن ان بہت سی باتوں کو، جن کے بارے میں بنی اسرائیل اختلاف رکھتے ہیں

ان کے سامنے بیان کرتا ہے۔ (سورۂ نمل/۷۶)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی تمام عظمتوں کے ساتھ قرآن مجید خدا کی جانب سے نازل کی گئی آخری کتاب ہے۔ یہ دوسری آسمانی کتابوں پر فضیلت کی حامل اور اختلاف کی صورت میں ان کے درمیان داور اور فیصلہ کرنے والی ہے لہذا مختلف النوع ہے وسیع پہلوؤں کی حامل اس کتاب کو تا قیام قیامت الٰہی افکار کا مرکز ہونا چاہیے۔

حضرت امام خمینیؒ نے (انقلاب کی کامیابی سے قبل) ۷۶-۱۳۵۶ھ کو نجف اشرف میں اپنی تقریر کے دوران قرآن کے وسیع پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تاسف کا اظہار فرمایا کہ بہت سے مفسرین نے قرآن کریم کے کچھ مخصوص پہلوؤں کے بیان کرنے کے سلسلہ میں اپنی نظر توجہ مبذول رکھی ہے اور اس کے دوسرے پہلو بیان کرنے سے باز رہے ہیں، چنانچہ آپ نے بارہا قرآن کی جامعیت اور ہمہ گیری کا ذکر کیا ہے۔ ۷

فلاسفہ، عرفا اور متکلمین نے قرآن کے معنوی پہلوؤں اور اس کے فلسفیانہ و کلامی مسئلوں کے بیان پر توجہ صرف کی ہے اور تفسیریں لکھی ہیں جن کے دیکھنے سے ایسا لگتا ہے گویا قرآن محض اسی مخصوص مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے اور یہ سیاست و تربیت کی کتاب نہیں ہے۔ دوسری طرف بڑے بڑے فقہاء نے قرآن کی فقہی آیتوں پر توجہ صرف کی ہے اور اس کے دوسرے پہلوؤں کے سلسلہ میں سعی و کوشش سے باز رہے ہیں۔ اسی طرح دوسرے مفسرین ہیں جنھوں نے اپنے اپنے ذوق و فن کے اعتبار سے قصص، تاریخ، ادب اور فصاحت و بلاغت پر کام کرتے ہوئے اس کے مخصوص پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

ہم اگرچہ ان حضرات کی مساعیٔ جمیلہ اور ان میں سے ہر گروہ کی محنت اور حسن کارکردگی کو نہ صرف یہ کہ قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں بلکہ شکر گزار بھی ہیں پھر بھی اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن کو اس کے کسی ایک پہلو یا چند گنے چنے پہلوؤں میں محدود کرنا اور دوسرے پہلوؤں کی طرف سے بے توجہی برتنا قرآن کے ہدف و مقصد سے ہم آہنگی نہیں

ہے۔

قرآن اگر ایک طرف عقیدہ وعرفان کی کتاب ہے اور ظریف ترین عرفانی وفلسفیانہ مفاہیم بیان کرتا ہے تو دوسری طرف اخلاق و معاشرت اور سیاست وحکومت کے میدان میں بھی عالم بشریت کی تربیت اور انسانی تعمیر کا کام انجام دیتا ہے۔مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایک جامع وکامل کتاب کے عنوان سے قرآن کا مطالعہ کریں۔ ایک ایسی کتاب جس میں ان کے تمام سوالوں اور ضرورتوں کا جواب موجود ہے، البتہ اس سلسلہ میں خاتم النّبیین پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیز آپ کی ذرّیت مطہرہ کے اقوال و ارشادات سے قرآنی مفاہیم وتوضیح میں رہنمائی حاصل کریں جیسا کہ قرآن کا خود ارشاد ہے:

"و انزلنا الیک الذکر لتبیّن للناس مانزّل الیھم ولعلّھم یتفکّرون۔ "[۸]

ہم نے ذکر (قرآن) کو تم پر نازل کردیا ہے تا کہ جو کچھ تم پر نازل کیا جاچکا ہے تم اسے لوگوں کے سامنے بیان کرو کہ شاید وہ لوگ غور وفکر سے کام لیں۔

قرآن کا معنوی پہلو

قرآن مجید کا عرفانی، فلسفیانہ و اعتقادی پہلو ان زندہ وجاوید پہلوؤں میں سے ہے جس نے ہر دور میں بڑے بڑے علماء اور دانشوروں کو اپنی طرف متوجہ رکھا ہے اور آج بھی اسے صحیح عقائد کو غلط عقائد کے ساتھ امتیاز عطا کرنے کی بہترین کسوٹی سمجھا جاتا ہے۔قرآن نے عرفان ومعارف کے وہ باب کھولے ہیں جن کی بلندیوں تک کسی بھی فلسفی کے طائر فکر نے پر نہیں مارے ہیں۔کبھی کبھی تو مختصر ترین عبارت میں ایسے نکات بیان کردیئے ہیں جنھیں مفکرین عالم کئی صدیوں کی مسلسل محنتوں کے بعد سمجھنے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔

امام خمینیؒ نے سورۂ حمد کی جو تفسیر پیش کی ہے اس میں قرآن کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ اس پہلو پر پوری توجہ دی ہے بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ اس فراموش شدہ پہلو کو دوبارہ

مقام شہود پر واپس لائے ہیں۔ جو تفسیریں ادھر چند صدیوں میں لکھی گئی ہیں ان میں بیشتر وہ ہیں جن میں قرآن کے ادبی یا تاریخی یا فقہی پہلو پر زیادہ توجہ دی گئی ہے لیکن روح کو بالیدگی عطا کرنے والے عرفانی پہلو جو بہترین و کامل ترین انسانوں کی تخلیق و تربیت کرسکتے تھے بہت ہی کم لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہیں۔

استاد معظم امام خمینیؒ نے ۱۳۶۹ھ میں اپنے درس کے دوران فرمایا تھا:

قرآن کریم تمام ضرورتوں خاص طور سے عقل و خرد کے مطالبوں کو پورا کرتا ہے۔ ہمیں اگرچہ قرآن کے محض کسی ایک پہلو کو مورد نظر قرار نہیں دینا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کے اس رخ پر زیادہ توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے، بنیادی طور پر الٰہی علوم و معارف کے ماہرین کے درمیان ذات خدا کے بارے میں اختلاف نہیں ہے سبھی خدا کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں، ان کا اختلاف محض خدا کے اسماء و صفات اور عقلی معارف تک محدود ہے، اگر اسلامی محققین پہلے سے کوئی نتیجہ قائم کیے بغیر اور دوسرے مکاتب سے متاثر ہوئے بغیر قرآن کی طرف رجوع کریں تو الٰہی علوم و معارف بالخصوص صفات خدا کے بارے میں اپنا گمشدہ مطلوب پالیں گے۔

معارف کے اس باب میں ابتدائی صدیوں سے ہی اہل حدیث، معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان زبردست ہنگامہ آرائی رہی ہے۔

اس کے بعد امام خمینیؒ نے ایک حدیث امام علی بن الحسینؑ کی نقل کی جس میں شیخ کلینی علیہ الرحمہ (متوفی ۳۲۹ھ) کی روایت کے مطابق حضرت فرماتے ہیں:

خداوند عالم کو معلوم تھا کہ آخری زمانہ میں صاحب فکر و نظر قومیں ہوں گی لہٰذا اس نے سورۂ توحید اور سورۂ حدید کی یہ چھ آیتیں نازل فرمائیں کہ جو کچھ بھی زمین اور آسمانوں میں ہے سب اس اکیلے اور حکیم و قدرت مند خدا کی تسبیح و ستائش میں مشغول ہیں، وہ خدا کہ تمام آسمان اور زمین سب کے سب جس کی ملکیت ہیں، وہ خلق کو زندگی دیتا ہے اور پھر موت دے

دیتا ہے، اور وہی ہے جو دنیا میں موجود تمام چیزوں پر قدرت و توانائی رکھتا ہے، وہی کائنات کی ابتدا اور وہی انتہا ہے ظاہر و باطن ہر جگہ اسی کا وجود ہے، وہ دنیا کے تمام امور کا جاننے والا ہے، وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں خلق کیا اور پھر عرش کے امور (نظام عالم) درست کیے وہ جو کچھ زمین میں جاتا ہے، اور اس میں سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ اوپر آتا ہے سب جانتا ہے۔تم جہاں کہیں رہو وہ تمھارے ساتھ ہے اور جو کام بھی کرو وہ اس سے آگاہ ہے۔تمام آسمان اور زمین سب کچھ اس کی ملکیت ہیں اور تمام امور کی بازگشت اس کی طرف ہے۔رات کو دن کے پردۂ زریں میں پنہاں کرتا ہے اور دن کو رات کی تاریکی میں چھپا دیتا ہے اور کائنات کے دلوں کے رازوں سے بھی وہ آگاہ ہے۔اس وقت امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں: ''جس نے ان تمام باتوں سے الگ ہٹ کر خدا کے بارے میں سوچا وہ ہلاک ہوا''۔۹

اس کے بعد امام خمینیؒ نے سورۂ حدید میں بیان شدہ معارف کے درمیان سے دو ٹکڑوں کا انتخاب کیا:

(۱) ''ھو الاوّل والآخر والظاھر و الباطن''

(۲) ''وھو معکم اینما کنتم''

اور فرمایا: وسیع پیمانے پر بحث کے بعد فلاسفہ کی فکر اس مقام تک پہنچی ہے کہ وجودِ حق تعالیٰ ایک لامتناہی وجود ہے اور اس کے لامتناہی ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور ہرگز کوئی ''ممکن'' ''واجب'' سے خالی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

عقلی و قرآنی معارف سے بے بہرہ افراد یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ آیات ممکنات میں واجب کے حلول کی نشاندہی کرتی ہیں۔ایک دوسرا گروہ حلول کے فلسفہ سے گریز کرتے ہوئے ممکنات پر اس کے وسیع احاطہ کو ''احاطۂ علمی'' کی صورت میں تفسیر کرتا ہے یعنی ان کا خیال ہے کہ اس کا وجود ممکنات پر محیط نہیں ہے بلکہ ان سب پر اس کا علم احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ ہر چیز

سے آگاہ ہے لیکن کہنا چاہیے کہ دونوں گروہ (جب حقیقت کو نہ دیکھ سکے) تو انسانوں کی راہ پر چلے گئے ہیں۔

حلول، امکانی صفات اور جسمانی خصوصیات میں سے ایک ہے اور واجب الوجود خدا اجسام کا خالق ہے، نہ جسم ہے اور نہ کسی جسم میں حلول کرتا ہے۔

ان آیات کی تفسیر علمی احاطہ کے عنوان سے کیا جانا ایک طرح کی تفسیر بالرائے ہے کیونکہ وہ واضح طور پر ارشاد فرماتا ہے:"ھو معکم اینما کنتم" تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمھارے ساتھ ہے، اور یہ اس بات سے کہ" وہ ہر چیز سے آگاہ ہے" قطعی مختلف معنی رکھتا ہے۔

نہ صرف یہ آیت، ممکنات پر اس کے تسلط اور احاطۂ وجودی کو بیان کرتی ہے بلکہ دوسری آیات بھی اس خیال کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً سورۂ مجادلہ کی ساتویں آیت میں ارشاد ہے:

"مایکون من نجویٰ ثلاثۃ الا ھو رابعھم ولا خمسۃ الا ھو سادسھم ولا ادنیٰ من ذالک ولا اکثر الا ھو معھم اینما کانوا ثم ینبئھم بما عملوا یوم القیامۃ"

تین افراد باہم راز کی باتیں نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چوتھا اور نہ پانچ افراد کوئی بات کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چھٹا (ہوتا ہے) نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ مگر یہ کہ وہ جہاں بھی ہوں خدا ان کے ساتھ ہے (کیونکہ خدا تمام جزئیات عالم پر کامل احاطۂ وجودی رکھتا ہے) پس قیامت کے دن ہر ایک کو ان کے اچھے اور برے اعمال کے نتیجے سے آگاہ کرے گا۔

اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ہمیں بڑی ہی عمیق نگاہوں سے قرآن کا جائزہ لینا چاہیے، لامتناہی وجود کو ہر جگہ موجود لیکن اس کی موجودگی کو دیگر اجسام کے ساتھ جسمانی موجودگی کی صورت میں نہیں بلکہ معلول امکانی کی حقیقت میں علت الٰہی کے وجود کی شکل میں سمجھنا چاہیے۔ اور یہ وجود تمام اشیاء پر خدا کے قیومی احاطے اور ذات واجب پر ممکنات کے قیام و انحصار کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے اور یہ قیام اس قدر ظریف و دقیق ہے کہ خود نفس پر علمی

صورتوں کے قیام سے بالاتر ہے اور عالم ممکنات میں خدا کا وجود نفس پر مبنی قوتوں (سماعت و بصارت وغیرہ) کے پہلو بہ پہلو نفس کے وجود سے بالاتر ہے۔

ٹھیک ہے کہ نفس مجرد علمی صورتوں کے پہلو بہ پہلو ایک طرح کی موجودگی رکھتا ہے اور اس سے بالاتر نفس کی قوت فعالہ کے پہلو بہ پہلو نفس کا وجود ہے کہ اگر ان علمی صورتوں یا قوتِ فعالہ کے ساتھ نفس کی موجودگی یا اس کا ارتباط قطع ہوجائے تو ان کا نابود ہوجانا قطعی و یقینی ہے لیکن ممکنات کے پہلو بہ پہلو واجب کی موجودگی اور واجب پر ممکنات کا قیام بہت ہی زیادہ دقیق وظریف ہے کیونکہ یہ واجب پر ممکن کے قیام کا مسئلہ ہے، ممکن پر ممکن کے قیام کی بات نہیں ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں انسان کو قرآنی توحید اور اس کے باریک عرفانی پہلوؤں کے سامنے سرِ تعظیم خم کردینا چاہیے اور خود کو اس کی حقیقت کے درک کرنے کے سلسلہ میں عاجز و ناتواں سمجھنا چاہیے۔ [۱۰]

اخروی جزاوسزا، اعمال کا مجسم ہونا ہے

حضرت امام خمینیؒ قدس سرہٗ اپنے باقاعدہ دروس کے اختتام پر مخصوص دنوں کی مناسبتوں سے اخلاقی وتربیتی بحثوں پر روشنی ڈالا کرتے تھے، اعمال کی جزاوسزا کے سلسلہ میں آپ آخرت میں اعمال کے مجسم ہونے پر کافی زور دیا کرتے تھے، ہم یہاں اُن کی کتاب ''تہذیب الاصول'' سے ایک موقع کی مناسبت سے ذکرشدہ گفتگو کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

''بعض لوگ خیال کرتے ہیں آخرت کی جزائیں اور سزائیں پہلے سے مقررشدہ قرارداد یا معاہدے کی صورت رکھتی ہیں بالکل ویسے ہی جیسے دنیوی سزائیں اور انعامات مختلف انسانی معاشروں میں رائج ہیں جبکہ یہاں مطلب کچھ اور ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے اور صرف یہی وہ آسمانی کتاب ہے جس نے ان کے چہرے سے پردہ اُٹھایا ہے اور وہ یہ کہ خیروشر کے اعتبار سے انسان کا عمل دوطرح کا

وجود رکھتا ہے۔"

"ان کا "دُنیوی وجود" ہمارے اعمال ہیں اور "اُخروی وجود" ہماری جزا وسزا کی شکل میں ظاہر ہوگا، چونکہ انسان برزخی و اُخروی وجود کے احساس کی صلاحیت نہیں رکھتا اس لیے عمل کو صرف دُنیوی لباس میں دیکھتا ہے اور اس کے باطن سے جو ایک طرح سے اس کے اُخروی وجود کی حکایت کرتا ہے غافل ہے روزِ قیامت عمل کے اوپر چڑھی کھال یا پرت اُتر جائے گا اس وقت اس کی حقیقی شکل اور مغز جزا وسزا کی صورت میں جلوہ گر ہوجائے گی۔" ان آیات پر غور و فکر اس حقیقت کی گواہ ہے جہاں اعلان ہوتا ہے:

"یوم تجد کلّ نفس ماعملت من خیر محضراً وماعملت من سوء تودّ لو انّ بینها و بینہٗ امداً بعیداً۔" (سورہ آلِ عمران: ۳۰)

اس روز جبکہ ہر نفس اپنے اچھے اور برے کام اپنے سامنے موجود دیکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس نے جو برے کام انجام دیئے ہیں ان کے اور اس کے درمیان ایک لمبا فاصلہ قائم ہوجائے۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"ووجدوا ماعملوا حاضراً ولایظلم ربّک احداً۔" (سورۂ کہف:۴۹)

جو کچھ انھوں نے انجام دیا ہے اسے حاضر وموجود پاتے ہیں اور تمھارا پروردگار، کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اسی ذیل میں ایک تیسری آیت ہے جو ذرا واضح انداز میں یہ حقیقت بیان کرتی ہے، اعلان ہوتا ہے:

"والّذین یکنزون الذهب والفضّة ولاینفقونها فی سبیل اللّٰه فبشّرهم بعذاب الیم یوم یحمیٰ علیها فی نارجهنّم فتکویٰ بها جباههم وجنوبهم وظهورهم، هذا ماکنزتم لانفسکم فذوقوا ماکنتم تکنزون۔" (توبہ: ۳۴-۳۵)

جو لوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور ان چیزوں کو راہِ خدا میں انفاق نہیں کرتے آپ ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دیں! وہ دن جب ان کی یہ ذخیرہ کردہ چیزیں دوزخ کی آگ میں لال کی جائیں گی اور ان سے ان کی پیشانی، ان کا پہلو اور ان کی پشت داغی جائے گی اور اس کے بعد ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے ذخیرہ کیا تھا اب جو کچھ تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا ان کا مزہ چکھو۔

اس آیت پر غور وفکر کرنے سے اعمال کے مجسم ہونے کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے احتکار کیا جانے والا سونا بیک وقت دو جگہ دو طرح کا وجود حاصل کرتا ہے یہاں دلکش و دیدہ زیب سونے اور چاندی کی صورت میں اور وہاں آگ میں تپتے ہوئے جانکاہ دھات کی صورت میں۔

''تفسیر بالرائے'' امام خمینیؒ کی نظر میں

تفسیر بالرائے تمام علمائے اسلام کے نزدیک متفق علیہ طور پر حرام و ممنوع ہے، مذاہب کی کثرت اور ہر مذہب کا اپنے حق میں قرآن سے شاہد و گواہ لے آنا اس بات کی نشان دہی ہے کہ سبھی نے پہلے سے قائم اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے تحت قرآن کی طرف رجوع کیا ہے۔

امام خمینیؒ اپنی ایک تقریر میں خاص طور سے تفسیر بالرائے کی سختی سے مذمت کرتے ہوئے یاددہانی فرماتے ہیں کہ آج کل ایسے گروہ پیدا ہوگئے ہیں جنھوں نے پہلے سے ہی اپنے کچھ عقائد و اصول قرار دے لیے ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں کہ اپنے حق میں قرآن کریم سے شاہد و گواہ لے آئیں اور اگر کامیاب نہ ہوسکے تو تاویل اور خلافِ ظاہر مفاہیم پیدا کر کے قرآن کو اپنی باتوں کے مطابق ڈھال لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

عصر حاضر میں ''مادہ پرستی'' نے بہت سے افکار پر تسلط حاصل کر رکھا ہے جس کی وجہ

سے حتیٰ بعض الٰہی علوم ومعارف کے ماہرین بھی قرآن کے علمی ومعنوی حقائق کو مادّیت کے ان ہی امور پر منطبق کرتے ہیں، ہمیں اس طرح کی تفسیر بالرائے بعض مصری قلم کاروں کے یہاں اور آج کل بعض گروہوں کی مبتذل تحریروں میں بھی نظر آتی ہے، ان کا مقصد قرآن کے غیبی معارف سے پردہ اُٹھانا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے خودساختہ نظریات کی تائید کی تلاش میں اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔

امام خمینیؒ طاب ثراہ نے مورخہ ۲۳-۳-۱۳۵۸ھ ش (۱۳رجون ۱۹۷۹ء) کو اپنی تقریر میں ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو پہلے سے قائم شدہ اپنے نظریات کے تحت قرآن سے مطالب نکالتے ہیں۔ آپ خبردار کرتے ہیں کہ اس گروہ کا کام سب سے زیادہ خطرناک ہے یہ لوگ اس پر تل گئے ہیں کہ جو کچھ ان کا دل چاہتا ہے قرآن کے سر تھوپ دیں۔[۱۱]

تحریف قرآن کا افسانہ

تحریف قرآن کا شاخسانہ جو مدتوں سے عیسائی مبلغین کی طرف سے اٹھایا جارہا ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ تحریف قرآن کے نظریہ کی داغ بیل دوسری وتیسری صدی ہجری میں ہی احبار ورہبان کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان ڈالی گئی۔ انھوں نے اپنی آسمانی کتابوں کے نقائص کی تلافی کے لیے مسلمانوں کی آسمانی کتاب کو بھی ایک تحریف شدہ کتاب کے عنوان سے پیش کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

حضرت امام خمینیؒ نے آج سے تقریباً ۵۲ سال قبل ۱۳۷۴ھ میں ایک روز تحریف قرآن کی تہمت کے سلسلہ میں تقریر فرمائی تھی جس کا اصل متن عربی زبان میں آپ کی کتاب ''تہذیب الاصول'' میں موجود ہے، اس اتہام کے سلسلہ میں آپ کے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے یہاں ہم اس کا ایک اقتباس پیش کررہے ہیں۔

بیان کے اس حصہ میں حضرت امام طاب ثراہ آیاتِ قرآنی کی جمع آوری اور حفاظت

کے سلسلہ میں مسلمانوں کے اہتمام کا ذکر فرماتے ہوئے یاد دلاتے ہیں کہ صدر اسلام میں قرآن کریم سے متعلق مسلمانوں کا سخت اہتمام اس میں کسی ایک کلمہ کے کم یا زیادہ ہونے سے مانع تھا۔قرآن اسلام کی موجودیت اور پاکیزگی نیز مسلمانوں کی عظمت کی نشانی تھا کیسے ممکن تھا کہ اس قدر حافظوں، قاریوں اور کاتبوں کے ہوتے ہوئے قرآن میں تحریف ہوجائے؟

اس کے بعد آپ فریقین کی کتب میں تحریفِ قرآن سے متعلق مختلف روایات کا ذکر کرتے ہیں اور ان کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

تحریف سے متعلق روایات چار دستوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں جن میں سے تین دستے غلط اور نا قابل قبول ہیں اور چوتھا دستہ قابل قبول ہے لیکن اس کا تحریف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۔ پہلے دستے میں وہ روایات ہیں جن کے راوی ضعیف ہیں، یہ روایات زیادہ تر بصورتِ مرسل نقل ہوئی ہیں۔

۲۔ دوسرے دستے میں وہ روایات ہیں جن کے اصل متن سے ہی ان کے جعلی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

۳۔ تیسرے دستے میں وہ مضحکہ خیز روایات ہیں جن کو دیکھ کر عقل و وجدان حیرت و تعجب میں پڑ جاتے ہیں۔

۴۔ چوتھے دستے میں وہ روایات ہیں جن میں تفسیر قرآن سے متعلق گفتگو کی گئی ہے اور ہرگز ان کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کریم کا جزء ہیں۔

اسی کے بعد امام خمینی رضوان اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر ان روایتوں کو جمع کرنے اور الگ الگ دستوں میں تقسیم کرنے کا وقت ملتا تو یہ بات واضح ہوجاتی کہ کس طرح تحریف کا مسئلہ ایک افسانہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ آپ فرماتے ہیں:

اگر بحث سے خارج ہوجانے کا خوف نہ ہوتا تو ہم اپنی گفتگو کا رُخ تاریخ قرآن کے بیان کی طرف موڑ دیتے اور بتاتے کہ ان طویل صدیوں میں مسلمانوں نے قرآن کی کیا

خدمتیں انجام دی ہیں اور آپ کے سامنے یہ واضح کر دیتے کہ اللہ کی کتاب یہی ہے جو دونوں دلیلوں کے درمیان موجود ہے۔ **(تہذیب الاصول، ج ۲، ص ۹۶)**

ایک دن حضرت امام طاب ثراہ نے فرمایا: اگر میرزا شیرازی مرحوم کتاب ''فصل الخطاب'' کی اشاعت کے وقت زندہ ہوتے یقینی طور پر اس کتاب کو بے اہمیت قرار دے دیتے اور اعلان کر دیتے کہ یہ کتاب سرے سے ایسی ضعیف یا مرسل روایات پر مشتمل ہے جن سے روزِ اوّل سے ہی اسلامی محققین نے پرہیز کرتا ہے۔

قرأت کا اختلاف

امام خمینیؒ اپنی بحث کے دوران اس بات پر زور دیتے تھے کہ قرآن مجید کی نص کے اعتبار سے ایک سے زیادہ قرأت نہیں ہے اور پیغمبرِ اسلامؐ نے صرف ایک قرأت مسلمانوں کو تعلیم دی ہے اور خلیفۂ سوم کے زمانہ میں اگر کوئی کام انجام پایا ہے تو وہ قرآنی مفردات کے تلفظ کے اعتبار سے ہم آہنگی و یک رنگی سے مربوط ہے اور وہ بھی قریش کے لہجہ کے مطابق ہے، کیونکہ قرآن ''امّ القریٰ'' کے لہجہ میں نازل ہوا لہٰذا طبعاً اسی لہجہ میں محفوظ رہنا چاہیے۔

سات قرأتوں کے سلسلہ میں امام خمینیؒ کا موقف قطعاً منفی تھا، کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ اس بات پر واضح ترین گواہ کہ ایک کے علاوہ ان میں سے تمام قرأتیں قاریانِ قرآن کا اجتہاد اور ان کے افکار کی اختراع ہیں: خود یہ امر ہے کہ ان میں سے تمام صاحبانِ قرأت نے اپنی قرأت کی حقانیت میں دلیل و برہان اور حجتیں قائم کی ہیں اور ہر ایک کہتا ہے: اس دلیل کے تحت میری قرأت دوسری قرأتوں پر ترجیح رکھتی ہے۔

ہماری تفاسیر کا ایک بڑا حصہ صاحبانِ قرأت کی حجتوں اور دلیلوں پر مشتمل ہے اگر ان قاریوں کی قرأت راویوں کی طرق سے حضرت رسولِ خداؐ پر منتہی ہوتی تو حجتیں قائم کرنے اور ادبی تحلیل و تجزیہ پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، یہ بات خود گواہ ہے کہ قراء کے درمیان ادب کی ترویج، ان کے اجتہاد کا اختلاف اور ان کا طریقۂ کار قرأتوں میں اختلاف پیدا کرنے کا سبب بنا ہے۔

امام خمینی رضوان اللہ علیہ بعض کاتبین قرآن سے کہ جنھوں نے قرآن کے حاشیوں پر قرأتوں کے اختلاف کا ذکر کیا ہے سخت نالاں تھے۔ آپ کہا کرتے تھے: کیا قرآن انسان کا کلام ہے کہ اس کے مختلف نسخے پائے جاتے ہوں؟

مذکورہ موضوع کے تحت امام خمینی طاب ثراہ کے نقطۂ نظر کا یہ ایک اجمالی خاکہ تھا، لیکن آپ قرآن کے اجتماعی و تربیتی مسائل کے سلسلہ میں بہت ہی بلند انقلاب آفریں و انسان ساز افکار رکھتے تھے جس پر کبھی آئندہ بحث کی جائے گی۔

❁❁❁

حوالے:

۱۔ الکافی: ج-۲، ص-۱۳۸

۲۔ نہج البلاغہ: خطبہ ۱۷۶

۳۔ سورہ شعراء: آیت ۱۹۲ تا ۱۹۴

۴۔ اسفار: ج-۷، ص-۲۲-۲۰

۵۔ سورہ المائدہ: آیت ۴۸

۶۔ مسند احمد بن حنبل، جلد دوم، ص۱۴، ۱۷، ۲۶، ۵۹، جلد چہارم، ص۳۶۲ و ۳۷۱، جلد پنجم، ص۱۸۲ و ۱۸۹۔ نیز ملاحظہ فرمائیں سنن ترمذی، جلد دوم، ص۳۰۸، اور صحیح مسلم جلد ہفتم، ص۱۲۲۔

۷۔ صحیفۂ نور: ج-۱، ص: ۲۲۳-۲۴۲، صحیفۂ نور: ج-۵، ص-۱۲۸۔ تقریر ۱۲-۱۱-۱۳۵۷ھ ش

۸۔ سورہ نحل: آیت ۴۴

۹۔ نورالثقلین: جلد-۵، ص-۲۳۱

۱۰۔ تفسیر سورۂ الحمد کے ذیل میں اسی حقیقت کی طرف حضرت امام قدس سرہٗ نے ایک ہلکا سا اشارہ فرمایا ہے۔

۱۱۔ روح خدا در ولایت فقیہ (امام کی تقاریر و بیانات کا مجموعہ) مطبوعہ ارشاد۔ ص-۵۱

❁❁❁

مولانا اسحق مدنی

امام خمینیؒ اور اسلامی وحدت واتحاد

ہمارے زمانے میں جو چیز ''اسلامی انقلاب'' کے نام سے ظہور پذیر ہوئی ہے دوست اور دشمن ہر ایک کے تصورات سے بالاتر تھی۔ مختلف ممالک میں اسلامی تحریکوں کی مسلسل شکست کی وجہ سے مسلمان یہ سوچنے لگے تھے کہ جو وسائل و امکانات دشمنانِ اسلام کے اختیار میں ہیں ان کو دیکھتے ہوئے اسلامی حکومت کی تشکیل عملاً ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف مخالفین اسلام بھی اپنے منصوبوں اور سازشوں کے تحت مطمئن ہو چکے تھے کہ خود مسلمان اور اسلامی ملتوں کے درمیان انھوں نے مذہب، قوم، نژاد اور ملک وقوم کے نام پر جو اختلافات پیدا کر دیئے ہیں ان کی بنیاد پر ان ممالک میں ''اسلامی حکومت'' نام کی کوئی شئے وجود میں لانا اب کسی کے بس کی بات نہیں رہ گئی ہے۔ خود ایران کے اندر گزشتہ پچاس برسوں میں پہلوی حکومت کے ہاتھوں اسلام کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے کی کوششیں کی گئیں، پہلوی شہنشاہیت نے نہ صرف اپنے دربار میں بلکہ ملک کے تمام حساس مقامات پر اخلاقی اقدار کی پامالی کا بازار گرم کر رکھا تھا، شاہ ایران نے ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کا جشن برپا کر کے، جو دراصل مجوسیت کا مظہر تھا، اور جس نے ہجری تاریخ کا نام شہنشاہی تاریخ میں تبدیل کر کے، عالمی کفر اور استعمار کے تسلط کے لیے مکمل طور پر زمین ہموار کر دی تھی۔ ایک ایسے ملک میں اسلامی انقلاب کی کامیابی یقیناً ناقابلِ تصور اور غیر معمولی چیز تھی۔

بلاشبہ جس ہستی نے اس انقلاب کی قیادت و رہبری کی، اور تمام تر ملکی و غیر ملکی رکاوٹوں اور مادّی وسائل کی کمی کے باوجود پوری ملت کو اپنے گرد جمع کر کے اس نے نہ صرف اس اسلامی انقلاب کو ایران میں کامیابی سے ہمکنار کیا بلکہ پورے عالمِ اسلام میں اسلامی

حریت کا بیج چھڑک دیا اور مسلمانوں میں ایک نئی امنگ اور ولولہ کے ساتھ بیداری و آگاہی کی انقلابی کیفیت پیدا کردی۔ یقیناً یہ ہستی عالمِ اسلام کی ایک غیر معمولی اور استثنائی شخصیت کی حامل ہے۔ ظاہر ہے اس عظیم ہستی نے مسلمانوں کی آگاہی و بیداری، ان کے درمیان اتحاد و یکجہتی، اور ان کے امراض کی تشخیص اور علاج کے سلسلہ میں بے پناہ زحمتیں اور مشقتیں اُٹھائی ہیں۔

اس وحدت اور استقلال و آزادی کی راہ میں امام خمینی طاب ثراہ نے جو کوششیں کی ہیں نہ تو ان کا احصاء کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی دنیا کی بڑی سے بڑی لکھنے اور بولنے والی شخصیت ان کو بیان کرسکتی ہے۔ میں نے وہ گفتگو اور تقریریں جو حضرت امام خمینی قدس سرہٗ نے صرف ایک ماہ اردیبہشت ۱۳۵۸ ہجری شمسی (اپریل و مئی ۱۹۷۹ء) کے دوران ملاقاتیوں کے سامنے مختلف جلسوں میں بیان فرمائی ہیں ان کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ شاید ہی کوئی ایسی نشست ہو جس میں آپ نے امت مسلمہ کے اصل مرض ''اختلاف اور فرقہ بندی'' کو ختم کرنے اور باہم ''وحدت و اتحاد'' قائم کرنے کے سلسلہ میں سخت تاکید و نصیحت سے کام نہ لیا ہو۔

حضرت امام خمینی قدس سرہٗ یکم اردیبہشت (۲۱ر اپریل ۱۹۷۹ء) کو سعودی عرب سے آنے والے علماء کے ایک وفد کے سامنے جو وہاں کی بڑی شخصیتوں کی نمائندگی کر رہا تھا فرماتے ہیں:

''میں چاہتا ہوں کہ اسلامی امتیں اُٹھ کھڑی ہوں اور ''وحدتِ کلمہ'' کے ساتھ اسلام اور ایمانی قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے غیروں پر اور ان تمام طاقتوں پر جو ملت کو ہمیشہ اپنے اختیار اور تسلط میں رکھنا چاہتی ہیں غلبہ حاصل کریں، صدر اسلام میں مسلمانوں کی کامیابی کا راز یہی 'وحدتِ کلمہ' اور ایمانی قوت تھی۔''

اسی طرح ۲ر اردیبہشت (۲۲ر اپریل ۱۹۷۹ء) کی تقریر میں فرماتے ہیں:

''اور اب احساس بھی کرتا ہوں اور لمس بھی کرتا ہوں کہ اگر ملت آپس میں اتحاد پیدا کرلے، اگر مختلف اسلامی جماعتیں ایک ہوجائیں تو بڑی طاقتیں بھی ان کا مقابلہ نہیں

کر سکتیں۔"

۴/اردیبہشت (۲۴/اپریل ۱۹۷۹ء) کو انتظامیہ پولیس اور شہر ساوہ کے عوام کے سامنے فرماتے ہیں:

"میں اُمید رکھتا ہوں کہ یہ اتحاد و "وحدتِ کلمہ" جو ہماری ملت کے تمام طبقوں کے درمیان موجود ہے، باقی رہے اور اسی وحدتِ کلمہ کے سہارے اسلامی تحریکیں آگے بڑھیں اور اسلامی حکومتِ عدل قائم کر کے تمام طبقے اپنے حقوق حاصل کریں۔"

۵/اردیبہشت (۲۵/اپریل ۱۹۷۹ء) کو آمل سے آئے ہوئے لوگوں کے ایک گروہ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"کامیابی کا راز ایران نے پالیا ہے، خدا پر یقین اور وحدتِ کلمہ اس کا راز ہے۔ اس وحدتِ کلمہ کی حفاظت کیجیے۔"

اسی طرح شہر لوئی سے آنے والے ایک وفد کے سامنے ۷/اردیبہشت (۲۷/اپریل ۱۹۷۹ء) کو آپ فرماتے ہیں:

"خداوند تبارک وتعالیٰ اگر توفیق دے اور ہم اور ہماری ملت اس راز کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھے تو مجھے اُمید ہے کہ ہم اس اسلامی حکومت اور اسلامی احکام کو استقرار دے سکتے ہیں لیکن اس کے لیے وحدتِ کلمہ کی ضرورت ہے، ہماری ملت کو اتحاد و یکجہتی باقی رکھنا چاہیے وہ ملتیں جو مختلف شہروں اور علاقوں میں ہیں ہماری اس کوشش میں شریک ہوں اور سب کے سب متحد اور ایک آواز ہوکر اسلامی جمہوریہ اور اسلام کے مقدس احکام کی طرف آگے بڑھیں۔"

مورخہ ۸/اردیبہشت (۲۸/اپریل ۱۹۷۹ء) کو حضرت امام خمینی قدس سرہ' حبیب بورقیبہ کے خط کے جواب میں فرماتے ہیں:

"مجھے امید ہے کہ اسلامی جمہوریہ (ایران) دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان اتفاق و وابستگی کے سلسلہ میں اپنا موثر کردار ادا کرتا رہے گا۔"

۱۵/اردیبہشت (۵/مئی ۱۹۸۹ء) اسلامی تحریک آزادی کے مختلف جماعتوں کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہم اسلامی وحدت کو اپنا شعار بنائیں، وحدت کے ساتھ اور'لا الٰہ الا اللہ' کے پرچم تلے رہ کر ہی ہم کامیاب ہوسکتے ہیں۔ جب تک دنیا کے مسلمان ایران میں رونما ہونے والے اس راز سے آگاہی پیدا نہیں کرتے، کامیاب نہیں ہوسکتے۔''

۱۷/اردیبہشت (۷/مئی ۱۹۸۹ء) کو صومالیہ کے سفیر سے ملاقات کے دوران فرماتے ہیں:

''اسلامی حکومتوں کو باہم ایک حکومت کی مانند ہونا چاہیے، یہ سب ایک وسیع معاشرہ کی طرح ہیں، ایک پرچم ہے، ایک کتاب ہے اور ایک پیغمبر ہے۔ ان کو ہمیشہ متحد رہنا چاہیے اور آپس میں ہمہ جہت تعلقات و روابط رکھنا چاہیے چنانچہ اگر یہ آرزو پوری ہوجائے اور اسلامی حکومتوں میں ہمہ جہت وحدت پیدا ہوجائے تو امید ہے وہ اپنی مشکلات پر قابو پالیں گی اور دیگر تمام طاقتوں کے مقابل ایک بڑی طاقت بن کر سامنے آئیں گی۔''

۲۱/اردی بہشت (۱۱/مئی ۱۹۸۹ء) کو ڈاکٹر مصدق اسپتال کے ڈاکٹروں اور کارکنوں نیز ''ہلال احمر'' کی منتظم جماعت کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ وحدت کلمہ محفوظ رہنا چاہیے کیونکہ اگر خدانخواستہ یہ وحدت کلمہ ہاتھ سے چلی گئی اور خدانخواستہ ہم شکست سے دوچار ہوئے تو پھر کبھی ایران کے چہرے پر اس کی شادمانی لوٹ کر نہ آسکے گی۔ لہٰذا ہم سب کا فریضہ ہے کہ اس تحریک کی حفاظت کریں اور وحدت کلمہ کو محفوظ رکھیں۔''

اسی طرح اصفہان کی عدلیہ سے تعلق رکھنے والے ایک گروہ کے سامنے، جو آپ کی خدمت میں ۲۴/اردی بہشت (۱۴/مئی ۱۹۸۹ء) کو ملاقات کے لیے آیا تھا آپ نے فرمایا:

''آپ جانتے ہیں کہ یہ تحریک جو اس منزل تک پہنچی ہے، تمام طبقوں کے درمیان

اتحاد اور اسلام سے وابستگی کی برکت کی وجہ سے ہے۔"

۲۴ راردی بہشت (۱۴ رمئی ۱۹۷۹ء) کو ہندوستان و پاکستان سے آئے ہوئے ایک وفد سے فرماتے ہیں:

"وہ مختصر سے افراد، جو آج سازشوں میں مصروف ہیں، انشاء اللہ بہت جلد ہی نابود ہوجائیں گے۔ جو اس خیالِ باطل میں گرفتار ہیں کہ ایک شجاع قوم کے خلاف وہ سازش کرسکتے ہیں، وہ دفن کردیئے جائیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ مستضعفین وحدتِ کلمہ کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تمام گروہ آپس میں متحد رہیں جیسے وہ اب تک باہم متحد رہے ہیں، اور اس تحریک کو وحدتِ کلمہ کے ساتھ خداوند عالم پر بھروسہ کرتے ہوئے یہاں تک پہنچایا ہے اور بڑی بڑی دیواروں کو گرلیا ہے اب اس کے بعد بھی آپس میں متحد رہیں اور اس (کامیابی کے) راز کی حفاظت کریں۔ کامیابی کی کلید اپنے ہاتھ میں رکھیں، اگر یہ راز یعنی وحدتِ کلمہ خدائے عظیم پر بھروسہ اور خدائے عظیم کی طرف توجہ کے ساتھ محفوظ رہے، اگر مسلمان اس راز کی حفاظت کریں تو آخری کامیابی ان کے ہاتھ ہے۔"

حضرت امام خمینی قدس سرہ ایرانی تاجرین کے مختلف گروہوں کے مجمع میں ۲۵ راردی بہشت (۱۵ رمئی ۱۹۸۹ء) کو فرماتے ہیں:

"سب کی ایک عمومی ذمہ داری ہے اور وہ یہ کہ ہم سب اپنی تمام تر قوت و طاقت کے ساتھ کوشش کریں کہ یہ انقلاب محفوظ رہے، یہ وحدتِ کلمہ محفوظ رہے، یہ انقلاب الٰہی انقلاب کی صورت میں محفوظ رہے۔"

۳۱ راردی بہشت (۲۱ رمئی ۱۹۸۹ء) کو جنوبی لبنان کے شیعوں کی نمائندہ جماعت سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کو پہچانیں اور خود اپنے کو بھی پہچانیں، اس فکر میں نہ رہیں کہ بڑی طاقتیں بہت طاقتور ہیں۔

جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

اپنے امور کی ادائیگی میں بھی اپنے آپ کو پہچانیں اور سب کے سب باہم جمع ہوں، باہم اتحاد برقرار رکھیں تا کہ انشاء اللہ کامیاب ہوں اور انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ مجھے امید ہے یہ انقلاب اور تحریکیں جو مسلمانوں کے درمیان وجود میں آچکی ہیں، ہر جگہ متحد رہیں گی اور وحدتِ کلمہ کے ساتھ خداوند تبارک و تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے ہوئے، جو تمام کامیابیوں کا سرچشمہ ہے، آگے بڑھیں گی اور تمام اسلامی ممالک متحد ہوکر پرچم اسلامی کے زیرسایہ خوشحالی اور عزت کی زندگی بسر کریں گے۔

جب انسان دقتِ نظر سے کام لیتا ہے اور غور وفکر کرتا ہے تو یہ بات اس پر روشن ہوجاتی ہے کہ امام خمینی طاب ثراہ کی تمام تر توجہ ''وحدت'' و اتحاد پر رہی ہے چنانچہ جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں، عالمِ اسلام کا اصل مرض یہی ہے۔ اسی وجہ سے امام قدس سرہٗ اتحاد و وحدت پر، جو اس کا واقعی علاج ہے، اس قدر زور دیتے ہیں اور اس راہ میں بے انتہا زحمتیں برداشت کرتے ہیں، اگرچہ ہوتا یہ ہے کہ جب انسان کو اپنی زندگی میں ایک کامیابی حاصل ہوجاتی ہے تو درحقیقت وہ ایک طرح کا آرام وسکون محسوس کرتا ہے لیکن چونکہ حضرت امام خمینی قدس سرہٗ کا مقصد صرف ایرانی مسلمانوں کی کامیابی تک محدود نہ تھا، لہٰذا وہ اس کامیابی کے باوجود پوری دنیا کے مسلمانوں کو متحد کرنے کے سلسلہ میں اپنی مجاہدانہ کوششیں جاری رکھتے ہیں، ایک جملہ جو آپ نے عیدقربان کی مناسبت سے ارشاد فرمایا ہے اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ شاید وہی احساس جو کامیابی سے قبل آپ کے قلب میں پایا جاتا تھا رحلت کے وقت بھی آپ کے قلب میں موجزن تھا اور وہ جملہ یہ ہے:

''اسلام کے لیے اور مسلمانوں کے لیے مبارک دن وہ ہے جب ظالموں کا ہاتھ قلم ہوجائے اور وہ اسلامی ممالک میں خون چوسنے کے قابل نہ رہ جائیں۔''

یعنی آپ نے عید کو اس دن پر موکول کردیا جب دنیا بھر کے مسلمان حقیقی معنوں میں

استقلال و آزادی پیدا کرلیں اور ایسے حالات میں زندگی گزاریں کہ ان کے سروں پر بڑی طاقتوں کا وجود باقی نہ رہے اور واقعی طور پر انھیں استقلال و آزادی نصیب ہو۔"

یہاں اس نکتہ کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ وہ مرض جو امام خمینیؒ نے اس امت کے لیے تشخیص دیا، ایسا نہیں ہے کہ کسی دوسرے نے یہ مرض تشخیص نہ کیا ہو اور اس راہ میں تلاش و کوشش نہ کی ہو، لیکن وہ خصوصیت و امتیاز جو امام خمینیؒ ان مسائل میں رکھتے تھے شاید ان میں نہ ہو درحقیقت بہت سی شخصیتوں نے اس مرض کی تشخیص کی تھی اور اس کے علاج کی صورت بھی وہ جانتے تھے مگر وہ علاج میں کامیاب نہ ہوسکے۔ یہ فضیلت حضرت امام خمینیؒ کے نصیب میں تھی کہ مرض اور اس کے علاج کی تشخیص کے بعد علاج میں کامیاب بھی ہوئے اور اس کی کچھ خاص وجوہات تھیں جن کا ہم آخر میں ذکر کریں گے۔

پس مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس منزل میں ان شخصیتوں کا بھی ذکر کردیا جائے جنھوں نے اس راہ میں زحمتیں اُٹھائی ہیں اور اسی ضمن میں ہم یہ بھی بتانا چاہیں گے کہ کیوں امام خمینی قدس سرہٗ اس راہ میں کامیاب ہوئے اور وہ لوگ اس علاج میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے اس راہ میں تگ و دو اور کوششیں کی ہیں، لیکن ان میں سے بعض کی زحمتیں محدود پیمانے پر تھیں اور مختلف وجوہات کی بنا پر اور وسائل و امکانات کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہوئے یعنی ان کو وہ وسائل نہ مل سکے کہ ان کی خدمتیں پورے عالمِ اسلام تک پہنچ سکتیں۔ اس منزل میں خاص طور پر ہم چار شخصیتوں کے نام لینا چاہیں گے جنھوں نے اس راہ میں بڑی کوششیں کی ہیں۔

عالمِ اسلام کی ان اہم شخصیتوں میں سے ایک عظیم ہستی، جسے ہمیشہ عالمِ اسلام کی نجات کی فکر رہی، سیّد جمال الدین اسدآبادی ہیں جنھوں نے امت اسلامی کے درمیان اتحاد پیدا کرنے اور عالم اسلام کو استقلال دلانے کے سلسلہ میں بے پناہ کوششیں کی ہیں۔ سیّد جمال الدین نے بھی حضرت امام خمینیؒ کی طرح ملّتِ اسلامی کی بیماری اور اس کا علاج تجویز کرلیا تھا،

جس طرح امام فقید طاب ثراہٗ ہمیشہ وحدت اور اس کے راز کے بارے میں گفتگو فرماتے رہتے تھے۔ سیّد جمال الدین کا بھی یہی کردار رہا، وہ بھی ملت اسلام کا علاج اتحاد اور صدر اسلام کی طرف بازگشت خیال کرتے تھے لیکن افسوس ان کی تمام کوششیں جو دراصل اتحاد و یکجہتی اور ملت اسلام کے استقلال کے لیے تھیں خود ان کی زندگی میں بارآور نہ ہوسکیں۔

دوسری شخصیت جس نے عالمِ اسلام خاص طور پر عرب دُنیا کو بیدار کرنے کے سلسلہ میں قابل ذکر کردار ادا کیا اور ہر ہر قدم پر سیّد جمال الدین اسدآبادی کے ہمراہ رہی مفتی شیخ محمد عبدہ کی ذات تھی اور یہ بھی اپنی محنتوں کا پھل دیکھنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہوگئے۔

تیسری شخصیت جس نے اسلامی وحدت و استقلال کی راہ میں سیّد جمال الدین اسدآبادی اور مفتی عبدہ کی نسبت زیادہ تر اثرات چھوڑے ہیں اقبالؒ لاہوری کی ذاتِ گرامی ہے، لیکن یہ بھی بعض وجوہات کی بنا پر اپنے کام میں کامیاب نہ ہوسکے۔ ایک تو اپنی زندگی کا وہ زمانہ اور وہ مدت جو انھوں نے اپنے کام کے لیے منتخب کیا بہت ہی مختصر تھا، اس کے علاوہ ثقافتی و تعلیم یافتہ گروہ ہی آپ کے افکار سے استفادہ کرسکتا تھا، آپ کے افکار و نظریات یونیورسٹیوں اور کتابوں سے دُور عوام الناس کے درمیان نہ تو نفوذ پیدا کرسکے اور نہ ہی ان پر اپنے اثرات مرتب کرسکے۔

مسلمانوں کی کامیابی کے راز یعنی وحدت اور یہ کہ مسلمانوں کو استقلال و آزادی حاصل کرنے کے لیے آپس میں متحد رہنا چاہیے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی امام خمینی قدس سرہٗ کی مانند حصولِ اتحاد کی مختلف راہیں بیان کی ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ قوت و طاقت اور عظمت و شوکت کے بغیر اسلام کا تصور درست نہیں ہے۔ علامہ اقبالؒ کہتے تھے کہ مسلمان کو قوی اور کامیاب ہونا چاہیے اس کے اندر کمزوری کا احساس نہیں پیدا ہونا چاہیے۔

اقبال کا عقیدہ تھا کہ تین صورتوں سے ملت اسلام کو متحد کیا جاسکتا ہے۔ پہلی صورت جو اتحاد کی سب سے زیادہ مثالی صورت ہے وہ یہ کہ پوری ملتِ اسلامیہ کی رہبری ایک ہاتھ

میں ہو، دوسری صورت یہ کہ تمام اسلامی ممالک متحد جمہوریوں کی شکل میں ایک واحد نظام کے تحت کام کریں اور تیسری صورت یہ ہے کہ تمام اسلامی ممالک اپنی خودمختاری کو محفوظ رکھتے ہوئے آپس میں بھی سیاسی، اقتصادی اور فوجی معاہدوں کے تحت ایک دوسرے سے ہمہ جہت تعاون وہم آہنگی قائم رکھیں۔ چوتھی شخصیت جس نے ملت اسلام خصوصاً نئی نسل میں وحدت و ہم آہنگی، اتحاد و استقلال اور بیداری و آگاہی پیدا کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا اور اس راہ میں اپنی جان کی قربانی پیش کردی حسن بناء شہید کی ذات ہے۔ وہ اسلام سے متعلق اپنے تمام تر علم ومعرفت اور آگاہی کے باوجود چونکہ روایتی علماء کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے' لہٰذا عوام الناس کو اپنی جانب جذب کرنے میں ناکام رہے اور اقبال کی مانند زیادہ تر ان کی مقبولیت یونیورسٹیوں سے وابستہ افراد اور روشن فکر طلاب تک محدود رہی۔

امام خمینی رضوان اللہ علیہ کی خصوصیات میں سے ایک اہم چیز آپ کا تقدس اور پاکیزہ نفسی تھی۔ گویا خود حضرت امام طاب ثراہ ابتدائے زندگی سے اس بات کی طرف متوجہ تھے کہ خداوند عالم نے آپ کو ایک عظیم کام کے لیے خلق کیا ہے۔ دورانِ عمر یقینی طور پر ہر انسان کی زندگی میں بہت زیادہ نشیب وفراز پائے جاتے ہیں۔ انبیاء و ائمہ علیہم السلام جن کو خداوند عالم نے لوگوں کی ہدایت کے لیے منتخب فرمایا معصوم ہیں اور اس عظمت کے بعد جس کے وہ حامل رہے ہیں، ان کی زندگیاں ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک رہی ہے۔ لیکن غیر معصومین کے یہاں وہ چاہے کتنی ہی اہم شخصیت کے حامل کیوں نہ ہوں یہ بات کہ کسی طرح کا کوئی کمزور پہلو ان کے یہاں موجود نہ ہو بہت مشکل ہے لیکن امام خمینیؒ کی پاکیزگی اس منزل پر نظر آتی ہے کہ حتیٰ کہ آپ کے سخت ترین دشمن بھی آپ کے یہاں کوئی معمولی سا ضعیف پہلو پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں، جس وقت پہلوی حکومت نے آپ کے خلاف افواہ پھیلانا چاہی کہ اس طرح آپ کی شخصیت کو کسی عنوان سے مجروح کیا جاسکے تو سب سے بڑی بات جو وہ کہہ سکے یہ تھی کہ آپ ''ہندی الاصل'' اور ہندوستان سے ایران آئے ہیں،

بالفرض اگر یہ بات ثابت بھی ہوجائے تو اس میں کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ ایک انسان اپنی پوری زندگی ہر طرح کی آلودگی اور لغزش سے محفوظ رہ کر بسر کردے یقیناً کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اور یہ وہ خصوصیت ہے جو بہت ہی نادر طور پر دنیا کی گنی چنی شخصیتوں میں ملتی ہے۔

امام خمینیؒ کی دوسری خصوصیت ان کی روحانیت تھی، وہ ریاضت ومجاہدت، وہ توجہ اور دل سوزی اور وہ خاص روحانی کیفیات جن کے آپ حامل تھے، کے ذریعہ ہر دیکھنے والے بلکہ جو بھی آپ کے درس میں حاضر ہوتا تھا، اس کو اپنی طرف جذب کرلیتے تھے، یہی روحانیت مسلمان ملتوں اور اسلامی شخصیتوں کے قلوب تسخیر کرلینے کا سبب بنی تھی۔

امام خمینیؒ کی ایک اور خصوصیت انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں میں اُتر جانا اور عوام کا آپ کی بے دریغ حمایت کرنا تھی، یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ پیغمبرانِ خدا، ائمہ معصومین اور صدر اسلام کی عظیم شخصیتوں کے بعد قلوب میں گھر کرجانے کی یہ کیفیت کسی عالم اور روحانی شخصیت میں نظر نہیں آتی۔ وہ شخص جس کا ایک بیٹا یا دو تین بیٹے شہید ہوچکے ہوں جس وقت اس سے انٹرویو لیا جاتا ہے تو کہتا نظر آتا ہے ہمارے بچے اسلام اور امام (خمینیؒ) پر قربان ہوئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ امام خمینیؒ سلامت رہیں، اور یہ کہ ایک جماعت حاضر ہو اور اپنے قلوب ہدیہ کرے تاکہ امام خمینیؒ زندہ رہیں۔ لوگوں کے درمیان یہ مقبولیت ممکن ہے اس کے نمونے دوسری جگہوں پر بھی مل جائیں لیکن وہ عاشقانہ کیفیت اور والہانہ جوش وخروش جس سے سرشار ملت امام خمینیؒ کا وطن واپسی پر استقبال کرتی ہے اور وہ حالت کہ جس وقت آپ خطاب فرماتے تھے سب کے سب مشتاقانہ انداز میں گوش بر آواز رہتے تھے یا وہ کیفیت جو آپ کی تشییع جنازہ کے وقت دیکھنے کو ملی۔ عوام کے درمیان آپ کی غیر معمولی مقبولیت اور ان کے قلوب میں بے مثال اور غیر معمولی نفوذ کی نشاندہی کرتی ہے۔

حضرت امام خمینیؒ کی ایک اور خصوصیت جو آپ کی کامیابی میں بہت زیادہ مؤثر ثابت ہوئی، آپ کا مرجعِ تقلید ہونا تھا۔ یہ امر سبب بنا کہ جو افراد داخلی طور پر انقلاب کے کرتا دھرتا

تھے آپ کے افکار قبول کرنے پر دل و جان سے آمادہ ہوئے اور وہ خود کو اس بات کا مکلّف اور ذمہ دار سمجھتے تھے کہ ان افکار کی تبلیغ و ترویج کریں اور زندگی کے آخری لمحات تک ان کا دفاع کریں۔ یقیناً اگر امامؒ مرجعِ تقلید نہ ہوتے تو آپ کے پاس بھی سیّد جمال الدین اسدآبادی اور شیخ عبدہ کی مانند ان میں آگاہی پیدا کرنے اور انقلابی تحریک کے تئیں ان کو معتقد بنانے کا کافی وقت نہ تھا۔ حقیقت میں اس گروہ نے جو امام خمینیؒ کا مقلد تھا اور شرعاً خود کو امام خمینیؒ کے افکار پر عمل کرنے کے سلسلہ میں مکلّف سمجھتا تھا، کامیابی میں بنیادی کردار ادا کیا اور حضرت امام قدس سرہٗ کے اِردگرد اس گروہ کا اجتماع دیگر اسلامی معاشروں میں مسلمانوں کی روح کو تقویت پہنچانے کا سبب بنا۔

امام خمینی رضوان اللہ علیہ کی ایک اور خصوصیت مسلسل طور پر بار بار اتحاد کی دعوت اور عوام و خواص کے درمیان اس کی طرف شدت کے ساتھ تاکید تھی، یہاں تک کہ بعض وقت کج فہم افراد کی جانب سے آپ کو متہم بھی کیا گیا۔ امام خمینیؒ ان دوسرے بہت سے افراد کے برخلاف جو فروعی مسائل اُٹھا کر مسلمانوں کے کسی ایک یا چند گروہوں کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دینے کا سبب بنتے تھے خود اسلامی اتحاد اور اسلامی حکومت کو، جو اسلام کی اصل و اساس ہے، دیگر فروعی مسائل پر ترجیح دیتے تھے۔

ایک اور امتیاز جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے امام خمینیؒ کے ترقی یافتہ اور انوکھے افکار تھے۔ آپ کے نظریات کچھ ایسے تھے کہ تمام پڑھے لکھے افراد، طلبہ اور اساتذہ، ملازم اور مزدور، کسان اور تاجر حتیٰ کہ اَن پڑھ افراد بھی اپنے تمام کے تمام مطالبات امام خمینیؒ کے افکار میں مشاہدہ کرتے تھے۔ اسلام کے بلند افکار جن کو امام خمینیؒ نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا، لوگوں کے اندر بیداری و آگاہی اور بھولے سبق دوبارہ یاد آنے کا سبب بنے اور ملّتِ ایران اس انقلاب کے گرد جمع ہوگئی۔

حضرت امام خمینیؒ کی دیگر خصوصیات میں سے ایک آپ کا طریقۂ کار بھی تھا جو

دراصل وہی انبیاء علیہم السلام کا انداز و شیوہ تھا، یعنی اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے آپ نے کوئی حزب اور جماعت تشکیل نہیں دی کہ کچھ مخصوص افراد تحریک کے اصل محور اور آرگن کے طور پر سامنے آجائیں اور پھر کامیابی کے بعد حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں اور دوسرے ان کے مطیع و فرماں بردار بن جائیں۔ بہت سے اسلامی ممالک میں وہ جماعتیں جو اسلام کے نام پر کام کر رہی ہیں عموماً انھیں قابل ذکر کامیابی نہیں مل سکی ہے اور اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ خود یہ گروہ تحریک کے تئیں عوامی ہم فکری کی راہ میں مانع ہوتے ہیں۔ امام خمینی قدسرہٗ نے انبیاء علیہم السلام کی سیدھی سادی سیرت کا انتخاب کیا اور ایک عالم دین کے عنوان سے لوگوں کو اسلامی مسائل سے آشنا و باخبر کیا اور خود کو ہر طرح کی پارٹی و جماعت کی تشکیل سے دُور رکھا، امام خمینیؒ کا یہ سادہ اور صاف ستھرا برتاؤ اس انقلاب کی کامیابی میں بہت ہی مؤثر ثابت ہوا ہے۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی اور موجودہ دُنیا میں اسلامی تحریک کو وسعت بخشنے میں جن چیزوں نے مؤثر اور قابلِ توجہ کردار ادا کیا ان میں سے ایک امامؒ کی یہ خصوصیت بھی تھی کہ آپ نے عالی دماغ مفکرین اور علماء پر مشتمل اپنے شاگردوں کے ایک وسیع گروہ کی بڑی ہی اعلیٰ سطح پر تربیت کی تھی جنھوں نے دقیق طور پر امامؒ کی باتوں کو سمجھا اور آپ کی زندگی کے دوران آپ کے قوی و مستحکم بازو بنے رہے۔ حضرت امام خمینیؒ نے مفتی اروانیاس یا دیگر شخصیتوں کے برخلاف کہ جن کی تحریکیں خود ان کی ذاتوں سے وابستہ ہوکر رہ گئیں اور ان کی موت کے بعد کوئی ان کی راہ پر چلنے والا نہ رہا، علماء اور دانشوروں کی ایک توانا جماعت تربیت کردی تھی جن میں سے ہر ایک نے قوی بازو کی مانند تحریک کی حمایت کی اور انقلاب کی کامیابی، یہاں تک کہ آخری لمحۂ حیات تک امام خمینیؒ کے ساتھ رہے اور آپ کی رحلت کے بعد بھی آپ ہی کے نقش قدم پر آگے بڑھ رہے ہیں جنھوں نے حضرت امامؒ کی وفات کے بعد اس راہ میں کسی طرح کا خلل پیدا ہونے کی مہلت ہی نہیں دی۔ مجھے اُمید ہے کہ جس طرح اسلامی ملت نے اپنے مخلصانہ عمل سے اس انقلاب کو کامیابی تک پہنچایا ہے آئندہ بھی اس

اسلامی تحریک اور انقلاب کی حفاظت کریں گے اور ہم (انشاء اللہ) ساری دنیا میں کلمۃ اللہ اور شعائر اللہ کی بلندی و برتری کا نظارہ کریں گے۔

امام کی خصوصیات میں سے ایک بہت ہی روشن و تابناک خصوصیت، انقلاب اسلامی کی کامیابی کے پہلے اور بعد بھی، مختلف ملکوں میں زندگی بسر کرنے والے مظلوم وستم دیدہ مسلمانوں، خصوصاً فلسطینیوں کی بے دریغ حمایت تھی، باوجود اس کے کہ یہ حمایت ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد اس نوزائیدہ اسلامی حکومت کے حق میں بڑی مشکلات پیدا کرنے کا سبب بنی، اور باوجود اس کے کہ ان ممالک میں ظلم وستم کا شکار مسلمانوں کی اکثریت سنی المذہب تھی، پھر بھی امام خمینیؒ کی بے لوث حمایت بتاتی ہے کہ آپ عالم اسلام کے مسائل کے سلسلہ میں، چاہے وہ سنیوں سے مربوط ہوں یا شیعوں سے یکساں طور پر فکر کرتے تھے۔ اور یہی چیز ان ممالک کے لاکھوں مسلمانوں کے قلوب امام امت اور اسلامی انقلاب کے تحیس جذب ہوجانے کا باعث بنی ہے۔

یہ وہ خصوصیات اور امتیازی موارد تھے جو میری فکر میں آسکے ہیں۔ یقیناً بہت سے ایسے موارد ہیں جن تک ہماری فکری رسائی نہیں ہوسکی ہے۔ خداوند متعال سے اُمید ہے کہ وہ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے کہ حضرت امام قدس سرہٗ الشریف کے ارفع و اعلیٰ مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل کرسکیں اور "تمام اسلامی سرزمینوں سے غیروں کے تسلط کے خاتمے، اسلامی حکومت کی تشکیل اور نورِ اسلام سے پوری دنیا کے منور ہونے" کی راہ میں کوشاں رہیں اور دعا کرتا ہوں کہ دنیا کے تمام انقلابی اور حریت پسند افراد امام خمینی رضوان اللہ علیہ کے نشانِ قدم کو اپنا نصب العین قرار دیں اور آپ کے جانشین رہبرِ ملت اسلام ولی امر مسلمین آیۃ اللہ خامنہ ای، جو اس وقت امام کے نزدیک ترین ساتھیوں میں سے ہیں، کی اطاعت و پیروی کرتے ہوئے اسلام کے آخری اور اعلیٰ ترین ہدف تک رسائی حاصل کریں۔ انشاء اللہ!

❁❁❁

حجۃ الاسلام سیّد احمد خمینی طاب ثراہ

امام خمینیؒ کے افکار وعقائد کی روشنی میں وحدت واتحاد

امام خمینیؒ باطل طاقتوں کے خلاف کی جانے والی اپنی جدوجہد میں بھی لوگوں کو وحدت و اتحاد کی دعوت دیا کرتے تھے چنانچہ پچاس سال قبل انھوں نے اپنے تاریخی اور سب سے پہلے اہم بیان کی ابتداء قرآن مجید کی اس آیۂ کریمہ سے کی تھی: قُلْ اِنَّمَا اَعِظُکُمْ بِوَاحِدَۃٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَ فُرَادٰی اپنے اس اہم بیان میں انھوں نے امت اسلامیہ کی وحدت کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ الٰہی انقلاب کی کامیابی کے لیے امت اسلامیہ کے درمیان وحدت و اتحاد کا عملی وجود لازمی ہے۔

اپنی گرانقدر کتاب ''اسرار الصلوٰۃ'' میں ''علماء کے معنوی مقامات و مدارج'' کے ذیل میں پہلے تین مراتب کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ چوتھا اصحاب تحقق و باکمل اولیاء کا ہے جو محقق حالت میں اس مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں۔ ''قاب قوسین'' کی کثرت ان کے درمیان سے اُٹھ جاتی ہے جو اپنی ذاتی شناخت کو جماعت کی ذاتی شناخت میں ضم کردیتے ہیں۔ ہمیشہ باقی رہنے والے نور میں گم ہوجاتے ہیں، انفرادیت میں مضمحل اور غیب ہویت میں فنا ہوجاتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اصحاب صحو بعد المحو کو غیب شہادت سے کوئی حجاب نہیں ہوا کرتا بلکہ خود ان کا وجود حقانی وجود ہوتا ہے اور وہ دنیا کو حقانی وجود کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مَا رَاَیْتُ شَیْئاً اِلَّا وَ رَاَیْتُ اللّٰہَ قَبْلَہٗ وَ بَعْدَہٗ وَمَعَہٗ یعنی وہ لوگ ہر چیز سے پہلے، اس کے بعد اور اس کے ساتھ جلوۂ خداوندی کا مشاہدہ کرتے ہیں اور تمام ذاتی و اعمالی تجلیات ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہا کرتیں۔

عوام الناس کے استفادہ کے لیے لکھی گئی اپنی گرانقدر کتاب ''شرح چہل حدیث'' میں وحدتِ کلمہ کے تاریخی و اخلاقی مفہوم و ماہیت کا ذکر کرتے ہوئے امام خمینیؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ الٰہی شریعتیں اور عظیم الشان انبیائے کرامؑ، عظیم مقاصد کے حامل رہے ہیں۔ ان کی ذات عظیم مقاصد کی تکمیل و ترقی کا باعث اور مدینۂ فاضلہ کی تشکیل میں مدد و معاون رہی ہے لیکن ان کی بعثت کا ایک اہم مقصد توحید کلمہ و توحید عقیدہ، اہم مسائل و معاملات میں اجماع اور اہل ظلم کی ظالمانہ راہ و روش کی روک تھام رہا ہے تاکہ انسانی سماج کو مختلف انواع مفاسد سے محفوظ رکھتے ہوئے مدینۂ فاضلہ کو خرابی و بربادی سے بچایا جاسکے۔ لیکن اجتماعی اور انفرادی اصلاح پر مشتمل اس مقصدِ عظیم میں کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب افراد اور قوموں پر وحدت و اتحاد سایہ فگن ہو۔ ان کے درمیان اُلفت و اخوت، قلبی صداقت اور ظاہری و باطنی پاکیزگی موجود ہو اور معاشرہ کے افراد آپس میں اس طرح متحد ہوجائیں کہ آدم کی اولاد سے بھری ہوئی دُنیائے آدمیت ایک جسدِ واحد کے اعضاء کی حیثیت سے کام کرنے لگے اور ساری کوششوں کو ایک عظیم الٰہی اور عقلی مقصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جائے جس میں انفرادی اور اجتماعی دونوں مفاد و مصالح محفوظ ہیں۔ اگر کسی ایک گروہ یا جماعت کے درمیان ایسی محبت و اخوت پیدا ہوگئی تو وہ جماعت دوسری تمام جماعتوں پر یقیناً غلبہ و فضیلت حاصل کرلے گی۔ چنانچہ تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی جنگوں میں مجاہدین اسلام کی عظیم الشان کامیابیوں کا راز ان کے درمیان موجود یہی مثالی وحدت و اتحاد رہا ہے۔ مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ دوستی، میل جول اور حسن اخلاق، محبت، اخوت اور برادری و بھائی چارگی سے کام لیں اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جن چیزوں سے وحدت و اتحاد کے معنی و مفہوم کی تقویت ہوتی ہے وہ یقیناً مرغوب و پسندیدہ ہیں اور جو چیزیں اس میل جول اور بھائی چارہ کو توڑ کر معاشرہ میں تفرقہ و اختلاف کا باعث ہیں وہ یقیناً صاحبِ شریعت کے غیظ و غضب کا باعث اور اس کے عظیم مقصد کی مخالف ہیں اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ

معاشرہ میں ان تفرقہ انگیز مفاسد کی ترویج و اشاعت بغض و حسد و کینہ و عداوت کا باعث ہوں گی اور معاشرہ میں فساد کی جڑیں پہلے سے زیادہ مضبوط ہوجائیں گی اور لوگوں کے درمیان نفاق کا بول بالا ہوجائے گا۔ فقط یہی نہیں بلکہ معاشرہ میں وحدت و اتحاد کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا اور آخرکار دین کی بنیادیں متزلزل ہوجائیں گی۔

امام خمینیؒ وحدت کو خداوند عالم کی پہلی اور سب سے بڑی رحمت اور ابتدائی برکتِ الٰہی سے تعبیر کرتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ رحمت و برکتِ خداوندی کے بغیر وحدت حاصل نہ ہوگی چنانچہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم لوگوں کو اس بات کی بھرپور کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ ہمارے درمیان خداوند عالم کی اس رحمت و نعمت کو دوام حاصل رہے اور اس کوشش کی پہلی منزل یہ ہے کہ ہم لوگ الٰہی ہوجائیں، راہِ خدا میں ہر خدمت کے لیے ہمہ تن آمادہ رہیں اور اپنے آپ کو خداوند عالم کا مطیع و فرمانبردار بنالیں۔ خود کو اس سے وابستہ اور اسی کی بارگاہِ عالیہ میں پلٹ کر جانے والا سمجھتے رہیں۔ اگر ہم لوگ اس ابتدائی منزل پر ثابت قدم رہیں تو دوسرا مرحلہ یعنی مرحلۂ وحدت و اتحاد خود بخود طے ہوجائے گا کیونکہ تفرقہ و اختلاف شیطان کا کام ہے اور وحدت و اتحاد کا تعلق رحمٰن سے ہے۔

امام خمینیؒ اکثر فرمایا کرتے تھے:

> ''اگر جملہ انبیاء ایک وقت میں ایک جگہ پر جمع ہوجائیں تو ان کے درمیان کوئی جھگڑا اور اختلاف نہ ہوگا کیونکہ وہ لوگ اپنے نفس پر مسلط اور خداوند عالم کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔''

امام خمینیؒ اسلامی معاشرہ میں اس وحدت و اتحاد کے قائل تھے جو مستحکم اور مقدس بنیادوں پر قائم ہو، چنانچہ وہ کہا کرتے تھے:

> ''قرآن مجید کی تعلیمات پر مبنی اسلامی وحدت کے سایہ میں ہم لوگوں کو باہم متحد رہنا چاہیے۔ یہ کوئی اہم بات نہیں ہے کہ آپ لوگ کسی ایک مسئلہ و معاملہ میں متحد

رہیے اور تفرقہ و اختلاف پیدا نہ کیجیے بلکہ حکم خداوندی یہ ہے کہ سب لوگ 'اعتصام بحبل اللہ' کی پیروی کریں۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہ نہیں رہا کہ وہ لوگوں کو کسی ایک کام کے لیے متحد کردیں بلکہ ان کی آمد کا مقصد تمام لوگوں کو راہِ حق میں جمع کرنا اور ثابت قدم بنانا ہے۔"

اگر مجھ سے یہ سوال کریں کہ امام خمینیؒ کی نظر میں دشمنوں پر ملّتِ اسلامیہ کی کامیابی کا راز کیا تھا تو وہی جواب دوں گا جس پر انھوں نے اپنے متعدد بیانات نیز وصیت نامہ میں بڑی تاکید فرمائی ہے۔ یعنی حکم خداوندی وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعاً وَلَا تَفَرَّقُوا۔ اس سلسلے میں وہ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

"جب ہم لوگوں نے اس امر خداوندی پر مکمل اعتماد و وفاداری کے ساتھ عمل کیا تو ہم لوگ پوری طرح متحد ہوگئے۔ اندر، باہر، طالب علم اور دینی درسگاہوں کے طلاب، سب آپس میں متحد ہوگئے۔ سماج کے سبھی طبقے آپس میں متحد ہوگئے۔ اب اس اتحاد کے بعد آپ لوگ مطمئن رہیں کہ آپ کامیاب ہوگئے۔ کامیابی کی کنجی خود ملّت کے ہاتھ میں ہے۔ البتہ ملّتِ اسلامیہ کو اس بات کی طرف متوجہ رہنا چاہیے کہ کس چیز نے اسے کامیابی و سربلندی عطا کی اور یہ کوئی اور چیز نہیں بلکہ امّتِ اسلامیہ کے درمیان موجود مثالی وحدت و اتحاد تھا جس نے ہم لوگوں کو عظیم الشان کامیابی عطا کی اور "اعتصام بحبل اللہ" کی بدولت ہم سرفراز و سربلند ہوگئے۔"

امام خمینیؒ وحدت و اتحاد کو ہر فرد مسلمان کا شرعی اور مذہبی فریضہ سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں علماء و دانشوروں اور اسلامی علاقوں کے حاکموں کی ذمہ داری دوسروں سے کئی گنا زیادہ ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ ان کے اکثر خصوصی بیانات و اہم پیغامات اسی سلسلے میں صادر ہوتے رہے۔ ان کا اعتقاد و ایمان تھا کہ وحدت کی تشکیل و تقویت کے لیے ہم لوگوں کو

لازمی قیمت بھی ادا کرنی چاہیے چنانچہ وہ اس راہ میں بھی پیش قدم تھے لیکن یہ ایک فطری امر ہے کہ اس مختصر مقالے میں وحدت و اتحاد کے ہر پہلو پر امامِ امت کے ارشادات کا تجزیہ ممکن نہیں ہے۔

وحدت و اتحاد کے موضوع پر میں نے امام خمینیؒ کے ارشادات و ہدایات پر مشتمل ایک کتابچہ کا مطالعہ کیا تو اجمالی طور پر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ امام خمینیؒ کی نظر میں وحدت و اتحاد ایک انتہائی وسیع موضوع کا نام ہے جو مختلف پہلوؤں کا حامل ہے اور انھوں نے اسلامی انقلاب کی کامیابی سے قبل اور اس کے بعد ان تمام پہلوؤں کی شناخت و ترویج کے سلسلے میں بھرپور قدم اُٹھائے ہیں۔ ان کی دعوتِ اتحاد کا دائرہ فقط ایرانی قوم تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ وہ اکثر و بیشتر ساری دُنیا کے کمزور و پسماندہ لوگوں کو ظالموں اور استکباری جماعتوں کے خلاف متحد ہونے کی دعوت دیتے رہے۔ فقط اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے شرک و الحاد کے خلاف، ادیانِ الٰہی کی پیروی کرنے والوں کے درمیان وحدت و اتحاد پر زور دیا اور اسلامی دنیا پر حملہ آور اسلام دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے امت اسلامیہ کے درمیان اتحاد کو ان کی حفاظت کا اہم وسیلہ بتاتے رہے اور مذہب اسلام کی مختلف شاخوں مثلاً شیعہ و سنّی بھائیوں کے درمیان وحدت و اتحاد کو دنیائے اسلام کی سربلندی کا ذریعہ قرار دیا اور اصول و اقدار کی حفاظت کے دائرہ میں قوموں اور حکمراں جماعتوں کے درمیان وحدت و اتحاد کی بھی حمایت کی۔

ملک کی جغرافیائی سرحدوں کے اندر قومی اتحاد کے سلسلے میں امام خمینیؒ معاشرہ کے تمام طبقوں، جماعتوں اور گروہوں کے درمیان مستحکم وحدت و اتحاد کو کامیابی کی راہ میں پہلا قدم مانتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے خطبوں اور بیانوں میں دینی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں سے وابستہ لوگوں کے درمیان وحدت و اتحاد کو معاشرہ کے دیگر طبقوں کے درمیان اتحاد کا وسیلہ مانتے تھے۔ علمائے دین اور یونیورسٹیوں سے وابستہ افراد کے درمیان وحدت کے ساتھ ہی ساتھ وہ علماء اور عوام، افرادِ فہم و دانش اور عوام، انتظامی و فوجی جماعت اور عوام، حکومت اور پارلیمنٹ،

عدلیہ و انتظامیہ اور نفاذیہ اداروں کے درمیان، بحری، زمینی اور ہوائی افواج کے درمیان اور مختلف النوع قومی تنظیموں کے درمیان وحدت و اتحاد پر بہت زور دیا کرتے تھے اور نسلی، قومی اور جغرافیائی امتیازات کے سخت مخالف تھے۔ اس کے علاوہ امام خمینیؒ اپنی گرانقدر تصانیف میں، بیرونی اور اندرونی طاقتوں کے درمیان، سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان اور ملک کی جملہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی تنظیموں کے درمیان وحدت و اتحاد کے لیے کوشاں رہا کرتے تھے۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ مغرب ومشرق کی عظیم طاقتوں کے شرمناک ہتھکنڈوں کے مقابلے میں انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کا اہم راز یہ تھا کہ ایران کا بچہ بچہ امام خمینیؒ کے حکم کا پیرو بنا ہوا تھا۔

جس طرح امام خمینیؒ نے وحدت و اتحاد کی اہمیت وضرورت پر زور دیا ہے، اسی طرح رہبر انقلاب نے وحدت کے لوازم کی نشاندہی کی ہے کیونکہ وہ اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ مناسب وسازگار ماحول کے بغیر وحدت و اتحاد کی تشکیل ایک امر محال ہے اور اگر اتحاد قائم ہوگیا تو وہ مستحکم نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ وحدت و اتحاد کے عقیدتی اصولوں کا ذکر کرنے کے بعد، تشکیل وتحکیم وحدت کے لیے امام خمینیؒ نے جن بنیادی اسباب وعوامل اور لازمی عناصر کی طرف تفصیلی اشارہ کیا ہے، ان کا اجمالی تجزیہ حاضرِ خدمت ہے:

۱۔ غیر معمولی حد تک خودسازی کا اہتمام اور ذاتی وسماجی زندگی میں معنوی قدروں اور اعلیٰ اخلاقی معیاروں کی پیروی۔

۲۔ سلیقوں کے درمیان اختلاف کا تحمل، آزادیٔ فکر کا دفاع اور ایسی ثقافتی وسیاسی تشکیلات کی حمایت جس پر امت اسلامیہ کے درمیان اتفاق پایا جاتا ہے۔

۳۔ ناقابلِ حل سیاسی وسماجی مسائل ومشکلات کو حل کرنے میں وحدت و اتحاد کے معجزہ آفریں کردار کے سلسلے میں گہرا اعتقاد ومکمل اعتماد۔

۴۔ طرفین کے درمیان وحدت و اتحاد کے سلسلے میں رخنہ اندازی اور غلط فہمی پیدا

کرنے والوں کے سلسلے میں پوری توجہ اور ہوشیاری سے کام لینا اور عوام کو بھی ان تفرقہ انگیز عناصر کی کرتوتوں سے باخبر رکھنا۔

۵۔ وحدت و اتحاد کا بھرپور احترام کرتے ہوئے اصولی مواقف اور منطقی اقدار و معتقدات کا تحفظ۔

۶۔ دینی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں کے نظام اور طریقۂ تحقیق کے درمیان موجود بنیادی اختلافات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے معاشرہ کے بنیادی مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے مشترکہ زبان کا انتخاب اور اختلافات سے پرہیز۔

۷۔ مشترک پہلوؤں کی زیادہ سے زیادہ تلاش اور بنیادی باتوں میں نظریاتی اختلافات کو کم کرنے کی بھرپور کوشش۔ اس کام کے لیے فقط علمی مناظر و مباحثہ کی تشکیل اور عوام الناس کو ان علمی اور ثقافتی اختلافات سے دُور رکھنا نیز ان مسائل کو حل کرنے کے لیے فقط علمی اجتماعات اور مناسب و پسندیدہ عقلی راہ و روش کا استعمال کرنا۔

۸۔ توحیدی اور وحدت آمیز ثقافت کا اسلامی معاشروں میں احیاء اور مذہب اسلام کے مختلف عبادی، سیاسی اور سماجی احکام میں وحدت و اتحاد کے مظاہر اور نمونوں کی طرف ملّتِ اسلامیہ کو متوجہ کرنا مثلاً نمازِ جمعہ و جماعت اور حج جیسی عظیم اسلامی کانگریس کے فلسفہ پر محققانہ غور و فکر، مسلمانوں کو باہمی تعاون کی طرف راغب کرنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو تمام مسلمانوں کا ذاتی فریضہ قرار دیتے رہنا۔

۹۔ امت اسلامیہ سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو اسلام کے درمیان ماضی سے مطلع رکھتے ہوئے موجودہ صدی میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب سے بھی بخوبی آگاہ رکھنا۔

۱۰۔ اکثر اسلامی معاشروں پر مسلط مغربیت کی تردید اور خود اعتمادی کی ترویج و اشاعت کو بنیاد قرار دیتے ہوئے دنیائے اسلام کی ثقافتی تحریک کو وسعت و عالمی مقبولیت کے لیے لازمی جد وجہد کو جاری رکھنا۔

۱۱۔ حقیقی دشمنوں کی شناخت اور دشمن تراشی سے اجتناب و پرہیز۔

۱۲۔ وحدت و اتحاد کے دشمنوں کے خلاف یقینی کامیابی کے لیے جہاد و شہادت پسندی پر مشتمل ثقافت کی تبلیغ و ترویج۔

۱۳۔ ایسی خرافات پرستی اور تفرقہ انگیزی کی مکمل روک تھام جو ناواقف اور خودغرض عناصر کے ذریعہ دینی اور مذہبی رسومات کا جزو بن گئی ہیں اور لمبی مدت گزر جانے کی وجہ سے مسلمان قوموں اور قبیلوں کی روایتی ثقافت کا بنیادی رنگ و روپ اختیار کرچکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے درمیان موجود اندھے تعصب کو کم کرنے کی بھرپور کوشش۔

۱۴۔ وحدت و اتحاد کے منادیوں کے قول و عمل کے درمیان یکسانیت نیز وحدت کو اپنا نصب العین قرار دینے والی حکومت سے وابستہ افراد و حکام کے قول و فعل میں بھی یکسانیت کو برقرار رکھنا۔

اس یکسانیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر سماج کے قائد و مصلح کی جانب سے سکوت اختیار کرنے یا وحدت و حمایت برقرار رکھنے کا حکم دیا جائے تو معاشرہ کے تمام لوگ اس حکم کی پیروی کو اپنی مصلحت سمجھیں، چاہے اس حکم سے ان کی روایتی رسوم اور ان کے آداب و اخلاق کی خلاف ورزی ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ ہم لوگ اس یکسانیت کا امام خمینیؒ کی تحریک کے اُتار چڑھاؤ کے درمیان سینکڑوں بار مشاہدہ کرچکے ہیں۔

حضرت امام خمینیؒ نے مسلمانوں کے درمیان وحدت و اتحاد کو مستحکم بنانے کے لیے فلسطینی مظلوموں کے حقوق کی بھرپور حمایت کی کیونکہ اسلامی علاقوں میں امریکہ اور صیہونی حکومت کی وسعت پسندی کے خلاف مسلمانوں کا ایک مرکز اتحاد پر جمع ہونا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ رسول اکرمؐ کی شان میں بے ادبی و گستاخی پر مشتمل کتاب ''شیطانی آیات'' جیسی اسلام دشمن سازش کے خلاف اپنے مستحکم موقف سے پیغمبر اسلامؐ کے سلسلے میں مسلمانوں کے مقدس عشق کو پوری طرح نمایاں کردیا اور اس واقعہ کو امت اسلامیۂ عالم کے درمیان اتحاد کا

باعث بنا دیا اور پوری دنیائے اسلام میں بیداری کی لہر دوڑ گئی۔

جی ہاں! اسلامی انقلاب اور اس کی نعمتوں اور برکتوں نے ہم لوگوں پر حجت تمام کردی ہے۔ امام خمینیؒ کی کامیابیاں اور اس کی عالمی اسلامی تحریک قرآن کریم کی اس آیۂ شریفہ کی مصداق ہے: كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ حضرت امام خمینیؒ نے متعدد بار انتہائی سخت و مایوس کن حالات میں ہم لوگوں کو جدوجہد کرنا سکھایا اور بار بار ہم لوگوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرتے رہے کہ حق و باطل کے درمیان مقابلہ کے دوران ظاہری مادّی اسباب و وسائل کی کمی فیصلہ کن ثابت نہیں ہوا کرتی ہے بلکہ اس مقابلہ وصف آرائی میں جس چیز کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے وہ آگاہی و بیداری، اخلاص اورفریضہ کو پورا کرنے کا حوصلہ ہے۔لہٰذا اگر آج اسلامی معاشروں کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہے کہ ان کے مسائل ومصائب کا علاج اورموجودہ پسماندگی و بے سروسامانی سے نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی حقیقی اسلامی شناخت کو دوبارہ حاصل کرتے ہوئے امت واحدہ کی تشکیل میں ہمہ تن سرگرم ہوجائیں تو پھر اس مقصد کی تکمیل کے سلسلے میں ہم لوگوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی خوفزدہ و مایوس نہ ہونا چاہیے۔

آیئے! ہم لوگ اس مقدس جہاد میں پیش قدم ہوجائیں۔ یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ پیغمبرِ وحدت و رحمت کے ماننے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہر ممکن اسباب و وسائل سے مالامال اور غیر معمولی جغرافیائی حیثیت کی حامل ہوتے ہوئے بھی تفرقہ و اختلاف کی آگ میں جلتی رہے اور دین خدا و انسانیت کے دشمن امت اسلامیہ کی پراگندگی کا مذاق اُڑاتے رہیں اور اس امت کے سامنے فخر ومباہات کا مظاہرہ کریں جو صدیوں تک حقیقی انسانی تہذیب وتمدن کی علمبردار رہی اور آج جس کے سرمایہ کو یہ سامراجی طاقتیں دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی ہیں۔

آج خداوند عالم کی مقدس وگرانقدر کتاب ایک حرف کی کمی یا زیادتی کے بغیر، اسلامی فرقوں کے درمیان موجود ہے اور سنت وآئین پیغمبرِ اکرمؐ کو ہم لوگوں کے جملہ اعمال کے

لیے مشعلِ ہدایت کا درجہ حاصل ہے۔ ایک قبلہ، ایک کلمہ ونعرہ، ایک نماز ومناسکِ حج اور سینکڑوں دوسرے اسلامی شعار پر تمام اسلامی مذاہب کا یکساں اعتقاد و ایمان ہے اور امت اسلامیہ کے درمیان موجود یہ مثالی یکسانیت امت واحدہ کی تشکیل میں نہایت ممد ومعاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ امت اسلامیہ کے درمیان وحدت و اتحاد کے فقدان کے سلسلے میں عوام کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ یہ اسلامی علاقوں کے حکمرانوں، عالموں اور دانشوروں کا فریضہ ہے کہ وہ ایسے حالات میں اپنی ذمہ داری کو بخوبی انجام دیں۔

میں ان اسلامی حکومتوں کے سربراہوں کے سامنے، جو پڑوسی اسلامی حکومتوں کے ساتھ اخوت و برادری کا معاہدہ کرنے کے بجائے اسلام اور مسلمانوں سے عداوت رکھنے والی حکومتوں کے ساتھ معاہدۂ صلح سے اُمید لگائے ہوئے ہیں، ببانگ دہل یہ اعلان کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کا اندازہ غلط ہے اور آپ بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں کیونکہ آزمائے ہوئے کو بار بار آزمانا عقلمندی کی علامت نہیں ہے اور تلخ تجربات کی تکرار ہرگز مفید نہیں ہوا کرتی ہے۔

امریکہ اور اسرائیل، اسلام اور امت اسلامیہ کی مکمل نابودی اور تمام اسلامی علاقوں پر مکمل غلبہ وتسلط کے بغیر راضی ہونے والے نہیں ہیں۔ لہٰذا آیئے ان عنکبوتی اور پھسپھسے معاہدوں سے، جن کا بنیادی مقصد امریکی و اسرائیلی مفاد ومصالح کی حفاظت ہے، دل لگانے کے بجائے مستحکم اسلامی اخوت و برادری کے معاہدہ کو عملی شکل دینے کی کوشش کریں اور امت واحدہ کی یاد کو دوبارہ تازہ کردیں۔

وہ حکومتیں، جماعتیں اور افراد و اشخاص جو کتاب ومقالہ وفلم کی تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ و اختلاف کی آگ بھڑکانے میں ہمہ تن سرگرم ہیں اور دیگر اسلامی فرقوں کی پیروی کرنے والوں کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کرنے میں فخر محسوس کر رہے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنے اس عمل سے وہ اپنی موجودیت اور اپنے مفاد ومصالح کا دفاع کر رہے ہیں، وہ درحقیقت بہت بڑی بھول کا شکار ہیں کیونکہ دشمن ان میں سے کسی پر بھی

رحم نہ کرے گا اور اس معرکہ میں وہی لوگ فائدہ میں رہیں گے جو عالم اسلام کے درمیان وحدت و اتحاد کی تشکیل کے ذریعہ اسلام دشمن طاقتوں اور جماعتوں کی وسعت پسندی کی روک تھام کرنا چاہتے ہیں۔

میں امام خمینیؒ کی تاسی و پیروی کرتے ہوئے یہ اعلان کرتا ہوں کہ ایرانی عوام اور اسلامی جمہوری نظام کے تمام مسئولین ان سبھی مسلمان عوام اور اقوام، حکومتوں کے ساتھ معاہدۂ اخوت و برادری کے لیے اپنا ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں جو امت اسلامیہ کے مفاد و مصالح پر دشمنانِ دینِ خدا کے مفاد کو ترجیح نہیں دیتی ہیں۔ اسلامی جمہوریہ ایران کی حکومت اور امت اسلامیہ ایران وحدت و اتحادِ اسلامی کی راہ میں پیش قدمی کے لیے لازمی قیمت ادا کرنے کے لیے ہمہ تن آمادہ ہے۔

آخر کلام میں، میں ایک بار پھر خود اپنے آپ کو، آپ لوگوں کو اور مخلص و دلسوز مسلمانوں کو دنیائے اسلام کی خطرناک صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے اس نجات بخش الٰہی پیغام کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جس کی تعمیل و پیروی ہمارا مذہبی فریضہ اور ہماری نجات کا باعث ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوا ...... فانقذکم منہا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میر احمد جنبی

عیسیٰ مسیح سے متعلق

ہر بات ایک معجزہ تھی

۲۷ر دسمبر ۱۹۷۹ء کو چھ عیسائی پادریوں کے ایک وفد نے اسلامی انقلاب کے قائد عظیم الشان امام خمینیؒ سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے مشرقِ وسطیٰ کے تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر تھومس ایرکس نے ایرانی عوام کا ان کی مہمان نوازی کے لیے شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ تہران کے بہشت زہرا قبرستان میں مرحوم طالقانی اور ایرانی انقلاب کے شہیدوں پر فاتحہ خوانی کے لیے گئے۔ انھوں نے مزید کہا کہ انھوں نے خدا سے یہ دُعا کی کہ وہ موجودہ سنگین صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ان راستوں کی جانب ہماری رہنمائی کرے جن پر چل کر ہم مقابلہ آرائی کے بجائے باہمی تعلقات کو اہمیت دیں۔ خدائے تعالیٰ امن اور درگذر کردینے والے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے جبکہ انسان مائل بہ جنگ وتشدد ہے۔ اس کے جواب میں امام خمینیؒ نے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا:

دنیا کی تمام مظلوم اور عیسائی اقوام اور ہمارے عیسائی برادرانِ وطن کو کرسمس مبارک ہو۔ عیسیٰ مسیح علیہ السلام سے متعلق ہر بات ایک معجزہ تھی۔ ان کا ایک کنواری (مریمؑ) کے بطن سے پیدا ہونا ایک معجزہ تھا اور پیدا ہوتے ہی پالنے میں بول پڑنا بھی ایک معجزہ تھا۔ ان کا انسانیت کو امن، خوشحالی اور روحانیت سے سرفراز کرنا بھی ایک معجزہ تھا۔ تمام پیغمبران انسانیت کو سنوارنے کے لیے آئے تھے اور ان سب کا مقصد انسانیت کو صراط مستقیم پر گامزن کرنا اور سب کے لیے ایک پرامن، خوشحال اور اخوت و بھائی چارہ کا ماحول پیدا کرنا تھا۔

آج دنیا کو ان خطرناک شیطانی طاقتوں کا سامنا ہے جو پیغمبروںؑ کی تعلیمات کو حقیقی

رُوپ سے سمجھنے میں سدِ راہ بنی ہوئی ہیں۔ تمام بڑی طاقتیں یا تو عیسائی ہیں یا عیسائی ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں اس لیے عیسائی پادریوں پر خاص طور سے بہت سی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ یہ بڑی طاقتیں خدائے بزرگ و برتر کے احکامات کی تردید کرتی ہیں اور عیسیٰ مسیحؑ کی تعلیمات کے برخلاف عمل کرتی ہیں۔ عیسیٰ مسیحؑ اور خدائے عظیم کی تعلیمات کے مطابق عیسائی پادریوں کے کندھوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ پیغمبروں اور عیسیٰ مسیحؑ کے متعین کردہ راستوں سے منحرف طاقتوں کے خلاف جہاد کریں۔

آپ بہشت زہرا قبرستان گئے اور وہاں ہمارے شہیدوں میں سے کچھ کی قبریں دیکھیں۔ آپ ایران میں جہاں کہیں بھی جائیں گے اس قسم کی قبریں دیکھیں گے ابھی آپ نے ہمارے زخمیوں کو نہیں دیکھا۔ ایران میں ہر طرف آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو سابق حکومت کے دورِ اقتدار میں اپنے اعضاء سے محروم یا شدید طور پر زخمی کر دیئے گئے ہیں اور اب اس قابل نہیں ہیں کہ معمول کے مطابق یا ایک معیاری زندگی گذار سکیں۔ میری خواہش تھی کہ عیسائی پادری ایران میں کچھ روز مزید قیام کر سکتے اور مختلف شہروں، قصبات اور دیہات کا دورہ کرتے اور معزول شاہ، جس کو امریکی صدر کی پشت پناہی حاصل تھی، کے جرائم کے نتائج ملاحظہ فرماتے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ جائیں اور امریکی صدور کے ذریعہ ہم پر مسلط کردہ معزول شاہ کے مظالم کا جائزہ لیں۔

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے متوالے نوجوانوں کے ساتھ ان ظالموں نے اپنے زیرِ زمین تہہ خانوں میں کیسا بہیمانہ سلوک کیا۔ ہمارے جوانوں پر کیے گئے مظالم کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اس مختصر وقت میں ہم ان سب کا ذکر اختصار کے ساتھ بھی نہیں کر سکتے۔ اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ انھوں نے ہمارے بہت سے نوجوانوں کے اعضاء کاٹ ڈالے اور کتنوں کو ہی ناکارہ اور معذور کر دیا۔ یہاں تک کہ بہت سے والدین سے اقبالِ جرم کرانے کے لیے ان کے سامنے ان کے معصوموں کے اعضاء کاٹے گئے۔ انھوں نے ایسی ایسی ذلیل حرکتیں کیں

کہ جن کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ بڑی طاقتوں نے انھیں ایک مشن سونپا تھا جس کی انھیں اس ملک میں تکمیل کرنی تھی اور اسی مشن کی تکمیل کے سلسلہ میں انھوں نے یہ سب کچھ کیا۔ عیسائی پادریوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ عیسیٰ مسیحؑ کو اس حصار سے نکالیں جو ان کے صدور نے حضرت عیسیٰؑ کے گرد ڈال رکھا ہے۔ آج عیسیٰ مسیحؑ کی نظریں عیسائی پادریوں اور مفکرین پر لگی ہیں کہ یہ لوگ ان سنگدل لوگوں کے ساتھ کیا رویہ اپناتے ہیں۔

کیا آپ نے کبھی اپنے کلیساؤں میں اس قسم کے جرائم پر مباحثہ کیا ہے؟ کیا پوپ نے کبھی ان جرائم کو روکنے کے لیے کوئی اقدام کیا؟ کیا پوپ ہم پر اس لیے معترض ہیں کہ ہم غداروں کو یرغمال بنائے ہوئے ہیں؟ کیا پوپ کو معلوم ہے کہ ان لوگوں کی سرگرمیاں کس قسم کی تھیں؟ کیا کسی مظلوم قوم کو ہدفِ ملامت بنانا ایک مذہبی پیشوا کے شایانِ شان ہے؟ کیا خود کو عیسائیت سے منسوب کرنے والی حکومتوں کے شکنجے میں گرفتار قوم کو موردِ الزام ٹھہرانا منصفانہ فعل ہے؟ کیا کبھی کسی عیسائی پادری یا مذہبی پیشوا نے ایران میں سرزد ہوئے سنگدلانہ جرائم کے خلاف آواز بلند کی؟

حضرت عیسیٰ مسیحؑ کے یومِ ولادت کے موقع پر میں نے ایران میں سرزد ہوئے جرائم سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا لیکن ہمیں یہ جان کر ذہنی تکلیف ہوئی کہ پوپ نے ہمارے اس مضمون کی اشاعت کی اجازت نہیں دی۔ ایک عیسائی پیشوا کا ہمارے مظلوم عوام کے ساتھ یہ غیر منصفانہ رویہ کیوں ہے؟

حضرت عیسیٰ مسیحؑ کی انجیل کے پیروکار ہمیں موردِ الزام کیوں ٹھہراتے ہیں اور سنگدلانہ حرکات کے بارے میں جانبدارانہ رویہ کیوں اپناتے ہیں؟ کیا آپ اس بات سے ناواقف ہیں کہ ان ظالموں نے اس ملک کی دولت لوٹ کر ہماری قوم کو بھوک اور افلاس کے حوالے کردیا ہے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے پچاس سال تک اس قوم پر مظالم کئے اور ان کی دولت لوٹ کر بڑی طاقتوں کے حوالے کی؟ کیا عیسائی پیشوا اس بات سے ناواقف ہیں کہ

کارٹر نے تمام پیغمبروں اور عیسیٰ مسیح کی تعلیمات کی بیہودہ خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے ٹینکوں میں ایران کے اثاثوں کو منجمد کر دیا ہے؟ کیا آپ نے کبھی محسوس کیا کہ وہ کس طرح ایک مظلوم قوم کو دبانا چاہتے ہیں؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ کارٹر کی ہماری معاشی ناکہ بندی کرنے کی تجویز کا مقصد ساڑھے تین کروڑ عوام پر مشتمل قوم کو فاقہ زدگی کا شکار کر کے مار ڈالنا ہے؟

کیا پوپ ان تمام حقائق سے ناواقف ہیں یا ایرانی معاملات سے متعلق انھیں گمراہ کن اطلاعات فراہم کی گئی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو یہ ہمارے لیے عیسائی دنیا کے لیے اور خود عیسائی پیشوا کے لیے باعثِ شرم ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو یہ بات ویٹیکن (Vatican) کے لیے باعثِ رسوائی ہے۔ کیا یہاں آئے ہوئے آپ حضرات کو نہ چاہیے کہ آپ چشم دید واقعات کی جانب اپنے رہنماؤں کی توجہ مبذول کرائیں؟ کیا ویٹیکن کی نظروں میں آپ قابلِ اعتبار نہیں ہیں؟ کیا ویٹیکن صرف بڑی طاقتوں کی پیش کردہ رپورٹوں کو ہی تسلیم کرتا ہے؟

کیا آپ ہمارے خلاف امریکی ذرائع ابلاغ کی سرد جنگ سے واقف ہیں؟ کیا آپ نے اس حقیقت کو محسوس کیا ہے کہ تمام امریکی پروپیگنڈا مظلوموں کے مطالبات کے بالکل خلاف ہے؟ لیکن آپ کہتے ہیں کہ اس تمام گمراہ کن پروپیگنڈے کو روکنا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ تو آپ ہمیں بتائیں کہ قلم اور دیگر عملی ذرائع سے ہمارے خلاف زہر اُگلنے والوں کو روکنا یا ان کی اصلاح کرنا اگر پوپ کی ذمہ داری نہیں ہے تو پھر کس کی ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر زمین پر عیسائیت کی تبلیغ کون کرے گا؟ لوگوں کو مقدس انجیل کی تعلیمات سے آگاہ کرنا کس کی ذمہ داری ہے؟

ہماری پریشانیاں مختلف نوعیت کی ہیں اور بہت زیادہ ہیں لیکن مخالف تحریروں اور مظلوم قوم کے مصائب کی تفتیش کرنے کے لیے ہمارے پاس وقت کم ہے۔ میں آپ حضرات کے توسط سے امریکی قوم، امریکہ کے مذہبی پیشواؤں اور دیگر تمام پیشواؤں کو ایک پیغام بھیجنا

پسند کروں گا وہ یہ کہ آج کے دن میں تم سب کو عیسائیت اور مظلوم عوام کی بقا کے لیے پکارتا ہوں۔ آج مسیح اور مسیحیت اور خود پوپ کو ایک زبردست چیلنج کا سامنا ہے۔

اس مبارک اور پُراس دن پر امریکہ کے صدر نے ہر طرف جنگ کا ماحول پیدا کر رکھا ہے۔ وہ مظلوم عوام کو دبا رہا ہے اور عیسائی پیشوا خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔ خدا مظلوموں کو ظالموں کے شکنجے سے نجات دلائے اور انسانیت کو خدائی تعلیمات کی خلاف ورزی کرنے والوں کی بداعمالیوں سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

❁❁❁

ڈاکٹر شریف احمد
سابق اُستاد شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

بیسویں صدی کا ایک مردِ عارف

نہیں کہا جاسکتا کہ Pan-Islamism کی اصطلاح سب سے پہلے کس نے استعمال کی، لیکن اتنا وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ایک مردِخودآگاہ اورحریت پسند، جمال الدین اسدآبادی کے نام اور کام کے سلسلے میں یہ اصطلاح باربار استعمال ہوئی۔ اسدآبادی اپنی مراد کو نہ پہنچ سکے، لیکن انھوں نے اپنے متبعین کی ایک قطار ضرور پیدا کردی، جس کے نامور افراد، اپنی جان کا نذرانہ دے کر، ان کے پیغام کو ایک نسل کے بعد دوسری نسل تک، اور ایک ایشیائی غلام ملک کے بعد دوسرے ایشیائی غلام ملک تک پہنچاتے رہے۔ مغربی استعمار گہرا ہوتا رہا، زیادہ پھیلتا رہا۔ مشرق میں اس نے دو رنگ اختیار کیے۔ ایک مستقیم اور سیدھا، سیدھا سیاسی تسلط جیسے ہندوستان پر، دوسرا بالواسطہ سامراجی تسلط، جیسے ایران پر۔ اوّل الذکر میں ڈیڑھ سو، دو سو سال بعد آزادی کا حصول، پارلیمانی جمہوریت کی شکل میں، آخرالذکر میں شاہی (Monarchy) نظام کو، کمال عیاری کے ساتھ کٹھ پتلی کے طور پر صدیوں باقی رکھ کر، بقائے باہمی کا دھوکا دیا گیا۔ ہندوستان میں غلبہ حاصل کرنے کی کشمکش یوں تو کئی یوروپی طاقتوں میں رہی، لیکن برطانیہ اورفرانس اس میں پیش پیش تھے۔ ان میں بھی میدان برطانیہ کے ہاتھ رہا کیونکہ وہ چالاک تر تھا۔ ایران میں بھی ان طاقتوں کی سیاسی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے، لیکن ایرانی تہذیب وتمدن پر، فرانس کے اثرات شروع میں زیادہ گہرے رہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایک تیسرا زیادہ طاقتور ملک امریکہ سب سے بڑا شاطر بن کر اُبھرا--- ایسا نہیں ہے کہ ایران کی سرزمین سے فرانسیسی، برطانوی اور امریکی سامراجیت کو للکارنے والے پیدا نہیں ہوئے---نہیں! دسیوں، بیسیوں قائد اور رہنما پیدا

ہوئے، جن کا احترام بے حد ضروری ہے۔ لیکن بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ایران کی مٹی نے ایک ایسے سپوت کو جنم دیا جس نے ۱۹۷۹ء میں، نہ صرف ایران، پاس پڑوس کے ممالک، بلکہ ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ جس نے ''ڈھائی ہزار سالہ مطلق العنان شاہی بلکہ شہنشاہی'' کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا، اور اُس کی جگہ امن، انصاف، مساوات، احترامِ آدمیت پر مبنی اُس معاشرے کو اسوہ ونمونہ بنایا جو چودہ سو برس پہلے انسانیت کے محسن، پیغمبرِ اسلامؐ نے عرب میں پیش کیا تھا--- ایران کے اس محسن کو زمانے نے امام خمینیؒ کہہ کر یاد کیا۔

درحقیقت امام خمینیؒ کی شخصیت میں کوئی حیرت انگیز بات تو ضرور تھی جس نے دنیا کے نامور علماء وفقہاء، دانشوروں کو ان کی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔ جو مورخ اور مفکر، سیاست داں اور اہلِ نظر انھیں مختلف خصوصی صفات کے ساتھ یاد کرتے ہیں— انقلابی، حزبیت پسند، مذہبی مجاہد، تاریخ کا نباض، افراد اور جماعتوں کی نفسیات کا واقف کار، شاعر، ساحر اور مرد عارفان وتصوف وغیرہ وغیرہ۔ ایک ماہرِ خمینیات نے تو آسانی سے اس مردِ خود آگاہ کی شخصیت پر Thomas Carlyle کی Hero-Worship تک کا لیبل لگادیا ہے— سوال یہ ہے کہ پھر امام خمینیؒ کو کس نام سے یاد کیا جائے؟ آیئے، اُن کی زندگی کے اہم واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔ شاید اس سے کچھ معنی خیز اشارے مل سکیں۔

امامِ موصوف نے ۲۴ ستمبر ۱۹۰۲ء کو خمین نام کے ایک غیر معروف قصبے میں آنکھ کھولی۔ ان کا گھرانا علماء کا گھرانا تھا۔ صغرسنی ہی میں والد کا انتقال ہوگیا۔ آیت اللہ عبدالکریم کی دینی درسگاہ میں مذہب اور اخلاق کا رنگ گہرا چڑھ گیا۔ علم کی پیاس انھیں قم اور اراک جیسے مقامات پر لے گئی۔ اُنتیس سال تک پہنچتے پہنچتے، وہ علوم متداولہ کا مطالعہ کر چکے تھے— لیکن عمر کی اس منزل پر انھوں نے تاریخِ اسلام، قرآن پاک، بانیِ اسلام اور احادیث کا بھی بھرپور مطالعہ کیا۔ شہیدِ کربلا، ان کا خصوصی موضوع تھا— اسی سن وسال میں ایک زبردست تضاد اُن

کے سامنے آیا ___ اسلامی تاریخ اور کتاب و سنت نے انھیں حریت، آزادی، عدل و انصاف اور مساوات کی تعلیم دی، اور حکومتِ وقت نے شاہی، استحصال، ظلم و جبر، تشدد اور نا انصافی کے مناظر پیش کیے۔ علماء، اسلامی تاریخ کے ہر دور میں کم و بیش موجود رہے تھے، اور امام خمینیؒ کے زمانے میں بھی ان کی بڑی تعداد موجود تھی۔ لیکن اُن کی باریک بیں نظر نے ان میں دو طبقے دیکھے: ایک حالات سے سمجھوتا کرنے والا، عافیت کیش و مصلحت پسند، دوسرا ظلم و جبر کا مخالف۔ پہلا طبقہ تعداد میں بہت بڑا، دوسرا تعداد میں کم، بہت کم۔ اپنی افتادِ طبع اور عالی گہری نظر کے باعث امام خمینیؒ نے دوسرے طبقے سے اپنا رابطہ قائم کرلیا ___ اور اپنی مخصوص بصیرت کے باعث اس طبقے کے وہ پیشوا بن گئے۔ کسی بھی حکومتِ وقت نے اپنے مخالف کی پیشوائی کب قبول کی ہے؟ مقامی اور علاقائی حکام سے ٹکراؤ شروع ہوکر، یہ ٹکراؤ آریامہر رضا شاہ پہلوی تک جا پہنچا ___ حضرت خمینیؒ نے پہلے قید و بند کی مشقتیں جھیلیں، پھر جلاوطنی کی زندگی ترکی، عراق اور فرانس میں بسر کی۔ لیکن مقامِ حیرت ہے کہ ان سب مظالم کے باوجود ایران کے عام باشندوں کا احتجاج بڑھتا ہی گیا۔ خمینیؒ ہزاروں میل دور سے اپنے معتقدین کی رہنمائی کرتے رہے۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ رضا شاہ نے اپنی انسانیت کش خفیہ تنظیم ساواک کا Savak استعمال کیا۔ امریکہ نے اپنی سی آئی اے کا پورا زور لگادیا ___ لیکن بیسویں صدی کا ایک حیران کن انقلاب "انقلابِ اسلامی ایران" عالمی افق پر رونما ہوکر رہا۔ آریامہر کو راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ امریکہ کو اپنی سی آئی اے کی بے اثری پر سخت افسوس ہوا۔ امام خمینیؒ کے استقبال کے لیے پورا ایران اُمنڈ پڑا اور یوں امام مذکور نے لمبے عرصے تک ایشیا کے ایک بڑے اور اہم ملک کی سربراہی کی۔

شاہی حکومت کی مخالفت، عدم مساوات، ظلم و جبر کی شدت، مغربی راہ و روش کی پیروی مغربی، اسلامی روایات اور اخلاقیات سے دوری، ایسے عناصر نہیں ہیں، جن کی بنیاد امام خمینیؒ

کے کسی ذاتی نقصان، کینہ یا نفرت سے وابستہ کیا جاسکے — اس میں شک نہیں کہ جلاوطنی کی حالت میں امام کے بڑے بیٹے مصطفیٰ خمینی کا انتقال امام موصوف کے لیے بڑا زبردست صدمہ تھا اور بعض لوگوں نے اُسے حکومتِ وقت کی زہرخورانی کی سازش پر محمول بھی کیا۔ لیکن امام خمینیؒ موت و زیست کے فیصلوں کو الٰہی فیصلہ سمجھتے تھے، اس لیے اس سانحۂ ارتحال کو بھی وہ خندہ روئی سے برداشت کر گئے — اصل میں ہوش سنبھالنے سے لے کر اپنی آخری سانس تک وہ ایک مخصوص راستے پر چلتے ہوئے، ایک خاص نقطۂ نظر اور خاص فلسفے کو اختیار کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ خدا کے وجود اور اُس کی وحدانیت پر اُن کا یقین غیرمتزلزل تھا۔ رسالت، کتاب و سنت کی تعلیمات پر اُن کا عقیدہ اٹل تھا۔ امام حسینؑ کی شہادت نے انھیں کبھی نہ بھولنے والا درس دیا تھا۔ وہ شیعیت اور سنیت اور دوسرے مسلکوں کے اختلاف سے اوپر اُٹھ چکے تھے۔ وہ زندگی کو ایک امتحان سمجھتے تھے۔ خیر کی حمایت اور شر کی مخالفت وہ اپنی جانِ شیریں دے کر بھی کرسکتے تھے۔ اُن کے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہ تھا — مسندِ رُشد و ہدایت پر دوسروں کی طرح وہ بھی بیٹھتے تھے۔ منبر پر بیٹھ کر ہی تقریر وہ بھی کرتے تھے۔ مختلف موضوعات پر دوسروں ہی کی طرح خامہ فرسائی انھوں نے بھی کی ہے۔ اپنے پیروؤں اور عقیدت مندوں کو راستے انھوں نے بھی بجھائے ہیں — لیکن کوئی بات تو تھی کہ جس نے امام خمینیؒ کے کلام، تقریر و تحریر میں اور دوسروں کے کلام، تقریر و تحریر میں بڑا فرق پیدا کردیا تھا۔ غالبؔ کی زبان میں:

چاک مت کر جیب بے ایام گُل
کچھ اِدھر کا بھی اشارہ چاہیے

یہ ''اُدھر کا اشارہ'' ہی تھا، جس نے اُن میں اور دوسروں میں ''تفاوت'' پیدا کردیا تھا — اُن کی تقریر جیسے بادِ صبا کے دوش پر اُڑتی تھی۔ اُن کی تحریر پڑھنے والوں کی آنکھوں کا سرمہ بن جاتی تھی۔ اُن کے ٹیپ دست بہ دست، شہروں شہروں اور قریوں قریوں سفر کرتے

تھے۔

شاہ اور اُس کے متوسلین کا مقابلہ، Savak اور شاہ ہی کے الفاظ میں اُس کی فوجِ ظفر موج (جس کو وہ بیسٹ فائٹنگ مشین آف ایشیا (Best Fighting Machine of Asia کہا کرتا تھا) سے پنجہ نرم کرنا اور پھر سی آئی اے کی طاغوتی چالوں کو بے اثر کر دینا کوئی بازیچۂ اطفال نہ تھا۔ اور سب سے آخر میں لیکن سب سے اہم یہ کہ انقلاب کے بعد خانہ جنگی سے بچنا، مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ میں ایک نئی رُوح پھونک دینا عراق کے ڈکٹیٹر صدام کی عملی طویل اور ظالمانہ جنگ میں فتح یاب ہونا غیر معمولی بلکہ محیر العقول کام ہیں۔ یہ سب کچھ ''اُدھر کا بھی اشارہ'' نہیں تو کیا ہے؟

ایسا مشارٌ الیہ ہی امریکہ کو ''شیطانِ کبیر'' اور رُوس کو ''شیطانِ عظیم'' کہہ سکتا ہے — اور گرباچوف کو تعلیماتِ اسلامی پر مبنی خط لکھ سکتا ہے۔

غرض یہ کہ حالات اور واقعات کے اس چوکھٹے میں امامِ موصوف کو بہت سے ناموں سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان سطور کے راقم کو انھیں مردِ عارف کے نام سے یاد کرنا کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ صوفی سے زیادہ حاوی ہے — انگریزی کے بڑے لغات، دیگر مفاہیم کے ساتھ اس کا ایک مفہوم یہ بھی بتاتے ہیں:

"A man having a hidden relation with God"

یہ حضرت امام خمینیؒ کی سولہویں برسی ہے — آج ایران پھر مغربی ممالک کی بجلیوں کی زد میں ہے۔ دُنیا کی نگاہیں ایران پر لگی ہوئی ہیں۔ اگر ایران کے صاحبانِ اقتدار خمینیؒ موصوف کی تعلیمات کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھیں، تو یقینِ واثق ہے کہ وہ اس آزمائش میں بھی کھرے اُتریں گے۔

❁❁❁

ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی

آیت اللہ امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ

ایک عرفانی شاعر

پیرم ولی بگوشہ چشمی جوان شوم
لطفی کہ از سراچہ آفاق بگذرم

پیری میں جوانی کا جوش و ولولہ رکھنے والے آیت اللہ سیّد روح اللہ خمینیؒ کی ابتدائی تعلیم کے بعد فلسفہ، منطق، کلام، اصول، فقہ، حدیث، تفسیر، ادب وغیرہ کی تعلیم حاصل کر کے ۱۸ سال کی عمر میں ہی آیت اللہ عبدالکریم حائری یزدی، آیت اللہ میر سیّد علی یثربی کاشانی، آیت اللہ شیخ محمد رضا نجفی اور آیت اللہ شیخ ابو القاسم کبیر جیسے جید علماء کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور بہت جلد اجتہاد کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوگئے۔ نیز حوزۂ علمیہ قم میں فلسفہ کا درس دینا شروع کیا اور کچھ دن بعد فلسفہ کے ساتھ ساتھ ہفتہ میں ایک دن درس اخلاق و عرفان بھی شروع کردیا۔ اس کا چرچا ایران میں ہر چہار جانب ہونے لگا۔ نتیجتاً آیت اللہ خمینیؒ نے شائقین کی کثرت نیز درس اخلاق و عرفان کی افادیت و اہمیت کے مدنظر درس کو ہفتہ میں دو دن کردیا۔ اس درس میں عوام کی دلچسپی سے پہلوی حکومت خوفزدہ ہوئی جس کی بنا پر حکومت نے اس درس کو ختم کرنے کی ناکام کوشش بھی کی، لیکن اس وقت تک آیت اللہ خمینیؒ کے بصیرت افروز بیان سے بہت سے شاگرد ایسے تیار ہو چکے تھے جو ظلم و جور، قید و جلاوطنی سے نہیں ڈرتے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے دار کی طرف بڑھنے اور دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

بہرحال ایک طرف ان افراد نے آیت اللہ خمینیؒ کی اخلاقی و عرفانی تقاریر سے متاثر

ہوکر ایران کی ظالم و جابر اور غیر اسلامی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کردیا اور دوسری طرف آیت اللہ خمینیؒ شاہی حکومت کے ظلم کا نشانہ بن کر قید وجلاوطنی کی زندگی گزارنے لگے پھر بھی آیت اللہ خمینیؒ ایران کی شاہی حکومت کے خلاف سخت بیانات جاری کرتے رہے اور عوامی تحریک زور پکڑتی رہی، جس کی وجہ سے ایران کی صدیوں پرانی شہنشاہیت کا تختہ پلٹا اور جمہوری اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ آیت اللہ خمینیؒ نے اسی جمہوری اسلامی ایران کی دس بہاریں دیکھ کر ۲۸ شوال ۱۴۰۹ھ- ۳ جون ۱۹۸۹ء کو انتقال کیا۔

آیت اللہ خمینیؒ صرف ایک انقلابی یا مذہبی رہنما یا مدرس ہی نہیں بلکہ محقق و مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ عرفانی شاعر بھی تھے۔ سیّد مرتضیٰ حسین فاضل نے اپنی کتاب ''آیت اللہ خمینیؒ قم سے قم تک'' میں آیت اللہ خمینیؒ کی ۲۶ کتابوں کے نام درج کیے ہیں، جس میں مصباح الہدایہ، تحریر الوسیلہ، ولایت فقیہ، جہادِ اکبر، معراج السالکین، تہذیب الاصول، توضیح المسائل عربی اور فارسی کتابیں شامل ہیں۔

آخر عمر میں آیت اللہ خمینیؒ نے اپنی بہو فاطمہ طباطبائی کے اصرار پر کچھ غزلیں کہی تھیں جنھیں ان کے فرزند سیّد احمد خمینی نے ''سبوی عشق'' کے نام سے علامہ خمینیؒ کے چہلم کے موقع پر شائع کیا۔ سیّد احمد خمینی لکھتے ہیں:

> ''اما، اکنون کہ در غم ہجرانت می سوزم، غزل ہاے از مجموعہ اشارت را کہ بہ اصرار ہمسرم، فاطمہ طباطبائی در سال ہای اخیر سرودہ ای بہ تشنگانِ زلالِ کوثرِ ہدایت و عرفانیت تقدیم می نمایم۔''

مذکورہ مجموعہ میں آیت اللہ خمینیؒ کی ۱۳۶۵ش ھ-۱۹۸۶ء سے ۱۳۶۸ ش ھ -۱۹۸۹ء کے درمیان کہی ہوئی عرفانی غزلوں کو خلوتِ مستان، مستی عاشق، محفل زندان، غمزۂ دوست، چشم بیمار، دریائے فنا، جامہ درآن اور حسن ختام عنوان کے تحت پیش کیا گیا ہے۔

ان کی غزلوں کے اشعار لفظی و معنوی خوبیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ انھوں نے

اپنی غزلوں میں عشقِ الٰہی کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ یوں تو عشق ہر فرد کے لیے لازمی ہے۔ چاہے وہ عشقِ مجازی ہو یا حقیقی۔ عشقِ مجازی صرف حسن ''صورت'' سے وابستہ ہے اور عشقِ حقیقی حسن ''وجہ'' سے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے جس کے لیے قرآن میں ملتا ہے:

"وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ" (سورۂ رحمٰن، آیت ۲۷)

حقیقت یہ ہے کہ عشقِ حقیقی میں انسان اپنے کو بھول جاتا ہے۔ وہ دنیا میں ہر کام خدا کے لیے کرتا ہے۔ اس کی موت وحیات، خوشی وغم، سب کچھ خدا کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے ہی عاشق صادق کے لیے شاعر نے کہا ہے:

میں تو جیتا ہوں کہ دنیا میں ترا نام رہے
یہ بھی ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

یہی خدا کے لیے زندگی بسر کرنا اور اس کو وحدہٗ لاشریک ماننا زندگی کا اصل مقصد ہے۔

علامہ شبلیؒ بھی عشقِ الٰہی میں سرشار شخص کو زمانے میں عاقل تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ عشقِ الٰہی میں سرشار ہوکر اس قدر بے خود ہوجاتا ہے کہ اس کے دل و دماغ سے دنیا کے تفکرات محو ہوجاتے ہیں اور وہ اپنی ظاہری ہستی ختم کر کے فنا فی اللہ ہوجاتا ہے اور جو عارف کامل فنا فی اللہ ہوتا ہے اسی کو بقائے دائمی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی نظر میں جو شخص عاشقِ الٰہی نہیں وہ عاقل نہیں:

دل کہ آشفتۂ روی تو نباشد دل نیست — آن کہ دیوانہ خال تو نشد عاقل نیست
مستی عاشق دلباختہ از بادۂ تست — بجز این مستیم از عمر دگر حاصل نیست
عشقِ روی تو در این بادیہ افگند مرا — چہ توان کرد کہ این بادیہ را ساحل نیست

ان کی نظر میں اگر انسان عشقِ الٰہی میں سرشار ہوئے بغیر اپنی ساری زندگی گزار دیتا ہے تو اس کی اس زندگی کا کچھ حاصل نہیں۔ اور پھر انسان کے پاس اپنا کیا ہے؟ جو

کچھ ہے وہ حسن و عشق اور محبت کا جذبہ اللہ کا دیا ہوا ہے لیکن خدا نے عشق کا یہ جذبہ انسان کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں دیا۔ اور انسانوں میں بھی ان انسانوں کو عشقِ الٰہی کا بار سونپا جو عشق و عشرت کے دلدادہ نہیں بلکہ تمام اسباب راحت و آرام کو ختم کر کے اپنے کو رنج و غم میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی عاشق صادق، محبوب حقیقی کے دیدار کے لیے ساری دنیا میں سرگرداں اور پریشاں پھرا کرتے ہیں۔ علامہ خمینیؒ کے مذکورہ شعر سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ عشقِ حقیقی کے ذریعہ اس جنگل (بادیہ) میں پہنچ گئے ہیں جس کا کوئی ساحل نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ تلاشِ یار میں ہر میکدے، بتکدے، مسجد اور دیر کے بھی چکر لگائے نیز سجدے کیے کہ شاید محبوب حقیقی کا دیدار ہو جائے لیکن ہر جگہ سے مایوس ہی لوٹنا پڑا۔

ہر در میکدہ و بتکدہ و مسجد و دیر
سجدہ آرم کہ تو شاید نظری بنمائی

مذکورہ شعر سے علامہ خمینیؒ کی وسیع المشربی کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی وہ یہ ثابت کر دینا چاہتے ہیں کہ مسجد، دیر، بتکدہ، میکدہ ہر جگہ صرف ایک عمل انجام دیا جاتا ہے اور وہ ہے تلاشِ حق۔ تلاشِ حق کے لیے شرابِ عشقِ الٰہی کا پینا لازمی ہے، جس کو وہی پی سکتا ہے جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ شرابِ عشق پینے کے بعد انسان غم و الم اور تفکرات کو بھلا کر دل و جان میں تازگی محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے علامہ خمینیؒ کہتے ہیں:

من خواستار جام می از دست دلبرم
این راز با کہ گویم و این غم کجا برم

یعنی آیت اللہ خمینیؒ محبوب کے ہاتھوں سے شراب چاہتے ہیں، لیکن یہ راز دنیا کے کسی دوسرے فرد سے نہیں بتائے، کیونکہ سب ہی خاص طور سے ظاہر پرست شریعت کی آڑ میں طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں اور وہی حال ہوتا ہے جو منصور کا ہوا، لیکن دوسری غزل میں آیت اللہ خمینیؒ اسی

پوشیدہ راز کو افشا کرتے ہوئے کہتے ہیں:

من بخال لبت ای دوست گرفتار شدم — چشم بیمار تو را دیدم و بیمار شدم
فارغ از خود شدم و کوس انا الحق بزدم — ہمچو منصور خریدار سر دار شدم

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ:

بگذارید کہ از بتکدہ یادی بکنم — من کہ با دست بت میکدہ بیدار شدم

لیکن پھر بھی شہر کا واعظ اپنے پند و نصیحت سے آزار پہنچاتا رہتا ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ عاشق صادق اپنا دل کھول کر ایک مصیبت میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اس مصیبت کو بھلانے میں شراب ہی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

واعظ شہر کو از پند خود آرامم داد — از دم رند می آلودہ مددگار شدم

اسی لیے آیت اللہ خمینیؒ اسی غزل میں کہتے ہیں:

در میخانہ گشائید برویم شب و روز — کہ من از مسجد و از مدرسہ بیزار شدم

مسجد و مدرسہ سے بیزار ہونے کی وجہ ایک دوسری غزل سے معلوم ہوتی ہے:

در مدرسہ از دوست نخواندیم کتابی — در ما ذنہ از یار ندیدیم صدائی

اور ایک غزل میں مسجد و مدرسہ سے بیزار ہونے کے بعد شرابِ عشقِ الٰہی کے لیے یہاں تک کہتے ہیں کہ:

الایا ایہا الساقی زمی پرساز جامم را — کہ از جانم فروریز و ہوای ننگ و نامم را
از آن می ریز در جامم کہ جانم را فنا سازد — برون سازد زہستی ہستہ نیرنگ و دامم را

مذکورہ اشعار میں غالباً ساقی سے مراد خالقِ کائنات، مئے سے مراد عشق و محبت اور جام سے مراد قلب ہے۔ دراصل سب سے بڑا ساقی وہی عزوجل ہے جو اپنے نیک بندوں کو طاہر شراب پلاتا ہے جس کے لیے قرآن میں ہے:

وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا" (سورۂ دہر، آیت ۲۱)

گویا خالقِ کائنات ہی مجھے عشق و محبت کی ایسی شراب پلاسکتا ہے جس کے ذریعہ میں اپنی دلی خواہشات کو ترک کر کے اس ہستی سے آزاد اور ہستی مطلق (خدا) سے ملحق ہوسکتا ہوں اور ہستی مطلق سے مل جانا ہی حیاتِ دائمی کو حاصل کرلینا ہے۔ شاید اسی لیے آیت اللہ خمینیؒ یہ تمنا کرتے ہیں:

کاش روزے بسر کوی تو ام منزل بود　　کہ در آن شادی و اندوہ مراد دل بود

یا:

آید آن روز کہ خاک سر کویش باشم　　ترک جان کردہ و آشفتہ رویش باشم

اور:

جز سرکوی تو ای دوست ندارم جائی　　در سرم نیست بجز خاک درت سودائی

گویا اس منزل تک پہنچنے کی اس قدر آرزو ہے کہ اگر اس سلسلے میں جان بھی چلی جائے یعنی تیرے در کی خاک بھی بن جاؤں تو مضائقہ نہیں کیونکہ ایک پروانہ شمع کے قریب ہونے کے لیے اپنی جان کو نثار کردیتا ہے۔ علامہ کہتے ہیں:

جان باختم بحسرت دیدار روی دوست　　پروانہ دور شمعم و اسپند آذرم

مذکورہ شعر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علامہ خمینیؒ ہستی مطلق سے ملحق ہونے کے لیے اپنی جان کو اسی طرح نثار کردینا مناسب سمجھتے ہیں جس طرح ایک پروانہ شمع پر نثار ہوکر اسپند کا کام انجام دیتا ہے۔

علامہ خمینیؒ کے بعض اشعار سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ریاکار اور ظاہر پرست عالم کے ظاہری لباس سے سخت نالاں تھے کیونکہ وہ اس ظاہری لباس کی آڑ میں سیدھے سادے لوگوں کو فریب دینے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ان کی نظر میں ظاہری لباس جاہلوں کا لباس ہے اور وہ خود ایسے لباس سے آزاد ہونے کی دعا کرتے ہیں:

دست من گیر و از این خرقہ سالوس رہان　　کہ در این خرقہ بجز جا یگہ جاہل نیست

یعنی کہ خدا! میرے ہاتھ کو پکڑ کر اس ظاہری لباس سے آزادی دلا دے، کیونکہ یہ لباس تو

جاہلوں کا لباس ہے جس سے خود بینی اور خودنمائی ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت ریا کاری کا جامہ ہے۔ اس کو پہننے والے کا باطن کچھ اور ہوتا ہے اور ظاہر کچھ اور۔ اسی لیے وہ ظاہری زہد و ریا کے لباس کو اُتار کر پیرِ خراباتی بننا پسند کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

جامۂ زہد و ریا کندم و بر تن کردم　　خرقۂ پیر خراباتی و ہشیار شدم

یعنی پیرِ خراباتی کا لباس پہننے کے بعد انسان ہوشیار ہوکر حوزۂ عرفان میں داخل ہوجاتا ہے جس کے لیے آیت اللہ خمینیؒ کہتے ہیں کہ علم و عرفان تک پہنچنے کا راستہ خرابات کے علاوہ کچھ نہیں:

علم و عرفان بخرابات ندارد راہی　　کہ بمزلگہ عشاق رہ باطل نیست

اور جب انسان حوزۂ عرفان میں داخل ہوجاتا ہے تو:

چون بعشق آمدم از حوزۂ عرفان دیدم　　آنچہ خواندیم و شنیدیم ہمہ باطل بود

مختصر یہ کہ انھوں نے مے، جام، میکدہ، بتکدہ، زہد، ریا، دیر، مسجد، مدرسہ، خرقہ، سالوس، پیر وغیرہ کا استعمال روایتی انداز میں کیا ہے، جن کے مطالب و مفاہیم کو صوفیانہ اصطلاحات کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں تلاشِ حق کے لیے فنا فی اللہ ہونے، زہد و ریا کا ظاہری لباس اُتارنے اور ترکِ خود پرستی کرنے پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ علامہ کا یہ پیغام کسی خاص فرقہ، مسلک، مکتبِ فکر، خطہ یا عہد سے متعلق نہیں بلکہ عوامی پیغام ہے جو اپنی وسعتوں میں ہر دور کو سمیٹے ہوئے ہے جس کی وجہ سے کلام میں، علم و عرفان کی خاص رنگینی اور چاشنی ملتی ہے۔ اسی لیے علامہ خمینیؒ کو بیسویں صدی کا مصلح اور صوفی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے جو اپنی آخری منزل پر بھی پیرِ صومعہ کو یہ پیغام دیتے ہوئے جاتا ہے:

بساغر ختم کردم این عدم اندر عدم نامہ
بہ پیر صومعہ برگو ببین حسن ختام را

❁❁❁

محمد ظفر الحسینی

نغمۂ معرفت

حضرت امام خمینی قدس سرہٗ کی عارفانہ غزل کا منظوم ترجمہ

خالِ لب کا ترے ہمدم ! میں گرفتار ہوا
چشمِ بیمار جو دیکھی ، ترا بیمار ہوا

خود سے بیخود ہوا اور سازِ انا الحق چھیڑا
مثلِ منصور خریدار سرِ دار ہوا

غمِ جاناں نے کی دل میں وہ شرر افشانی
اس قدر تڑپا کہ چرچا سرِ بازار ہوا

روز و شب کھول رکھو مجھ پہ درِ مے خانہ!
مسجد و مدرسہ دونوں سے میں بیزار ہوا

جامۂ زہد و ریا تن سے اُتارا میں نے
کھو کے دُنیائے خرابات میں ہشیار ہوا

مجھ پہ دل کھول کے ناصح نے مصائب توڑے
آخرش رندِ بلا نوش مددگار ہوا

مجھے بت خانے کی کچھ یاد تو کر لینے دو
میں بہ اعجازِ بتاں خواب سے بیدار ہوا

❁❁❁

محمد حسن رجبی

اسلامی انقلاب سے قبل ایران کا سیاسی ماحول اور امام خمینیؒ (۱۹۴۱ء سے ۱۹۶۱ تک)

ایران سے رضا خاں کے فرار کے بعد پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایرانی عوام کے لیے ظالم وجلاّد صفت بادشاہ کا زوال ایک بڑی بات تھی۔ اگرچہ ظلم و استبداد کی جڑیں اپنی جگہ پر موجود تھیں البتہ اس کا ظاہری رنگ و روپ بدل گیا تھا اور ایران کا وہی حال تھا جو ۱۸۷۰ء میں نپولین سوم کے زوال کے بعد جرمنی کا ہوا تھا۔ دونوں صورتِ حال میں ظالم حکمرانوں کے زوال کے بعد ملک کے اقتدار کی باگ ڈور بیگانہ طاقتوں کے ہاتھ میں چلی گئی لیکن دونوں کے عوام محض اس لیے خوش تھے کہ انھیں ظالم حکمراں کے شر سے نجات حاصل ہوگئی۔(۱) اس خوشی کا یہ عالم تھا کہ ان لوگوں نے دوسری غاصب طاقت کی موجودگی کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور ایک لمبی مدت تک اس غاصبانہ طاقت کے خلاف کوئی آواز بھی نہ اُبھری۔

ملک کے نئے وزیر اعظم محمد علی فروغی نے بالکل اسی طرح جیسے سولہ سال قبل اپنی مخصوص تقریر کے ذریعہ رضا خاں کی حکومت کو سرکاری حیثیت سے تسلیم کروانے میں کلیدی کردار انجام دیا تھا، اس بار پھر اپنی سرگرمیاں تیز کردیں اور امریکہ، برطانیہ اور سوویت یونین کے خفیہ معاہدہ اور محمد رضا (۲) کی حکومت کے سلسلے میں ان تینوں ملکوں کی موافقت و رضامندی کے ساتھ محمد علی فروغی نے پارلیمنٹ کے اجلاس میں رضا خاں کا استعفیٰ پڑھ کر سنایا اور

اس کے فوراً بعد نئے بادشاہ محمد رضا کی داخلی سیاست کا اجمالی خاکہ خود اس کی زبان میں پیش کردیا۔ محمد علی فروغی نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ نیا بادشاہ ملک کے آئین کے مطابق حکومت کرے گا۔ اور سابقہ حکومت کے دوران کیے گئے مظالم کے سلسلے میں لازمی تحقیق کی جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ایرانی عوام اپنے لباس کے انتخاب اور اپنے مذہبی فرائض کو انجام دینے کے لیے پوری طرح آزاد ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ سابقہ حکومت کے دوران ظلم کرنے والوں کے خلاف قانونی کاروائی کی جائے گی اور مجرموں کو مناسب سزا دی جائے گی۔(۳)

رضا خاں کی غلامی میں لگے ہوئے افسران، مسلط کردہ سفارشی اراکین پارلیمنٹ (۴) اور برطانیہ کے مقرر کردہ اعلیٰ ایرانی حکام (۵) دیکھتے ہی دیکھتے آزادی طلب اور انقلابی بن گئے اور سابقہ دورِ حکومت کے ظالمانہ کاناموں کی مذمت کرتے ہوئے نئے بادشاہ اور فروغی حکومت کی شان میں قصیدہ پڑھنے لگے۔ اس مکر فریب کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ نئی حکومت ایرانی عوام کے غیظ وغضب سے محفوظ رہے، نئی حکومت کو عوام کا اعتماد حاصل ہوجائے اور سابقہ شاہی نظامِ حکومت پوری طرح درہم برہم نہ ہونے پائے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ سیاسی قیدیوں کو آزاد کردیا گیا۔ مذہبی اجتماعات اور دوسری تمام تقریبات کے سلسلے میں پوری چھوٹ دے دی گئی۔ اخبار اور کتابوں کی اشاعت پر لگائی گئی پابندی ختم کردی گئی اور ایرانی عوام کو اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی حاصل ہوگئی۔ لوگ اپنے گھروں اور عمومی جلسوں کے درمیان اپنے نظریات کا اعلان کرسکتے تھے۔ اور اب انھیں اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ کوئی ان کے خلاف جاسوسی کر رہا ہوگا۔ ایرانی خواتین اسلامی حجاب کے ساتھ شہر کی سڑکوں اور بازاروں میں آنے جانے کے لیے پوری طرح آزاد تھیں۔ سابقہ حکومت کے دوران شاہ اور اس کے افسروں نے جن کسانوں اور زمینداروں کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا، وہ عدالت کے سامنے لازمی اسناد و مدارک پیش کر کے اپنی زمین دوبارہ

حاصل کرسکتے تھے۔ بعض وہ افراد جن پر زیادہ مظالم کیے گئے تھے یا جن کے رشتہ داروں کو قید خانہ میں قتل کردیا گیا تھا، وہ مجرم افسروں کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کے لیے آزاد ہوگئے۔ سابقہ دورِ حکومت کے کچھ شناختہ شدہ قاتلوں مثلاً قید خانہ میں قیدیوں کو زہریلے انجکشن کے ذریعہ ہلاک کرنے والے ڈاکٹر احمدی جیسے لوگوں کے خلاف اعلانیہ مقدمہ چلایا گیا اور انھیں پھانسی کی سزا دی گئی۔ اسی طرح سابقہ حکومت کے پولیس چیف مختاری کو بھی گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد اسے قید خانہ سے رہا کردیا گیا۔ اس سلسلے میں خود محمد رضا شاہ نے مداخلت کی اور اپنے ذاتی بجٹ سے اس کے لیے وظیفہ بھی مقرر کیا۔(۶) مختصر یہ کہ معدودے چند افراد کے علاوہ سابقہ حکومت کے ظالم افسروں کے خلاف کوئی مؤثر قدم نہ اُٹھایا گیا اور انھیں کسی طرح کی کوئی سزا نہ دی گئی بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی دولت وثروت اور خصوصی اختیار و اقتدار کے مالک بنے رہے اور ان میں سے کچھ لوگوں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فوراً ہی اپنا چہرہ بدل لیا اور موجودہ حکومت میں بھی خصوصی ظالموں کی حمایت و طرفداری سے عوام ہرگز راضی نہ تھے لیکن اس کٹھ پتلی حکومت سے اور کیا امید کی جاسکتی تھی۔ درحقیقت اگر عوام میں پھیلی ہوئی ناراضگی اور ان کے غم وغصہ کو کم کرنا مقصود نہ ہوتا تو وہ دو تین ظالموں کے خلاف بھی کوئی عدالتی کارروائی نہ کی گئی ہوتی ورنہ اگر ظالموں اور قاتلوں کے خلاف واقعاً کوئی عدالتی اقدام مقصود ہوتا تو سب سے پہلے رضا خاں کے خلاف مقدمہ قائم کر کے اسے عبرت انگیز سزا دی جانی چاہیے تھی۔ اس کے بعد ظالم و خائن وزیروں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو ان کی حقانیت اور مجرمانہ حرکتوں کے لیے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنا چاہیے تھا۔ اور اس کے بعد فوج، پولیس اور انتظامیہ کے دیگر اعلیٰ افسروں کو ان کی مجرمانہ حرکتوں کی سزا دی جانی چاہیے تھی لیکن یہ کام فقط اب تک انصاف پسند انقلابی حکومت سے ہی متوقع تھا۔ آخر بڑی طاقتوں کی حمایت وسرپرستی کے سایہ میں برسر اقتدار آنے والی حکومت سے یہ اُمید کیسے کی جاسکتی تھی کیونکہ اس کا اصل مقصد تو سابقہ حکومت کی کرتوتوں پر پردہ ڈالنا تھا۔(۷)

درحقیقت ہمارا مقصد محض اس کے دور کے سیاسی حالات و واقعات کا تذکرہ و تجزیہ نہیں ہے بلکہ ان حوادث کی طرف اجمالی توجہ کے ذریعہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ امام خمینیؒ نے اپنے بیانات میں ان شرمناک اور مہلک واقعات کی طرف جو اشارے کیے ہیں ان سے آپ بھی حضرات بخوبی واقف و آگاہ رہیں۔

جیسا ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ فروغی کی حکومت کا مقصد عوام کو وقتی اور ظاہری آزادی فراہم کر کے ملک میں شاہی نظامِ حکومت کے خلاف رونما ہونے والے سیاسی، سماجی اور عوامی انقلاب کی روک تھام کرنا تھا۔ اسی وجہ سے رضا خاں کے زوال کے بعد حکومت ایران نے برطانوی سامراج کے خلاف سرگرم جہاد، مذہبی رہنما آیت اللہ کاشانی کو گرفتار کرلیا تھا اور انھیں ۲۸ مہینوں تک قید خانہ میں اس بنیاد پر بند رکھا کہ وہ جرمنی کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ درحقیقت آیت اللہ کاشانی کی گرفتاری کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ ملک میں رونما ہونے والی سیاسی صورتحال کو سامراج دشمن اغراض و مقاصد کے لیے استعمال نہ کرسکیں۔(۸) لیکن جیسا کہ امید کی جاتی تھی کہ رضا خاں کے زوال کے ابتدائی ایام سے لے کر ۲۸ مرداد ۱۳۳۲ ھ ش کی فوجی بغاوت تک ۱۲ سال کی مدت کے دوران مختلف سیاسی پارٹیاں اور گروہ و جماعت اُبھر کر سامنے آئیں۔ ان پارٹیوں کے اغراض و مقاصد میں اختلاف پایا جاتا تھا کیونکہ ان میں سے زیادہ تر کسی نہ کسی خارجی طاقت سے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر وابستہ تھیں۔(۹) بالکل اسی طرح ملک میں مختلف افکار و اعتقاد کی ترجمانی کرنے والے اخبارات اور سیاسی و تنقیدی رسالوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔(۱۰) مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سابقہ حکومت کے مقابلے میں موجودہ حکومت کی طرف سے فراہم کی گئی آزادی اور رضا خاں کے زوال کی وجہ سے ملک میں سیاسی آگہی و بیداری کی فضا ہموار ہوگئی اور اسی سیاسی بیداری کے ذریعہ آنے والے وقت میں قومی اور سامراج مخالف تحریکوں کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا کیونکہ بین الاقوامی سیاسی ماحول بھی ان تحریکوں کی ترقی کے لیے بہت مناسب

تھا لیکن ان قومی تحریکوں کی شروعات ان کی ترقی اور ان کے آخری انجام کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں ایران کے سیاسی اور اقتصادی حالات کا اجمالی خاکہ بھی پیش کردیا جائے تاکہ قارئین کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہ ہو کہ اس وقت ایرانی عوام کیسے سیاسی اور اقتصادی حالات سے دوچار تھے۔

ایران میں اتحادی گروہ کی آمد کی وجہ سے اس ملک کو ناپسندیدہ اقتصادی نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ اس اتحادی جماعت کو ایران میں خوردنی اشیاء، ایندھن، سڑک، ریلوے لائن اور مخابراتی و ابلاغی وسائل کی سخت ضرورت تھی تاکہ لازمی جنگی وسائل اور دیگر امدادی اشیاء کو ایران کے راستہ روسی محاذ کی پشت تک آسانی سے پہنچا سکیں۔ اسی وجہ سے اس اتحادی جماعت میں شامل حکومتوں نے ایران کو عملی طور پر اس بات کے لیے آمادہ کرلیا کہ وہ ان اقتصادی منابع و مآخذ کو ان کے حوالے کردے۔ اس اقدام کا فطری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ایرانی روپیہ کی قیمت میں غیر معمولی کمی آگئی اور اس کے مقابلے میں برطانوی اور روسی روپیہ کی قیمت کئی گنا بڑھ گئی۔ پہلے ہی مرحلہ میں ایرانی روپیہ کی قیمت سو فیصد سے زیادہ کم ہوگئی یعنی زرمبادلہ قانون کے مطابق ایک اسٹرلنگ کی قیمت ۶۸ ریال سے بڑھ کر ۱۴۰ ہوگئی۔ اس بھاری کمی کی وجہ سے اتحادی گروہ کو آدھی قیمت پر سارا سامان اور ملازمین ملنے لگے اور جنگ کے خاتمہ کے بعد ان لوگوں نے دوگنی قیمت پر اپنا سامان ایران کے ہاتھ فروخت کردیا۔ ملکی روپیہ کی قیمت میں کمی کی وجہ سے ایران کی برآمداتی آمدنی اور درآمداتی ادائیگی کے درمیان کوئی توازن باقی نہ رہ گیا اور ملک میں گرانی بڑھتی چلی گئی اور اس طرح ایران کے غریب و مفلس عوام اور زیادہ غریب وفقیر ہوتے چلے گئے۔ ملک میں کرنسی کی فراہمی میں چار گنا اضافہ ہوگیا جس کی وجہ سے مہنگائی اور بڑھ گئی۔ اس کے علاوہ الگ الگ باہمی معاہدوں کے بموجب برطانیہ کو بیچے گئے تجارتی مال کی ۶۰ فیصد اور روس کو فراہم کیے گئے تجارتی مال کی سو فیصد رقم کی ادائیگی جنگ کے خاتمہ تک کے لیے ملتوی ہوگئی۔ اس وقت کم شدہ زرمبادلہ قیمت کے مطابق

ریال کے بدلہ میں سونا دیا جاتا تھا۔

مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایرانی عوام کے درمیان ناراضگی اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور جدید ترین اخباروں اور رسالوں میں شائع ہونے والی خبروں نیز بعض اراکین پارلیمنٹ کے حقیقی بیانوں کی وجہ سے ایرانی عوام کے درمیان قدرے سیاسی بیداری نظر آرہی تھی۔ یہ اراکین پارلیمنٹ وقتاً فوقتاً اپنے مخلصانہ بیانات کے ذریعہ لوگوں کو برطانوی سامراج کے شرمناک مقاصد اور اس کی کرتوتوں سے باخبر رکھتے تھے اور ایرانی عوام کی یہ سیاسی بیداری آنے والے وقت میں ایران میں رونما ہونے والی ایک قومی تحریک کا بنیادی سبب بنی۔

ایرانی پارلیمنٹ کے سولہویں دور کے لیے ہونے والا عام چناؤ نسبتاً آزاد ماحول میں انجام پذیر ہوا تھا جس کی وجہ سے پارلیمنٹ میں کچھ ایسے افراد بھی پہنچ گئے جو ایرانی عوام کے حقیقی نمائندے تھے اور پارلیمنٹ میں قومی اور عوامی مفاد و مصالح کے علاوہ دوسری کسی بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان حقیقی عوامی نمائندوں میں آیت اللہ کاشانی اور ڈاکٹر محمد صادق کا نام سرفہرست تھا۔ آیت اللہ کاشانی انقلاب اسلامی عراق کی راہ میں اہم اور نمایاں کردار والے نامور مذہبی رہنماؤں میں سے ایک تھے اور اس انقلاب کی ناکامی کے چنگل سے جان بچا کر ایران چلے آئے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں رضا خاں کے زوال کے بعد سے لے کر ۱۹۴۹ء تک انھوں نے ایرانی عوام کے درمیان اپنی انقلابی اور مجاہدانہ سرگرمیاں جاری رکھیں یہاں تک کہ ۱۹۴۹ء کے پارلیمانی چناؤ کے دوران وہ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوگئے۔ اس مدت کے دوران انھیں کئی مرتبہ گرفتاری، قید بامشقت اور جلاوطنی کی سزا بھی بھگتنی پڑی اور جس وقت وہ تہران سے ممبر پارلیمنٹ چنے گئے اس وقت وہ لبنان میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اس چناؤ کے بعد ایرانی حکومت انھیں دوبارہ ایران واپس بلانے کے لیے مجبور ہوگئی۔ چنانچہ ایرانی عوام نے تہران میں ان کا شاندار اور یادگاری استقبال کیا اور انھوں نے دوبارہ اپنی انقلابی سرگرمیاں شروع کردیں۔(۱۱) ان کے علاوہ ڈاکٹر مصدق بھی ایران کی نامور سیاسی شخصیت تھے جو

رضاخاں کے اقتدار کے ابتدائی دور میں اس کے نزدیکی مشاورین میں شامل تھے لیکن کچھ ہی دنوں میں انھوں نے رضاخاں سے علیحدگی اختیار کرلی اور آیت اللہ مدرس کے ساتھ مل کر شاہی حکومت کی بدعنوانیوں کے خلاف پوری طرح سرگرم عمل ہوگئے اور اسی وجہ سے رضاخاں کے غیظ وغضب کا نشانہ بن گئے۔ اگرچہ ڈاکٹر مصدق یورپ کے فارغ التحصیل تھے لیکن وہ قومی روایات اور ثقافتی قدروں کے زبردست پیرو تھے اور اسی وجہ سے انھیں ایرانی عوام کے درمیان بڑی مقبولیت حاصل تھی اور لوگ انھیں غیرمعمولی قدر واحترام کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔

ایرانی پارلیمنٹ کے سولہویں دور کی شروعات کے چند مہینوں کے بعد ڈاکٹر مصدق ''تیل کمیشن'' (Iranian Oil Commission) کے چیئرمین ہوگئے اور تھوڑے ہی دنوں بعد انھوں نے تیل کو قومی ملکیت بنانے کا منصوبہ (Oil Nationalisation Plan) پیش کردیا۔ اس سے قبل چودھویں پارلیمنٹ کے دور میں وہ یہ قانون پاس کرواچکے تھے کہ ایرانی حکومت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر کسی غیرملکی یا ادارہ کو تیل کی صنعت کے سلسلے میں کسی قسم کی کوئی رعایت دے سکے۔ (۱۲) کیونکہ ڈاکٹر مصدق کا یہ خیال تھا کہ ''ایران برطانیہ تیل کمپنی درحقیقت سامراجیت کا مظہر تھی۔ (۱۳) لہٰذا جب تک ایران میں کسی مخصوص حکومتی اور غیرملکی کمپنی کو تیل کی تجارت کے سلسلے میں امتیازی اور خصوصی اختیارات حاصل رہیں گے تب تک اس ملک کی آزادی و استقلال کے لیے خطرہ بنا رہے گا اور ایران کی داخلہ سیاست پر غیرملکی طاقتوں کا اثر ورسوخ قائم رہے گا۔ واضح رہے کہ ایران-برطانیہ تیل کمپنی کی موجودگی برطانیہ کے لیے بنیادی مفاد کی حامل تھی۔ ایران کے سیاسی و اقتصادی ڈھانچے کی تشکیل میں اس کا اہم کردار ہوا کرتا تھا اور ایران کے خارجی و داخلی سیاسی روابط کی تشکیل میں بھی اس کمپنی کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور اسی کمپنی کے ذریعہ برطانیہ داخلی اور خارجی امور میں بھرپور مداخلت کیا کرتا تھا۔ اگر ایران کو حقیقی آزادی و خودمختاری کی تڑپ تھی تو اسے بہرحال اس غیرملکی اثر ورسوخ سے نجات حاصل کرنی تھی۔ (۱۴)

تیل کی تجارت کی قومیت کے اس منصوبے کی حمایت میں آیت اللہ کاشانی نے ایک مفصل اور مؤثر بیان جاری کرتے ہوئے اس سلسلے میں کی جانے والی جدوجہد کو "ملت اسلامیہ ایران کا مذہبی اور قومی فریضہ" قرار دیا۔ (۱۵) آیت اللہ کاشانی کے اس بیان کی پرزور حمایت میں دیگر مذہبی علماء اور مراجع تقلید نے بھی علیحدہ فتوے جاری کیے۔(۱۶) اور بقول خانم المتبون علماء و مذہبی رہنماؤں کی اس بھرپور تائید وحمایت کی وجہ سے ہی اس تحریک کو عمومی مقبولیت وغیر معمولی وسعت حاصل ہوگئی۔(۱۷)

بہرحال ایرانی پارلیمنٹ نے تیل کو قومی سرمایہ قرار دینے والے اس منصوبے کو منظوری دے دی اور اسی کے ساتھ ساتھ جلاً وصفت فوجی افسر رزم آرا کو ایران کا وزیر اعظم بھی بنادیا گیا۔ اس سے قبل رزم آرا ایرانی فوج کا سپہ سالار رہ چکا تھا۔ اس کی حتیٰ الامکان کوشش تھی کہ یہ منصوبہ پارلیمنٹ سے منظور نہ ہونے پائے بلکہ اس کی جگہ "معاہدہ گس گلشائیان" کو مجلس کی تائید حاصل ہوجائے لیکن آیت اللہ کاشانی نے رزم آرا کے خلاف ایک اعلانیہ بیان جاری کرتے ہوئے اس کو خارجی طاقتوں کا ایجنٹ قرار دیا۔(۱۸) اسی دوران رزم آرا کا قتل کردیا گیا اور اس طرح منصوبۂ تیل کی منظوری کی راہ میں موجود آخری رُکاوٹ بھی ختم ہوگئی اور اسی سال رزم آرا کے قتل کے آٹھویں دن پارلیمنٹ اور سینیٹ دونوں نے اس منصوبے کو منظوری دے دی اور اس تیل کی تجارت کو قومی ملکیت قرار دے دیا گیا اور ایرانی عوام کو ایک بڑی سیاسی کامیابی حاصل ہوگئی۔

دور مشروطہ سے رضا خاں کے مظالم تک

اس زمانہ میں جرمنی کی طاقتور حکومت کی زیادتیوں کے خلاف برطانیہ اور روس کے درمیان ایک معاہدہ ہوا اور ان دونوں ملکوں نے مسئلہ ایران کے ساتھ اپنے تمام باہمی اختلافات کو حل کرنا شروع کردیا۔ اس معاہدہ کے بعد برطانیہ نے جو، اب تک تحریک مشروطیت

کی حمایت کر رہا تھا، مشروطہ طلب جماعت کی طرفداری کرنا چھوڑ دی اور روس کو اس بات کی کھلی چھوٹ دے دی کہ وہ ایران کی نوتشکیل شدہ مشروطہ حکومت کا کام تمام کردے کیونکہ نظام مشروطیت روس کے آزادی طلب اور انقلاب پسند عناصر کے لیے امید کی روشن کرن اور حکومت روس کے لیے ایک بڑا خطرہ تھا۔ٹھیک اسی زمانہ میں ایرانی پارلیمنٹ کے بعض تندرو اراکین نے اپنی دہشت گردانہ حرکتوں کی وجہ سے محمد علی شاہ کو ایک مناسب بہانہ فراہم کردیا کہ وہ ظالم قزاق فوجی افسروں کی مدد سے ایرانی پارلیمنٹ پر بمباری کے ذریعہ اسے تباہ و برباد کر ڈالے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس بمباری کے دوران کچھ اراکین مارے گئے، کچھ زخمی ہوئے اور کچھ گرفتار کرلیے گئے۔ دلچسپ اور غور طلب بات یہ ہے کہ دہشت گردانہ حرکتوں میں ملوث، شدت پسند اراکینِ پارلیمنٹ جو دوسروں کو حکومت کے خلاف بھڑکایا کرتے تھے، اس بمباری کے دوران روپوش ہوگئے یا برطانوی سفارت خانہ کے اندر پناہ گزیں ہوگئے۔

غور طلب بات تو یہ ہے کہ انقلاب مشروطیت کی کامیابی اور پارلیمنٹ کی تشکیل کے کئی ماہ بعد بھی ایران کو امیدوں کے برعکس کوئی مفید عملی اقدام نظر نہ آیا بلکہ مسائل و مشکلات، بے سروسامانی و مفلوک الحالی نیز بدامنی اور عدم سلامتی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس کے عوام نے یہ بھی دیکھا کہ اراکینِ مجلس کے درمیان تفرقہ و اختلاف اور گروہ بندی کا بازار گرم ہے اور یہ لوگ عوامی فلاح و بہبود کے بجائے ذاتی مفاد و مصالح کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ لہٰذا ایرانی عوام، پارلیمنٹ اور اس کے اراکین سے پوری طرح نا امید اور بے تعلق ہوگئے۔ چنانچہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جب شاہی فوج نے پارلیمنٹ پر حملہ کیا تو ایرانی عوام کی طرف سے کوئی ردِعمل دکھائی نہ پڑا۔ یہ بات صرف تہران تک محدود نہ تھی بلکہ ایران کے دیگر شہروں میں بھی کسی نے کوئی احتجاج نہ کیا۔

شاہ، شاہی دربار کے اعلیٰ حکام اور انقلاب مشروطیت کے مخالفین اس لڑائی میں ایک فاتح کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آگئے اور ان لوگوں نے مشروطہ طلب افراد کے خلاف ظلم و

نا انصافی کا بازار گرم کردیا اور ایرانی عوام کی عزت و آبرو بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ ان نام نہاد فاتحین نے ایرانی عوام پر بڑے مظالم ڈھائے۔ جب لوگوں کو یہ اندازہ ہوگیا کہ ان کی عزت و آبرو اور ملکیت و زندگی ان مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھ کھلونہ بن چکی ہے تو انھوں نے دفاعی کاروائی شروع کی۔ تبریز میں ستارخان اور باقر خان نے ظالم شاہی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے لوگوں سے یہ اپیل کی کہ وہ حکومت کی ظالمانہ راہ و روش کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ عوام نے ان کی اس احتجاجی اپیل کا پرجوش استقبال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر احتجاجی جماعت کے ہاتھوں میں آ گیا۔ شاہ نے تبریزی عوام کی اس انقلابی تحریک کو کچلنے کے لیے ایک بڑا فوجی دستہ روانہ کیا کیونکہ اسے ڈر یہ تھا کہ حکومت کے خلاف بغاوت کی یہ آگ ایران کے دوسرے شہروں میں بھی بھڑک سکتی ہے۔ تبریز کے لوگوں نے اس ظالم شاہی فوجی دستہ کا بھرپور مقابلہ کیا جس کی وجہ سے حکومت اس احتجاجی تحریک پر غلبہ حاصل نہ کرسکی۔ دوسری طرف علمائے عراق (مثلاً آخوند خراسانی، مازندرانی اور تہرانی) اپنے جوشیلے بیانات اور انقلابی پیغامات کے ذریعہ لوگوں سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ شاہی مظالم کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ ان علماء کی نظر میں ظالم شاہی حکومت کا مقابلہ کرنا امامِ زمانہ (عج) کے ہمراہ دشمنانِ خدا کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ (۱۹) مذہبی علماء کے ان بیانات اور مذہبی احکامات نے انقلابی عوام کے حوصلوں میں غیر معمولی اضافہ کردیا چنانچہ وہ حکومت کے خلاف اپنی انقلابی سرگرمیوں میں لگے رہے۔ جیسے جیسے ایران کے دوسرے شہروں میں انقلاب تبریز کی خبر پہنچی اور لوگوں کو علمائے عراق کے انقلابی پیغامات کا علم ہوا، وہ لوگ بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ حکومت کے خلاف صف آرا ہونے لگے۔

برطانیہ اور روس کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ تھا کہ موجودہ صورتحال پر قابو پانا ایرانی حکومت کے بس کی بات نہیں ہے۔ لہٰذا ان دونوں ملکوں نے مختلف پہلوؤں سے کام کرنا شروع کردیا۔ ان لوگوں نے ایک طرف تو شاہِ ایران کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انقلاب مشروطیت کو تسلیم کرلے۔ دوسری طرف ایک دھمکی آمیز مشترکہ بیان جاری کرتے ہوئے مشروطیت طلب

علماء سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنی انقلابی سرگرمیوں سے باز آ جائیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ روسی فوج شہر تبریز کے اندر داخل ہوگئی اور شہر کو اپنے محاصرہ میں لے لیا۔

لیکن علماء بالخصوص آخوند خراسانی نے ان دھمکیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ مجاہدین تبریز کی حمایت کرنے کے لیے ایک جماعت کے ساتھ تبریز پہنچ کر انقلابی عوام کی قیادت و رہنمائی کریں۔ چنانچہ یہ علماء دسیوں ہزار مسلح اور غیر مسلح عراقی عوام بالخصوص اہلِ نجف کے ہمراہ ایران کی طرف روانہ ہوگئے۔ جیسے ہی برطانیہ اور روس کو علماء عراق کے اس شدید ردِّعمل کی خبر ملی تو ان لوگوں نے گیلان اور بختیاری کے دو نامور لوگوں کو جو درحقیقت ان بیرونی ممالک کے ایجنٹ تھے، اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ انقلاب مشروطیت کا پرچم لیے ہوئے آگے قدم بڑھائیں اور ایرانی عوام کی اس انقلابی تحریک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور شمال و جنوب کے راستہ سے تہران پر قبضہ کرلیں۔

ادھر عراقی علماء ہزاروں مسلح و غیر مسلح افراد کے ہمراہ نجف سے کربلا پہنچ چکے تھے۔ جیسے ہی انھیں کربلا میں فتح تہران کی اطلاع حاصل ہوئی انھوں نے سفر تہران کا ارادہ ترک کردیا اور سب لوگ نجف واپس چلے گئے اور فاتحین نے اقتدار کو آپس میں اس طرح تقسیم کرلیا کہ روسی اور برطانوی ایجنٹوں کے درمیان توازن برقرار رہے۔ "مجاہد" کے لقب سے مشہور ان حکمرانوں نے سب سے پہلے انقلاب مشروطیت کے مخالفین کی گرفتاری کا سلسلہ شروع کیا جس میں شیخ فضل اللہ نوری بھی شامل تھے۔ شیخ فضل اللہ نوری کو ایک ایسے عالم نما قاضی کی عدالت میں پیش کیا گیا جو فری میسن نامی برطانوی تنظیم سے وابستہ تھا۔ اس قاضی نے انھیں پھانسی کی سزا سنائی اور ۱۳ رجب ۱۳۲۷ ہجری یعنی یومِ ولادت حضرت علی علیہ السلام کے موقع پر تہران میں واقع توپخانہ گراؤنڈ پر انھیں پھانسی دے دی گئی تاکہ ایرانی عوام آئندہ ان کی برسی کے سلسلے میں مجلس سوگ و عزا کا اہتمام نہ کرسکیں۔ دوسری طرف مظفر الدین شاہ کے ظالم صدر اعظم عین الدولہ کو، جو انقلاب مشروطیت کا سخت مخالف تھا اور اکثر مجاہدین انقلاب کا قاتل بھی تھا،

فاتح حکام اور افسروں کے سامنے پیش کیا گیا اور ان لوگوں نے اسے نہ صرف معافی دے دی بلکہ اس کے ساتھ ایک یادگاری تصویر بھی کھنچوائی گئی۔

الحاج شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت سے ایرانی عوام بالخصوص علمائے دین بہت متاثر ہوئے اور پورے ملک میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ شیخ فضل اللہ نہ صرف یہ کہ تہران کے ایک نامور عالم دین تھے بلکہ شاہی حکومت کے خلاف تحریک تمباکو میں انھوں نے نمایاں خدمات بھی انجام دی تھیں۔ وہ تحریک مشروطیت کے آغاز سے پارلیمنٹ کی تشکیل تک اور اس کے بعد مجوزہ آئین کے سلسلے میں ہونے والے مباحثہ کے دوران دیگر علمائے دین کے ساتھ رہے۔ اس کے علاوہ ایک نمایاں مجتہد کی حیثیت سے وہ اپنے حق وفریضہ سے بخوبی واقف تھے اور اپنی اجتہادی صلاحیت کی بنیاد پر ہی انھوں نے مجوزہ آئین کی غیر معمولی اسلامی دفعات کی مخالفت کی تھی اور اسے ''بدعت'' کہا تھا۔

بہرحال شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت نے سب سے پہلے علماء عراق کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا کیونکہ یہ شہادت درحقیقت علمائے دین کی بے حرمتی کا پیغام تھی۔ اس کے علاوہ نجف اشرف میں ایسے علمائے دین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو شیخ فضل اللہ کے ہم خیال تھے۔ ان لوگوں میں اس دور کے مرجع تقلید سید کاظم یزدی بھی شامل تھے جو بنیادی طور پر سیاست میں مداخلت کرنے سے پرہیز کیا کرتے تھے اور ایران وعراق دونوں میں ان کے مقلدین و معتقدین کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔

واضح رہے کہ ابتدائی مرحلہ میں مشروطیت اور اس کے طرفداروں کے سلسلے میں علمائے عراق کے درمیان بڑی بدگمانیاں موجود تھیں۔ چنانچہ شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت نے علمائے دین کی بدگمانی کو یقین میں تبدیل کردیا اور لوگوں کو ایک عمدہ دلیل مل گئی۔ دوسری طرف عراق کے جن مشروطہ طلب علماء نے شیخ کی شہادت پر سکوت وشرمندگی کا رویہ اختیار کیا، ان سے سوالات کی بھرمار ہوگئی اور بالآخر انھیں گوشہ نشین ہونا پڑا۔ دوسری طرف ایران سے حاصل

شدہ اطلاعات سے یہ پتہ بھی چل رہا تھا کہ حقیقی مشروطہ طلب افراد کو طرح طرح سے پریشان کیا جارہا ہے اور ان کی جان وعزت وآبرو خطرہ میں ہے۔

الحاج شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت کے تقریباً ایک سال بعد تہران کے دوسرے اہم مشروطیت طلب عالم دین سیّد عبداللہ بہبانی کو ایک قاتلانہ حملے کے دوران شہید کردیا گیا اور یہ پتہ چلا کہ اس قتل میں ایرانی پارلیمنٹ کا ایک ایسا ممبر ملوث تھا جو انقلاب مشروطیت سے قبل اپنی دین مخالف حرکتوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس خبر نے مشروطہ کے نئے ارباب اقتدار کے سلسلے میں علمائے دین کی بدگمانیوں میں اور اضافہ کردیا۔ چنانچہ ایران کے نائب السلطنت کے نام ایک ٹیلی گرام میں آخوند خراسانی اور عبداللہ مازندرانی نے ”بڑے قومی لیڈران اور دین پرست مجاہدین“ کی جدوجہد کے سلسلے میں شکریہ ادا کرتے ہوئے حکومت و پارلیمنٹ میں موجود مخرب و فاسد عناصر کی موجودگی، ان کی مغرب پرستی اور اسلامی اصول وقوانین کے سلسلے میں ان لوگوں کی لاپرواہی پر اپنی ناراضگی و پریشانی کا اظہار بھی کیا۔

مجموعی طور پر ان اسباب وعوامل نے عراق میں ایسی صورتحال پیدا کردی کہ مشروطیت طلب علماء کو گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی اور نوبت یہ آگئی کہ نجف اشرف میں بھی جو شیعہ علماء کی قدیم چھاؤنی اور مشروطہ طلب علماء کے اہم اور قسمت ساز فیصلوں کا مرکز تھا، علماء دین کی عزت وآبرو اور جان و مال محفوظ نہ تھی۔ طلباء اور عوام، جو بالعموم مشروطیت کے مخالف تھے اور جن کو صحیح اطلاع بھی نہیں ہوا کرتی تھی، مشروطہ طلب علماء کے خلاف تہمت لگانے سے باز نہیں آتے تھے اور یہ لوگ آخوند خراسانی جیسے نامور عالم دین پر بھی الزام عائد کرنے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتے تھے۔

یہی وہ وقت تھا جب روس اور برطانیہ کی فوجوں نے شمال وجنوب سے ایران پر قبضہ کرلیا۔ (۱۳۲۹ھ) شہر تبریز میں روسی افواج نے مشروطہ طلب عناصر کا قتل عام شروع کردیا اور مقتولین میں ثقۃ الاسلام تبریزی جیسے صاحب عظمت عالم دین بھی موجود تھے۔ عراق پر بیرونی

افواج کے قبضہ کی خبر سے علمائے عراق کے درمیان ایک بار پھر ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ چنانچہ اپنی ناراضگی کے باوجود ان لوگوں نے تہران جانے کا فیصلہ کرلیا تاکہ ایرانی عوام کی مدد سے غاصب فوج کو ملک کے باہر نکال سکیں اور انقلاب مشروطیت کے سایہ میں جن لوگوں نے اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے رکھی ہے، ان پر بھی نگاہ رکھ سکیں۔ عراق کے ہزاروں مسلح اور غیر مسلح افراد اور قبائل نے علمائے نجف و کربلا کی اطاعت میں ایران جانے کا فیصلہ کرلیا۔ سیّد کاظم یزدی اگرچہ عراق سے باہر تو نہیں نکلے لیکن انھوں نے اپنے ایک بیان میں ایران پر روسی اور برطانوی فوجی حملے کی سخت مذمت کی۔ علمائے نجف کا یہ قافلہ ایران کی طرف روانہ ہونے کے لیے پوری طرح آمادہ تھا لیکن جس روز اس قافلے کی روانگی تھی اسی دن صبح کے وقت مشکوک حالات میں آخوند خراسانی کی موت واقع ہوگئی۔

اگرچہ خراسانی کی موت کی وجہ سے دیگر علماء کے فیصلے میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوا اور وہ لوگ کاظمین کی طرف روانہ ہوگئے لیکن آخوند جیسی نمایاں شخصیت کے فقدان نیز ایرانی علماء اور حکمرانوں کی طرف سے ملنے والی مختلف اطلاعات کی وجہ سے لوگ اپنے سفر ایران کو جاری نہ رکھ سکے اور اس طرح ایران کے سیاسی واقعات میں علماء کی براہِ راست مداخلت اور مشروطیت کی صحیح قیادت کا دوسرا موقع بھی ہاتھ سے چلا گیا۔ ویسے تحریک مشروطیت میں اس دور کے مذہبی علماء سے اتنے عظیم کام کی امید بھی نہ کرنی چاہیے تھی کیونکہ ان لوگوں نے قدیم مذہبی روایات کے سایہ میں تعلیم حاصل کی تھی اور طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کی مذہبی مصروفیات بالکل روایتی انداز کی تھیں اور وہ اپنی روایتی مصروفیتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنے فرائض کو انجام دیا کرتے تھے لہٰذا یہ بات ان روایتی علماء کے لیے کسی حد تک دشوار معلوم ہوتی تھی کہ مغرب سے تعلقات کے نتیجے میں ایران میں جو مسائل پیدا ہوگئے تھے انھیں وہ لوگ بخوبی سمجھ سکیں۔

سیاسی میدان سے علماء اور مذہبی رہنماؤں کی علیحدگی کی وجہ سے مغرب پرست اور

نام نہاد مشروطہ طلب افراد نے ملک و ملت کو اپنی ذاتی ہوس اور سامراجی طاقتوں کی مفاد پرست خواہشات کا شکار بنانا شروع کردیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ ستارخان جیسے حقیقی مشروطہ خواہ شخص کے وجود کو بھی تحمل نہ کرسکے اور فقط ستارخان ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھیوں کے خلاف شرمناک پروپیگنڈوں کا بازار گرم کردیا تاکہ عوام کے درمیان ان کا کوئی اثر و رسوخ باقی نہ رہ جائے۔ سماج میں اچھی طرح بدنام کرنے کے بعد ان لوگوں نے ستارخان پر بھی قاتلانہ حملہ کردیا اور اس حملے کی وجہ سے وہ ایک مدت تک بستر علالت پر پڑے رہے اور بعد میں انتہائی غم انگیز حالت میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اس طرح ایرانی عوام کی عدالت پسندانہ تحریک میں بنیادی کردار ادا کرنے والی مذہبی اور قومی شخصیتیں دھیرے دھیرے اس تحریک سے کنارہ کش ہوگئیں، جسکے نتیجے میں انقلاب دشمن افراد و عناصر نے اس انقلاب پر غلبہ حاصل کرلیا۔ پس یہ بات قطعی حیرت انگیز نہیں ہے کہ انقلاب مشروطیت کی کامیابی سے قبل مظفرالدین شاہ کا صدر اعظم عین الدولہ جو مشروطہ طلب لوگوں کا جانی دشمن تھا اور جس نے محاصرہ تبریز کے دوران بیرونی فوجوں کا اعلانیہ ساتھ دیا تھا، دس سال کا وقفہ گزرنے کے بعد مجلس شوریٰ ملی یعنی پارلیمنٹ کے ذریعہ دوبارہ صدر مملکت کا عہدہ حاصل کرلیتا ہے۔

وقت کی رفتار کے ساتھ انقلابی جوش وخروش میں کمی آتی چلی گئی اور دھیرے دھیرے ملک میں سیاسی گڑبڑی، سماجی اختلافات اور اقتصادی مفلوک الحالی میں غیر معمولی اضافہ ہوتا رہا۔ ملک کی اقتصادی حالت میں اصلاح و سدھار کے بجائے اور زیادہ خرابی پیدا ہوگئی۔ ملک کے اکثر صوبوں میں علاقائی بغاوت شروع ہوگئی اور صوبائی حکام نے مرکزی حکومت سے علیحدگی اختیار کرنا شروع کردیا اور معاشرہ میں امن وسلامتی نام کی کوئی چیز باقی نہ رہ گئی۔ روس اور برطانیہ نے بھی پورے ایران میں پھیلی ہوئی گڑبڑی و مفلوک الحالی کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے ملک وملت پر اپنے ناجائز اثر ورسوخ میں غیر معمولی اضافہ کرنا شروع کردیا۔

اسی زمانہ میں پہلی جنگ چھڑ گئی۔ درحقیقت یہ جنگ ایرانی عوام کے سر پر بجلی کی

طرح گر پڑی اور ان کی مصیبتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ حکومت ایران میں اتنا دم نہ تھا کہ وہ ملک کے سیاسی استقلال کی حفاظت کر سکے۔ اگر چہ ایک مدت کے بعد اس حکومت نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان تو کر دیا تھا لیکن جنگ میں سرگرم روسی، برطانوی اور عثمانی حکومتوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور اپنی فوجیں ایران میں داخل کر دیں اور ایک دوسرے کے خلاف جنگی کاروائی میں مشغول ہوگئے۔ ملک کے ماہرین سیاست اور قوم پرست افراد کے سامنے فقط یہی ایک راستہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ تہران سے ہجرت کر کے ملک کے مغربی حصہ میں چلے جائیں اور ایک عارضی حکومت کی تشکیل کر کے جرمنی اور ترکی کے ساتھ تعاون کا اعلان کر دیں لیکن ان لوگوں کی اس سیاسی تحریک سے بھی ایرانی عوام کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس عالمی جنگ کا نتیجہ کچھ بھی ہوا ہو لیکن ایرانی عوام کو ویرانی و مفلوک الحالی کے علاوہ کچھ نہ ملا اور اس ملک میں ہر طرف قحط، بھوک اور بیماری کا بول بالا ہوگیا۔ اس کے علاوہ مقامی گڑبڑی نیز ملک کے ہر گوشہ میں بیرونی فوجوں کی موجودگی کی وجہ سے استقلال و آزادی کا بظاہر خاتمہ ہو چکا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے آخری زمانہ میں روس میں انقلاب رونما ہوا اور متعدد داخلی و خارجی مسائل و مشکلات نیز ملک میں رونما ہونے والی جدید صورتحال کی وجہ سے روس میں اب اتنا دم نہ رہ گیا تھا کہ وہ پہلے کی طرح ایران کے معاملات میں مداخلت کرے لیکن یہ تاریخی اور سنہری موقع بھی ایرانی حکومت اور عوام کے حق میں مفید و کارآمد ثابت نہ ہوا کیونکہ برطانوی فوجوں نے فوری طور پر پورے ملک پر اپنا فوجی اور سیاسی تسلط قائم کر لیا۔ ان لوگوں نے روس کی نئی حکومت کی نابودی و سرنگونی کے لیے دو ہتھکنڈے ایک ساتھ استعمال کیے۔ پہلے ایران میں تعینات روسی فوج کو جو بالعموم سابقہ حکومت کی طرفدار تھی، اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے روس کی موجودہ عوامی اور انقلابی فوج کے مقابلے کے لیے بھیج دیا اور دوسرے مرحلے میں ایران کی نام نہاد کمیونسٹ تنظیموں کی تشکیل کر کے انھیں روس کی سیاسی اور فوجی تنظیموں کے اندر رخنہ اندازی کے لیے مقرر کر دیا۔

ایسی صورت حال میں برطانیہ نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ ایران میں اپنی پسندیدہ حکومت قائم کر کے ایران میں اپنی فوجی اور سیاسی موجودگی کو قانونی حیثیت عطا کرے۔لہٰذا ۱۹۱۷ء میں ایران میں وثوق الدولہ کی کابینہ کی تشکیل عمل میں آئی۔ وہ مشروطیت طلب افراد کی نظر میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، آزادی پسند اور صاحب مہارت سیاست داں سمجھا جاتا تھا۔ اس کابینہ کی تشکیل کے ایک سال بعد حکومت برطانیہ نے وثوق الدولہ کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کیے جس کو ''معاہدہ ۱۹۱۹'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے بموجب فوجی اور مالی سسٹم سے متعلق جملہ امور برطانوی مشیروں کے سپرد کردیئے گئے تھے۔ بہ لفظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس معاہدہ نے ایران کو برطانوی نوآبادیاتی نظام کا حصہ بنادیا گیا۔

چنانچہ داخلی اور خارجی سطح پر اس معاہدہ کی بھرپور مخالفت ہوئی۔ ملک کے اندر بعض اراکینِ پارلیمنٹ مثلاً سید حسن مدرس جیسے لوگوں نے کافی بڑے پیمانے پر ایرانی کابینہ کو بے نقاب کرنا شروع کردیا۔ ملک کے غیر معمولی جانبدار اور برطانیہ مخالف اخباروں اور رسالوں نے اس شرمناک معاہدہ کی وجہ سے وثوق الدولہ کا خوب مذاق اُڑایا۔ آذربائیجان میں شیخ محمد خیابانی اور گیلان میں میرزا کوچک خان جنگلی نے اس معاہدہ کے خلاف انقلاب برپا کردیا۔ حکومت نے مخالف افراد کی گرفتاری اور مخالف اخباروں و رسالوں پر سخت پابندی لگادی پھر بھی معاہدہ کے خلاف عوامی احتجاج میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ بیرونی سطح پر برطانیہ سے سامراجی رقابت رکھنے والے ممالک مثلاً روس، امریکہ اور فرانس نے اس معاہدہ کی زوردار مخالفت کی اور نوتشکیل شدہ ''اقوامِ متحدہ'' نے بھی سرکاری طور پر اس معاہدہ کو تسلیم نہ کیا۔

وسیع اور شدید اختلافات اور مخالفتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے وثوق الدولہ نے معاہدہ کی عملی تعمیل کو روک دیا اور لازمی منظوری کے لیے اسے مجلس یعنی پارلیمنٹ کے سپرد کردیا۔ تیرہ سال بعد رونما ہونے والے اس واقعہ سے اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے کہ ایسے بحرانی حالات میں ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے فاسد و خائن حکمرانوں نے تحریک مشروطیت کو کس حد تک منحرف کردیا تھا۔

بہرحال وثوق الدولہ کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارۂ کار باقی نہ رہ گیا تھا کہ حکومت سے مستعفی ہوجائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مشیر الدولہ نامی شخص، جو سماج میں نیک نام مگر نہایت مصلحت اندیش تھا، اس کا جانشین مقرر ہوا لیکن ملک کے مسائل کا حل تلاش کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی لہٰذا قبل اس کے کہ مشکلات اس پر غالب ہوجائیں اس نے خود ہی استعفیٰ دے دیا۔ واضح رہے کہ انقلاب مشروطیت کے بعد قومی رہنماؤں کی نظر بحرانی اور حساس سیاسی ماحول میں ''استعفیٰ'' ایک بہترین حل تھا کیونکہ ان لوگوں کو ملکی مفاد و مصالح کے مقابلے میں اپنی ذاتی شخصیت وشان وشوکت زیادہ عزیز تھی، اسی وجہ سے جب کبھی انھیں اپنی حیثیت خطرہ میں نظر آتی، وہ فوری طور پر استعفیٰ دے دیا کرتے تھے۔ مشیر الدولہ کے مستعفی ہونے کے بعد کمانڈر جنرل فتح اللہ خان تنکابنی نے صدارت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی لیکن اس میں بھی اتنی صلاحیت نہ تھی کہ ملک کے مسائل حل کرسکے۔

عالمی جنگ کے خاتمہ کے دو سال بعد نیز ملک سے روسی فوجوں کے نکل جانے کے بعد لوگوں نے امید لگا رکھی تھی کہ اب مفلوک الحال و بے سروسامانی، فقر وگرسنگی اور تباہی و بربادی کا دور ختم ہوجائے گا لیکن مسند اقتدار پر ایران والے حاکموں میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ ایرانی عوام کی امیدوں کو پورا کرسکیں۔ یہی وجہ تھی کہ فقط عوام ہی نہیں بلکہ ایران کے سیاسی ماہرین بھی یہ سمجھ چکے تھے کہ ملک کی فلاح و بہبود ان حکمرانوں کی صلاحیت سے باہر ہے لہٰذا سبھی لوگ کسی ایسے حادثہ کا انتظار کر رہے تھے جو موجودہ صورت حال کو دگرگوں بنا دے۔ مختصر لفظوں میں یہ سمجھ لیجئے کہ ماہرین سیاست کو فوجی بغاوت اور عوام کو نجات وسلامتی کی فکر دامنگیر تھی۔

○○

حوالے:

۱۔ محمد علی کاتوزیان: اقتصاد سیاسی ایران وسلطنت محمد رضا شاہ، تہران، وپیرس، ص ۱۱

۲۔ حسین دوست: ظہور وسقوط سلطنت پہلوی، جلد ۱، ص ۱۰۲ و ۱۰۳

۳۔ ظہور وسقوط، جلد ۲، ص ۳۸

۴۔ گزشتہ چراغ راہ آئندہ، ص ۸۴ و ۸۵

۵۔ مقالات تقی زادہ، جلد ۵
۶۔ محمد علی کاتوزیان: اقتصادِ سیاسی ایران۔ ص ۱۱ و ۱۳
۷۔ اس دور میں بعض افراد کی نظر میں عمومی تصفیہ و پاکسازی لازمی نہ تھی۔ چنانچہ عدم تصفیہ عمومی کو ایرانی عوام کی کینہ پروری سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو قطعی درست نہیں ہے۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی سے قبل ایران میں کوئی حقیقی قومی حکومت تشکیل نہیں ہوئی تھی اسی وجہ سے اس دور کے ظالموں اور خیانت کاروں کے خلاف کوئی اہم اور مؤثر قدم نہیں اُٹھایا گیا تھا لیکن اسلامی انقلاب کی کامیابی اور ایران میں اسلامی حکومت کی تشکیل کے بعد انقلابی عدالتوں کا قیام عمل میں آیا اور سابقہ حکومت کے ظالموں کو لازمی سزائیں دی گئیں اور ایرانی عوام نے اس کا بھرپور استقبال بھی کیا۔
۸۔ روحانیت وبہضت ملّی شدن صنعت نفت۔ ص ۲
۹۔ احسان طبری، کژراہہ۔ حسین فردوست، ص ۱۴ تا ۱۴۳
۱۰۔ عبدالرحیم ذاکر حسین، مطبوعات سیاسی درعصر مشروطیت۔ ص ۱۷۳
۱۱۔ آیت اللہ کاشانی کی حیات اور کارناموں کے سلسلے میں مزید معلومات کے لیے رجوع کیجئے۔ روحانیت شدن صنعت نفت۔
۱۲۔ آیت اللہ کاشانی کی حیات اور کارناموں کے سلسلے میں مزید معلومات کے لیے رجوع کیجئے۔ روحانیت شدن صنعت نفت۔
۱۳۔ رونالڈ فری: اختلافات ایران وانگلیس۔ ص ۲۹۷
۱۴۔ محمد علی کاتوزیان۔ ص ۳۲
۱۵۔ روحانیت وبہضت ملّی شدن صنعت نفت۔ ص ۵۴-۵۵
۱۶۔ آیت اللہ کاشانی کی حمایت میں فتوے صادر کرنے والوں میں آیت اللہ خوانساری، آیت اللہ کلباسی، آیت اللہ محلاتی اور آیت اللہ شاہرودی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ رجوع کیجئے: روحانیت وبہضت ملی شدن صنعت نفت۔
۱۷۔ ان کا بیان ہے کہ جب تک مذہبی علماء نے اسلامی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ تحریک کی حمایت نہیں کی تھی اس کو عوامی مقبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ بحوالہ رونالڈ فری۔ اختلافات ایران وانگلیس۔
۱۸۔ روحانیت وملّی شدن صنعت نفت۔ ص ۱۱
۱۹۔ احمد کسروی، تاریخ مشروطہ۔ ص ۷۳۰
۲۰۔ دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، ص ۱۵۱ و ۱۵۲۔ ''آخوند خراسانی''

پروفیسر حمید رضا صدیقی

سیاست وحکومت
افکار امام خمینیؒ کی روشنی میں

تاریخ انسانی میں بے شمار انقلابات کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ انقلاب سیاست حکومت اور معاشرے میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیوں کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ ''اس صدی کے انقلاب روس اور انقلاب چین کو دیکھا۔ لوگوں نے انقلاب فرانس کی ہولناکیاں بھی دیکھیں مگر انقلاب اسلامی ایران نے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اس نوعیت کے انقلاب کی کوئی صورت ہمیں تاریخ میں اس سے پہلے دکھائی نہیں دیتی۔ یکم فروری ۱۹۷۹ء کے انقلاب اسلامی ایران نے ڈھائی ہزار سالہ طویل شہنشاہی نظام کو ختم کردیا۔'' اس انقلاب کا سہرا ایک مرد خدا پرست حضرت امام خمینیؒ کے سر ہے جنھوں نے اس صدی کے بڑے فرعون سے ٹکر لی اور یہ ثابت کردیا کہ اگر انسان کے نظریات افکار اور اعمال کی بنیاد سچائی پر ہو تو وہ دنیا کی ہر بڑی طاقت سے ٹکرا سکتا ہے وہ کسی سپر پاور کو نہیں مانتے ان کے نزدیک سپر پاور اور سپریم پاور صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر انسان راہ راست پر ہو، خدا کو عظیم اور برتر سمجھتا ہو اور اس کے سوا کسی کے سامنے سر نہ جھکاتا ہو اور راہنمائی کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات اس کے سامنے ہوں تو وہ ہر طاغوتی قوت سے ٹکرا سکتا ہے۔ ایرانی انقلاب ایک ایسا انقلاب ہے جس نے انقلاب کے روایتی تصور کو پاش پاش کردیا ایک مصنف کے بقول:

''ایران کا حالیہ انقلاب پوری دنیا کا ایک محیر العقول واقعہ ہے۔ اپنے ہی نہیں غیر بھی اس درویش خدا مست کی قلندرانہ جدوجہد پر انگشت بدنداں ہیں۔ جس نے چٹائی پر بیٹھ کر

کسریٰ کے تخت کے پرخچے اُڑا دیئے۔"

ایران کا انقلاب اسلامی دوسرے ملکوں کے انقلابات سے ہیئت اور نتائج کے اعتبار سے بالکل مختلف انقلاب تھا۔فریڈ ہالی ڈے اپنی کتاب "ڈکٹیٹر شپ اینڈ ڈویلپمنٹ" میں لکھتا ہے۔

اس انقلاب کو تین وجوہ کی بناء پر دیگر انقلابات سے مختلف تصور کیا جاتا ہے۔

(i) انقلابی جدوجہد کے دوران اس تحریک کے زیر اہتمام جو مظاہرے ہوئے ان میں کئی مرتبہ بیس بیس لاکھ سے زیادہ افراد نے شرکت کی۔ اتنی بڑی تعداد میں آج تک دنیا کے کسی ملک میں مظاہرین کا اجتماع نہیں ہوا۔

(ii) دنیا میں پہلی بار ایک ایسی فوج کو جو کسی بیرونی جارحیت سے ٹکرا کر کمزور بھی نہیں ہوئی تھی اور جو ایرانی شہنشاہ کے زیر کمان ہمیشہ سے تر و تازہ تھی مسلسل اور منظم عوامی عمل نے شکست فاش دے دی۔

(iii) یہ انقلاب ایک ایسے ملک میں برپا ہوا جو اپنے مسائل کے باوجود دنیا کے بہت سے ملکوں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ تھا۔آج تک جن ملکوں میں انقلاب آئے وہ اتنے ترقی یافتہ نہ تھے، مثال کے طور پر روس ۱۹۱۷ء میں چین ۱۹۴۹ء میں ویت نام ۱۹۷۵ء میں اور کیوبا ۱۹۵۹ء میں اتنا ترقی یافتہ نہ تھا۔ان سب ملکوں میں محنت کشوں کی بھی بڑی تعداد آباد تھی مگر ایران کی آدھی آبادی شہری ہے مزدوروں کی تعداد صرف تیس لاکھ ہے ایک ایسے ملک میں انقلاب کی آمد نے وقت کے بہت سے رائج الوقت تصورات بدل دیئے۔"

ایران کے اس انقلاب کی نوعیت کے پیش نظر اس کی سیاسی اور معاشرتی اہمیت کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ اس کے اثرات عالمی اور علاقائی سیاست پر بڑے گہرے پڑے ایک مصنف کے بقول:

"ایرانی انقلاب ہر چند ایران کا داخلی معاملہ ہے لیکن اس کی بین الاقوامی اہمیت روز بروز واضح ہوتی جاتی ہے۔ اس انقلاب کی وجہ سے مشرق وسطیٰ میں ترقی پسند

اور رجعتی قوتوں کے توازن میں بڑی تبدیلی آئی ہے ایران میں امریکی امپریلزم کو بڑی ذلت آمیز شکست ہوئی اور شکست کے اثرات غالباً ویت نام سے بھی زیادہ دُوررس ثابت ہوں گے۔"

عالمی بساط سیاست پر گہرے اثرات مرتب کرنے والے اس انقلاب کا سہرا حضرت امام خمینیؒ کے سر ہے۔

اس مردمجاہد نے ایران میں ایسے انقلاب کی شمع روشن کی جو واقعی انقلاب نور ہے جس نے دنیا کی مظلوم اقوام کو جبر و استبداد کی زنجیریں اُتار پھینکنے کا حوصلہ دیا اور عالم انسانیت کو نجات اور فلاح کی راہ دکھائی۔ امام خمینیؒ وہ روحانی سیاستداں ہیں جو بیسویں صدی میں اسلام کے چہرے پر پڑے ہوئے غبار کو ہٹانے اور آج سے چودہ سو سال قبل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک سے قائم ہونے والی اسلامی حکومت کی جھلک ایک بار پھر آج کی تشنہ حقیقت دنیا کو دکھانے میں کامیاب ہوگئے۔"

حضرت امام خمینیؒ کی عظیم شخصیت بلاشبہ انقلاب ایران برپا کرنے کی ذمہ دار ہے لیکن ان کا کردار یہیں پر ختم نہیں ہوجاتا۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ان کے افکار و خیالات اور تعلیمات ہمیشہ کے لیے رہنمائی کا باعث ہیں۔ حکومت و سیاست کے متعلق ان کے افکار و نظریات آج کے دور میں رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ الحکومت الاسلامیہ امام خمینیؒ کی ایک معروف تصنیف ہے، جس کے مطالعہ سے ہمیں حکومت و سیاست کے بارے میں ان کے تصورات سے شناسائی حاصل ہوتی ہے۔ اپنے الٰہی اور سیاسی وصیت نامے میں بھی انھوں نے اس موضوع پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔

جب ہم اسلامی نظام سیاست کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت ہمارے ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل دین ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے مکمل ضابطہ حیات (Complete Code of Life) کہا

جاتا ہے۔ اس نظام میں مغربی سیاسی تصورات کے برعکس دین اور سیاست میں کوئی تفریق اور جدائی نہیں ہے۔ دین اور سیاست کی یک جائی اور یکجہتی کے بارے میں امام خمینیؒ کے متعدد ارشادات ہمارے سامنے ہیں۔

دوسرا گروہ جو شیطانی منصوبہ رکھتا ہے اور اسلام کو حکومت و سیاست سے جدا سمجھتا ہے اس کو یہ بتادینا چاہیے کہ قرآن کریم اور اس رسول خدا کی سنت میں جتنے احکام سیاست و حکومت کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں اتنے احکام کسی اور موضوع سے متعلق ذکر نہیں ہوئے ہیں بلکہ اسلام کے بہت سے عبادی احکام بھی عبادی سیاسی ہیں جن کی طرف سے غفلت نے ان مصیبتوں کو جنم دیا ہے۔ خود پیغمبر اسلامؐ نے دنیا کی تمام حکومتوں کی طرح حکومت تشکیل دی ہے لیکن آپ کا مقصد سماجی انصاف قائم کرنا تھا اور اسلامی دور کے ابتدائی خلفاء بھی وسیع حکومتوں کے مالک تھے۔

اس حاکیت کا اصل مقصد معاشرے میں اسلامی سماجی اور سیاسی نظام کی تشکیل تھا۔''

دین اور سیاست کے باہمی تعلق پُرزور دیتے ہوئے امام صاحب فرماتے ہیں:

''میں پوچھتا ہوں کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں دین سیاست سے علیحدہ تھا؟ کیا اس زمانے میں کچھ ماہرین دین اور کچھ ماہرین سیاست تھے؟ پھر کیا خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں کیا حضرت علیؑ کے زمانے میں سیاست دین سے علیحدہ تھی؟ کیا اس مبارک زمانے میں دین کا ڈھانچہ الگ اور سیاست کا الگ تھا؟''

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ طے شدہ امر ہے کہ اسلام میں دین اور سیاست میں کسی قسم کی علیحدگی ممکن نہیں ہوسکتی اسلامی نظام حکومت میں کسی شخصی بادشاہت یا گروہی آمریت وحکومت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ آپ فرماتے ہیں۔ ''شہنشاہی نظام اسلام، حکومت اور اسلام کے سیاسی نظام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اسلام نے ملوکیت اور ولی عہد کو باطل قرار دیا ہے۔

اسلامی نظام حکومت میں جہاں ملوکیت اور شخصی حکومت کی گنجائش نہیں ہے وہاں کمیونزم جیسے نظام کی بھی کوئی گنجائش نہیں جو غیر طبقاتی غیر ریاستی اور غیر خدائی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ کمیونزم کو جابرانہ نظام قرار دیتے ہوئے آپ کہتے ہیں:

''وہ جو کمیونسٹ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جو سب سے زیادہ ظالم اور سب سے بڑھ کر ڈکٹیٹر اور اپنی قوم کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان ملکوں میں کسی کو آزادی میسر نہیں ہے۔''

کمیونزم کے بارے میں کورباچوف کے نام اپنے خط میں امام خمینیؒ نے درست لکھا تھا:

''سب پر یہ بات واضح اور روشن ہے کہ اب کچھ عرصے بعد کمیونزم کو دنیا کی سیاسی تاریخ کے عجائب گھروں میں تلاش کرنا پڑے گا اس لیے کہ اب تک مارکسزم انسان کی حقیقی ضروریات زندگی میں سے کسی ضرورت کا مثبت جواب نہیں دے سکا۔''

بعض حضرات جمہوریت میں اسلام کو تلاش کرنے یا اسلام میں جمہوریت کا پیوند لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دو مختلف نظام زندگی ہیں جمہوریت عوام کے اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت کے فلسفے کی بنیاد پر قائم ہے جبکہ اسلام کے سیاسی نظام میں اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور ساری دنیا کے مسلمان مل کر بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات میں تبدیلی نہیں کر سکتے۔ اسلام اپنی جگہ مکمل اور جامع سیاسی اور معاشرتی نظام ہے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے معروف اطالوی خاتون صحافی فلاسی سے اپنے انٹرویو میں امام خمینیؒ کہتے ہیں۔

''لفظ اسلام جمہوریت یا اس قسم کے کسی دوسرے پیوند کا محتاج نہیں ہے مختصراً اسلام ہر چیز ہے اور اس میں سب کچھ شامل ہے۔ یہ بات ہمارے لیے افسوس ناک ہوگی اگر ہم اسلام کے ساتھ کوئی اور لفظ استعمال کریں۔ یہ لفظ اسلام خود ہی کامل ہے جبکہ لفظ جمہوریت جسے آپ (اہل مغرب) بہت قیمتی تصور کرتے ہیں اور جو

آپ کو بہت پیارا لگتا ہے کسی مخصوص معنی و مفہوم کا حامل نہیں۔ ارسطو کی جمہوریت ایک چیز ہے اور سوویت جمہوریت دوسری چیز جبکہ سرمایہ داروں کی جمہوریت ایک مختلف چیز ہے۔''

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام اپنی جگہ ایک مکمل نظام حیات ہے اور جمہوریت کی طرح اس کے مختلف مفاہیم مراد نہیں لیے جاسکتے۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کے ساتھ خلافت کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس بارے میں امام صاحب کہتے ہیں:

اسلام میں خلافت ہی ولایت ہے۔ خلیفہ محض واضع قانون یا مبلغ قانون ہی نہیں ہوتا بلکہ خلیفہ کے ہاتھ میں وہ طاقت و اختیار ہوتا ہے جس سے وہ ملک میں قانون نافذ کرتا ہے اور اس حکومت کے قیام کے ذریعہ اس میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کی تشکیل و تنظیم کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے اور اسی وجہ سے ولایت فقیہ کا عقیدہ جزو ایمان ہے۔

اسلام کے سیاسی نظام میں عوام کے اقتدار اعلیٰ کے نام پر بے لگام آزادی کا تصور موجود نہیں ہے۔ اسلام میں عوام کو یکساں اور بے شمار قسم کے حقوق اور آزادیاں حاصل ہیں لیکن اسلام ایسے نظام کو نافذ کرنا چاہتا ہے جو معاشرے کی پاکیزگی کی ضمانت دے۔ اسلام کے نظام حکومت میں سماجی انصاف پر زور دیا جاتا ہے اور یہ سرمایہ داری کا مخالف ہے۔ امام خمینیؒ کہتے ہیں:

اسلام نہ صرف مظلوم و ستم رسیدہ عوام کو محروم کردینے والی بے حساب و کتاب ظالمانہ سرمایہ داری کا مخالف ہے بلکہ کتاب و سنت میں پوری تاکید کے ساتھ اس کی مذمت بھی کرتا ہے اور اسے سماجی انصاف کے خلاف تصور کرتا ہے۔''[1]

اسلامی نظام میں اگرچہ سرمایہ داری کی مخالفت کی گئی ہے لیکن انفرادی ملکیت کو تحفظ دیا گیا ہے جبکہ اس مقابلے میں کمیونزم میں بھی ملکیت کے خاتمے اور اجتماعی ریاستی ملکیت پر زور دیا جاتا ہے لیکن اسلامی نظام حکومت میں اس قسم کے نظام کی گنجائش نہیں ہے۔ امام

صاحب کہتے ہیں:

''اسلام، کمیونزم، مارکسزم اور لینن ازم کے مانند بھی نہیں ہے جو فردی ملکیت کا مخالف اور ہر چیز میں اشتراک کا قائل ہے۔ اسلام ایک معتدل نظام ہے جو ملکیت کے حق کو تسلیم اور اس کا احترام کرتا ہے لیکن ملکیت کے وجود میں آنے کے اسباب اور اس کے استعمال میں محدودیت کا قائل ہے۔ اگر اس پر صحیح طریقے سے عمل کیا جائے تو صحت مند معیشت کے پہیے حرکت میں آجائیں گے اور سماجی انصاف جو ایک مسلمہ نظام کا لازمہ ہے وجود میں آجائے گا۔''[۲]

نجی ملکیت کے تحفظ اور سرمائے کی گردش کی اہمیت پُرزور دیتے ہوئے امام خمینیؒ ارکان حکومت سے یہ کہتے ہیں:

''خداوند متعال کے احکام کے آگے سر تسلیم خم رکھئے اور ظالم ولٹیرے سرمایہ دار بلاک یا ملحد کمیونسٹ اشتراکی بلاک دونوں کے کھوکھلے پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوئیے۔ اسلامی حدود کے اندر جائز ملکیت کا احترام کیجیے اور ملت کو اطمینان دلائیے تاکہ تعمیری سرگرمیاں اور سرمائے حرکت میں آجائیں اور ملک وحکومت کو خودکفیل اور چھوٹی بڑی صنعتوں سے مالا مال کریں۔''[۳]

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کے نظام سیاست وحکومت میں کسی مخصوص سیاسی نظام کے اختیار کرنے پر زور نہیں دیا گیا۔ یہ دراصل ایک ایسا نظام ہے جس میں ریاست اسلامی جمہوریہ ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست کا سربراہ منتخب ہوتا ہے اور اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ خدا تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے۔ عوام کے ووٹوں سے منتخب شخص (سربراہ مملکت) اللہ تعالیٰ کے نائب یا خلیفہ کی حیثیت سے کام کرتا ہے امور مملکت کی انجام دہی میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی روشنی میں منتخب ارکان پارلیمنٹ کے مشورے سے کام کرتا ہے۔ حکومت کے تینوں شعبے مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ اپنی اپنی جگہ خودمختار اور علیحدہ کام

کرتے ہیں۔

اسلامی ریاست کے سربراہ اور ارکان حکومت کے لیے ضروری ہے کہ مخصوص صلاحیتوں کے حامل ہوں اپنے مقصد میں مخلص ہوں اور ملک وقوم کے مفاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ امام خمینیؒ الحکومتہ الاسلامیہ میں فرماتے ہیں:

''حکمرانوں میں جن زیادہ سے زیادہ اوصاف کا ہونا ضروری ہے ان کا سرچشمہ اسلامی حکومت کی طبیعت ومزاج میں موجود ہے۔ قطع نظر ان تمام اوصاف کے جن سے ایک عام حکمران کا متصف ہونا ضروری ہے جیسا کہ عاقل و بالغ اور معاملہ فہم ہونا وغیرہ۔ اسلامی حکومت میں حکمراں کے لیے ان کے علاوہ بعض دوسرے اوصاف کا حامل ہونا بھی ضروری ہے یعنی اسلامی قانون کا علم رکھنا اور اس میں عدالت کا ہونا چونکہ اسلامی حکومت قانون کی حکمرانی کا نام ہے اس لیے مسلمان حاکم کا فرض ہے کہ وہ قانون کا علم رکھتا ہو۔''[۴]

امام صاحب نے اپنے الٰہی اور سیاسی وصیت نامے میں صدر جمہوریہ، ارکان پارلیمنٹ اور حکومت کے بنیادی شعبوں سے وابستہ افراد کے لیے رہنمائی کے اصول فراہم کیے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

''صدر جمہوریہ اور پارلیمنٹ کے اراکین اس طبقے سے تعلق رکھتے ہوں جنھوں نے معاشرے کے محروموں اور مستضعفون کی محرومیت اور مظلومیت کو لمس کیا ہو۔ ان کی فلاح و بہبود کا خیال ہو وہ سرمایہ دار، جاگیر دار یا عیش وعشرت اور لذت میں غرق طبقے سے تعلق نہ رکھتے ہوں کیونکہ ایسے لوگ بھوکوں اور غریبوں کی محرومیت ان کے رنج والم کی تلخی محسوس نہیں کرسکتے۔''[۵]

امام صاحب کا خیال ہے کہ صدر جمہوریہ اور پارلیمنٹ کے ارکان کے انتخاب کے لیے ذمہ دار روشن خیال تعلیم یافتہ افراد اور متقی علماء سے مشورہ کرنا بہتر ہوگا۔ انھوں نے پارلیمنٹ کے ارکان کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ اسلام اور جمہوری اسلامی کے وفادار ہوں

اور اس قسم کے افراد عام طور پر معاشرے کے متوسط اور محروم طبقے ہی میں ملتے ہیں۔ صراط مستقیم سے منحرف ہوکر مشرق ومغرب کی جانب مائل نہ ہوں۔ منحرف دبستانوں سے دل بستگی نہ رکھتے ہوں تعلیم یافتہ نیز اسلامی سیاستوں اور حالات حاضرہ سے باخبر ہوں۔[۶]

حکومت کے فرائض کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ کہتے ہیں'' اور ارکان حکومت پارلیمنٹ اور دوسرے ذمہ داروں کو وصیت کرتا ہوں کہ ملت کی قدر کیجیے اور ان کی خدمت گزاری خاص طور سے محروم مستضعفوں اور ستم رسیدوں کی خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کیجیے۔ یہ ہماری آنکھوں کے نور اور ہم سب کے ولی نعمت ہیں۔ طاغوت حکومت کی جولوٹ مار کرنے والی، ثقافت سے عاری، مطلق العنان حکومتیں تھیں اور ہیں ہمیشہ مذمت کیجیے البتہ ایک اسلامی حکومت کے شایان شان انسانی اعمال کے ذریعے۔[۷]

حکومت کا قیام بذات خود ایک مقصد ہے یا مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اس بارے میں امام خمینیؒ لکھتے ہیں'' اسلام میں حکومت مقصد بالذات نہیں ہے یہ تو حصول مقصد یعنی اسلام کے عادلانہ نظام اجتماعی کے نفاذ کا ذریعہ ہے۔ جب تک اس کا یہ پاکیزہ اور ارفع مقصد موجود رہے گا اس وقت تک اس کی قدر و قیمت بھی باقی ہے لیکن جب اس کا مقصد محض حصول اقتدار اور جملہ وسائل حکومت پر قبضہ کرنا ہوتو یہ چیز ذلت اور پستی کے لحاظ سے جرم کی حد تک پہنچ جاتی ہے ایسی صورتیں اس کے طلب گار جرائم پیشہ لوگوں میں شمار ہوتی ہیں۔''[۸]

ہر حکومت کے تین بنیادی شعبے مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ ہوتے ہیں۔ ان تینوں شعبوں کے بارے میں حضرت امام خمینیؒ نے واضح طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ مقننہ قانون سازی کا ذمہ دار ہوتا ہے اس کے بارے میں آپ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ اگر صدر جمہوریہ اور پارلیمنٹ کے اراکین اسلام کے وفادار اور ملک وملت کے خیر خواہ اور صالح افراد ہوں تو بہت سی مشکلات پیش ہی نہیں آئیں گی اور اگر کوئی مشکل ہو بھی تو وہ برطرف ہوجائے گی۔[۹]

انتظامیہ کا شعبہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔ قانون کے نفاذ اور اس پر عملدرآمد کی

ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ اس بارے میں آپ فرماتے ہیں ''جن چیزوں کی اصلاح، تطہیر اور دیکھ بھال ضروری ہے ان میں ایک قوۃ مجریہ و انتظامیہ ہے۔ بعض اوقات ممکن ہے کہ پارلیمنٹ معاشرے کے لیے مفید و ترقی یافتہ قانون پاس کرے، شوریٰ نگہبان اس کی توثیق کردے اور ذمہ دار وزیر نفاذ کے لیے اس کا اعلان بھی کردے لیکن معاملہ جب نالائق افسروں کے ہاتھ میں آئے تو وہ اسے مسخ کردیں اور قانون کے دفتری پیچ وخم کے ذریعے جس کے وہ عادی بن چکے ہیں یا جان بوجھ کر عوام کو پریشان کرنے کی غرض سے غلط اقدام کر کے رفتہ رفتہ اپنی کوتاہیوں سے ہنگامہ برپا کرادیں۔'' ۲۷ جس لحاظ سے لائق قابل اور سمجھ دار افراد کا انتظامیہ میں تقرر ضروری ہے۔ ''گورنروں کے انتخاب پر بھی توجہ دینا ضروری ہے کیونکہ وہ انتظامی معاملات کے نگران ہوتے ہیں۔ امام صاحب ہدایت کرتے ہیں کہ گورنروں کے انتخاب میں پوری توجہ اور دقت نظر سے کام لیا جائے احساس ذمہ داری رکھنے والے دیندار لائق عاقل اور عوام سے مفاہمت رکھنے والے افراد کا انتخاب کریں تاکہ ملک میں زیادہ سے زیادہ امن و امان اور سکون و اطمینان کی فضا قائم ہوسکے۔'' ۱۰

خارجہ امور کی طرف توجہ دینا جدید دور میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اس بارے میں امام صاحب فرماتے ہیں کہ ہر اس عمل سے قطعی طور پر پرہیز کیجیے جس میں وابستگی کا اس کے تمام جہات کو مدنظر رکھتے ہوئے ذرہ برابر بھی شائبہ ہو اور یقین جانئے کہ وابستگی اگرچہ بعض امور میں ممکن ہے کہ اس کا ظاہر پرفریب ہو یا فی الوقت اس سے فائدہ حاصل ہو لیکن آخر کار بنیادوں کو منہدم کردے گی۔ اسلامی ملکوں سے تعلقات قائم کرنے اور حکمرانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کیجیے نیز انھیں وحدت و اتحاد کی دعوت دیجیے۔ ۱۱

امام صاحب بڑی طاقتوں سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو بے خوف ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان سے اپنا حق واپس لینے کے لیے پوری کوشش کرو بڑی طاقتوں اور ان کے ایجنٹوں کے پروپیگنڈوں اور ان کے ہاہوسے مت ڈرو۔ ۱۲

موجودہ زمانے میں سیاسی معاملات اور حکومتی امور میں فوجی مداخلت بڑھتی جارہی ہے متعدد ملکوں میں حکمران طبقہ فوج سے تعلق رکھتا ہے۔ فوج کی اہمیت پر توجہ دلاتے ہوئے امام خمینیؒ فرماتے ہیں۔

''آج دنیا میں بڑی طاقتیں اور تخریب کار سیاستیں سب سے زیادہ جس چیز اور جس گروہ سے فائدہ اٹھاتی ہیں وہ یہی مسلح طاقتیں ہیں ان کے ذریعے سیاسی چالوں کے ذریعے فوجی بغاوت اور حکومتوں کا تختہ الٹنے کا کام لیا جاتا ہے۔ عیار و مکار مفاد پرست ان کے بعض کمانڈروں کو خرید لیتے ہیں اور ان کے ہاتھوں نیز فریب خوردہ کمانڈروں کی سازشوں کے ذریعے ملکوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور مظلوم قوموں پر اپنا اقتدار جما کر ملکوں کی آزادی و استقلال کو چھین لیتے ہیں۔ ۱۳ امام صاحب افواج کو سیاست سے دُور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں انھیں ہدایت کرتے ہیں کہ وہ کسی پارٹی یا جماعت میں شامل نہ ہوں اور خود کو سیاسی کھیلوں سے دُور رکھیں اس صورت میں وہ اپنی عسکری طاقت کو برقرار رکھ سکتے ہیں اور اندرونی اختلافات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ (۱۴) امام صاحب کا خیال ہے کہ اگر پاک دامن کمانڈر مسلح طاقتوں کے سربراہ ہوں تو ملک دشمن کی فوجی بغاوت یا کسی ملک پر قبضہ کر لینے کا امکان نہیں رہ جاتا اگر کبھی کوئی ایسا موقع آ بھی جائے تو احساس ذمہ داری رکھنے والے باوفا کمانڈر اسے ناکام بنادیں گے۔'' ۱۵

عدلیہ کے اعلیٰ ترین عہدیداروں کے تقرر کے لیے وہ ہدایت کرتے ہیں کہ ایسے افراد کو منصوب کیا جائے جو اسلامی وملی مسائل اور سیاست میں صاحب نظر ہوں، ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں اور پاک وصاف ماضی کے مالک ہوں۔ ۱۶

سیاست وحکومت کے بارے میں امام خمینیؒ کے نظریات و افکار بڑے واضح اور سائنٹفک انداز کے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''ہم ایسی اسلامی حکومت کی تشکیل کے لیے کوشاں

ہوں جس کی قیادت فقہاء عدول کے ہاتھ میں ہو جو عوام کو استعمار اور اس کے گماشتوں کے چنگل سے آزاد کرائے اور معاشرے سے استعمار کے تمام آثار محو کردے۔" ۱۷

امام خمینیؒ نے اسلامی حکومت کا تفصیلی خاکہ پیش کیا تا کہ لوگ اس کا مطالعہ کریں اور ایک جدید طرز کی اسلامی ریاست کی بنیاد استوار کرسکیں۔ لیکن انقلاب ایران کے مخالفین نے کہا کہ امام خمینیؒ کی تھیوکریسی (ملائیت) کو اب آئینی شکل دے دی گئی ہے اور ولایت فقیہ کی آڑ میں لوگوں کو انسانی حقوق سے محروم کیا جارہا ہے اور شخصی حکومت کے لیے راہ ہموار کی جارہی ہے۔ ۱۸ لیکن مخالفین کی یہ سب باتیں غلط اور محض پروپیگنڈہ ثابت ہوئیں۔ دنیا نے دیکھا کہ حضرت امام خمینیؒ کے افکار و خیالات کی روشنی میں اسلامی جمہوریہ ایران کی تعمیر اس کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بلکہ ایک ذریعہ ثابت ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ "امام صاحب کے اس منفرد انقلاب کا جذبہ محرک صرف اور صرف قانون الٰہی کا اجراء و نفاذ تھا۔ یہ قانون محض شرعی احکام نہ تھے بلکہ وہ اساسی قانون جسے قرآن کبھی نظام ربوبیت سے تعارف کراتا اور کبھی "مما رزقنٰھم ینفقون" کی اصطلاح سے یاد کرتا ہے کبھی قل العفو کہہ کر اقوام عالم کو متوجہ کرتا ہے۔ امام صاحب نے اس مفروضے کو باطل کردیا کہ صاحبان علم محض تصورات کی دنیا میں رہتے ہوئے عمل کی دنیا میں بے اثر ہوتے ہیں۔ انقلاب ایران نے روحانیوں کے تصور کو نئے معنی و مفہوم و تصور عطا کئے ہیں کہ علماء کو سیاست سے اتنا ہی باخبر ہونا چاہیے جتنا فقہ کے مسائل پر انھیں دسترس حاصل ہو۔" ۱۹

آج کا اسلامی جمہوریہ ایران تھیوکریسی کا مظہر و علمبردار نہیں ہے۔ اس کی تعمیر و تشکیل حضرت امام خمینیؒ کے ان نظریات و افکار کی روشنی میں ہوئی ہے اور ابھی یہ عمل جاری ہے جو انھوں نے سیاست و حکومت کے بارے میں وقتاً فوقتاً پیش کئے۔ آج کا ایران ایک ایسی اسلامی جمہوری ریاست ہے جس میں رہنے والے تمام باشندوں کے حقوق محفوظ ہیں خواہ وہ اکثریت میں ہیں یا اقلیت سے ان کا تعلق ہے، جہاں قرآن و سنت ہے اوّل و آخر ایک معیار ہے۔ حضرت امام خمینیؒ

کے انقلابی اور قائل عمل افکار اور ان کے کارناموں کا اعتراف دشمن طاقتیں بھی کرتی ہیں۔ بلاشبہ ایک ایسی شخصیت ہیں جو قوموں میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ بقول شاعر:

ہو ہر صدی میں اگر پیدا ایک ایسا امام
تو لوح دنیا سے مٹ جائے شرک و کفر کا نام ۲۰

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے افکار و خیالات کی روشنی میں اسلامی دنیا اپنی سیاست و حکومت کی بنیادیں استوار کرے۔

ماخذ:

۱۔ Nation Tehran 1938 P-97
۲و۳۔ سید اسعد گیلانی: امام خمینیؒ دعوت تحریک اور افکار ص ۱۱۲
۴۔ حضرت امام خمینیؒ: صحیفہ انقلاب ص ۵۱
۵۔ ایضاً ص ۴۸
۶۔ ایضاً ص ۳۷
۷۔ سیّد اسعد گیلانی: امام خمینیؒ دعوت تحریک اور افکار ص ۲۵-۱۲۴
۸۔ حضرت امام خمینیؒ: صحیفہ انقلاب ص ۵۲
۹۔ ایضاً ص ۵۷
۱۰۔ ایضاً ص ۵۸ (۲۹) ایضاً ص ۵۹ (۳۰) ایضاً ص ۹۳ (۳۱) ایضاً ص ۲۵-۲۴
۱۱۔ ایضاً ۲۷
۱۲۔ ایضاً ص ۵۳
۱۳۔ ایضاً ص ۵۳
۱۴۔ سیّد اسعد گیلانی: امام خمینیؒ دعوت تحریک اور افکار میں ۲۴۱
۱۵۔ سبط حسن: انقلاب ایران ص ۲۸
۱۶۔ سیّد عبدالقدوس: امام خمینیؒ اور انقلاب ایران ص ۱۲
۱۷۔ طلوع انقلاب: مجموعہ شعر ص ۱۱۸

شعبۂ تحقیق سازمان تبلیغات اسلامی

شیطانی سازشوں کا ہتھکنڈہ: ایک تجزیہ

الٰہی ادیان ومذاہب کی تاریخ میں ایک جوان ترین مذہب کی حیثیت سے جہاں مذہب اسلام نے غیر معمولی عالمی مقبولیت حاصل کی ہے وہیں اس کے دشمنوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔عالمی سامراج کے زر خرید غلام سلمان رشدی کی 'شیطانی آیات'' نامی کتاب اسلام کی بدنامی ورسوائی کے لئے رچی گئی شرمناک سازشوں کا ایک اہم حصہ تھی ۔ واضح رہے کہ ایسے کام کے لئے اسلام دشمن طاقتیں نام نہاد مسلمانوں کا انتخاب کیا کرتی ہیں تاکہ سادہ لوح اور زود باور مسلمانوں کو آسانی سے اس فریب کا شکار بنایا جاسکے اور دوسری طرف غیرت دار مسلمان ندامت وشرمندگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوجائیں یا دوسرے بھولے بھالے مسلمانوں کی طرح وہ بھی اسلام سے بدگمان ہوجائیں ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور شیطانی آیات کی اشاعت کے بعد عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کی رسوائی کا بازار گرم ہوگیا اور پوری دنیا ئے اسلام پر موت جیسا سناٹا طاری رہا۔مفتیان شرع جانی اور مالی نقصان کے خوف کی وجہ سے خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے کہ اسی اثنا میں خداوند عالم کے علاوہ دنیا کی کسی بڑی طاقت سے نہ ڈرنے والے امام خمینی نے رشدی کے خلاف وہ تاریخ ساز فتویٰ صادر کردیا جس نے نہ صرف سلمان رشدی بلکہ دنیا کے تمام اسلام دشمنوں کو لرزہ براندام کردیا۔ملاحظہ ہو ذیل میں اسلامی ماخذ کی روشنی میں اس فتوے کا اجمالی تجزیہ؛

بڑے شیطان امریکہ اور بوڑھے استعمار برطانیہ کے منصوبہ پر عمل کرنے والے ''شیطانی آیات'' کے مصنف (سلمان رشدی) اور اس کتاب کے مطالب سے آگاہ ناشرین کے واجب القتل قرار دیئے جانے سے متعلق مسلمانوں کے عظیم رہبر اور ولی امر کے حکم نے اس صدی کے استعمار کے پیکر پر سب سے زیادہ کاری ضرب لگائی اور پوری دنیا میں اس حکم کی

اشاعت نے نہ صرف دشمنانِ اسلام کی اس زبردست ثقافتی سازش کو ناکام بنادیا بلکہ استعماری قلم فروشوں کے اوپر اس قدر رعب و وحشت طاری کردی ہے کہ اب کسی نام نہاد مصنف یا خود ساختہ دانشور میں اسلام کے خلاف جلدی کچھ لکھنے کی جرأت نہ ہوگی۔

الٰہی حدود جاری ہونے کے یہی وہ قیمتی ثمرات و نتائج ہیں جن کے پیشِ نظر پیغمبرِ اسلامؐ نے الٰہی حدود میں سے ایک حد کے اجراء کو کرۂ زمین کے ساکنوں کے لیے چالیس روز کی بارش اور بارانِ رحمت سے بھی زیادہ قیمتی قرار دیا ہے اور چونکہ تمام الٰہی حدود وقوانین کا نفاذ امام عادل کی حاکمیت اور اس کی طرف سے تقاضائے وقت کے مطابق صادر کیے جانے والے صحیح اور مؤثر حکم پر موقوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے گھڑی بھر کی امامت اور معاشرہ میں امام کے وجود کو ستر سال کی عبادت سے افضل قرار دیا ہے۔

"قالَ رسول الله صلى الله عليه وآله: ساعة امام عادل افضل من عبادة سبعين سنة وحديقام للّٰهِ في الارض افضل من مطر اربعين صباحاً"

اور امام موسیٰ کاظمؑ نے تاریخ کی ان عظیم شخصیتوں کو نعمتِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے جو خداوند عالم کی جانب سے مبعوث ہوئے تاکہ اپنی حکیمانہ قیادت و رہبری اور حدود الٰہی کے اجراء کے ذریعہ دنیا میں عدل و انصاف کو زندہ کریں اور زمین و اہلِ زمین کو ایک نئی زندگی عطا کریں:

"امام موسیٰ کاظمؑ نے قرآن کی آیت "خداوند عالم زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے" کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ خداوند عالم بارش کے ذریعہ زمین کو زندہ کرتا ہے بلکہ خداوند عالم ایسے عظیم افراد کو مبعوث کرتا ہے جو عدل و انصاف کو زندہ کر کے زمین کو حیاتِ نو بخشتے ہیں کیونکہ زمین پر ایک الٰہی حد کا اجراء کیا جانا چالیس شب و روز کی بارانِ رحمت سے زیادہ نفع بخش ہے۔" (وسائل الشیعہ: ج-۱۸، ص ۳۰۸)

موجودہ دور میں وقت کے اس حساس موڑ پر تاریخِ اسلام کا ایک عظیم عادل و شائستہ ترین رہبر اپنے تاریخی فتوے کے ذریعہ استعمار کے اُس پست و ذلیل غلام کے قتل کا حکم صادر

فرماتا ہے جس نے بڑے ہی بھیانک جرائم کا ارتکاب کیا یعنی اس نے پاکیزہ ترین مخلوقِ حق اور درخشندہ ترین جلوۂ پروردگار، تمام رسولوں کے سردار خاتم الانبیاء حضرت محمد بن عبداللہؐ کی پاکیزہ شان میں گستاخی کی ہے اور ان کی محترم ازواج اور اصحاب کرام نیز دیگر جلیل القدر الٰہی انبیاء مثلاً حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ اور حضرت اسماعیلؑ ذبیح اللہ کی اہانت اور وحی، جبریل، مرکزِ وحی مکہ نیز دیگر اسلامی مقدسات کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ اپنے عصر کے ولی فقیہ نے اس بابرکت حکم کو صادر فرمانے اور اس اعلان کے ساتھ ہی ساتھ یہ کہہ کر کہ اس کی توبہ قبول نہیں ہے، دشمنانِ خدا اور رسولؐ کی سازشوں کے مقابل اسلام کے تحفظ اور اس کی عزت کی ضمانت فراہم کردی اور اب مسلمانانِ عالم انشاء اللہ سالہا سال تک اس حکم کی برکات سے فائدہ اُٹھاتے رہیں گے۔

اب ہم تمام اہل اسلام کی خدمت میں اس مقدس حکم کے مآخذ و مدارک اور شرعی دلیلیں پیش کرتے ہیں نیز عالمِ اسلام کی ان دینی و سیاسی شخصیتوں، گروہوں اور ثقافتی و دینی مراکز و اداروں کو بھی اس سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اپنی غفلت و بے توجہی کی وجہ سے اس حکم شرعی کے مآخذ و مدارک کے سلسلہ میں خاموشی اختیار کی اور اس الٰہی حکم کی تائید و حمایت کے اعلان اور حق کے اس دھارے کی تقویت نیز دشمنانِ خدا و رسولؐ پر رعب و وحشت طاری کرنے کے بجائے اپنے سکوت کے ذریعہ نہ صرف بہت سے ناواقف مسلمانوں کو شکوک و شبہات میں ڈال دیا بلکہ دشمنانِ خدا کو اپنی طرف سے شاد و مسرور بھی کیا ہے۔ ہم یہاں معتبر روایات و احادیث کو شیعہ اور اہلِ سنت کے معتبر ترین روایاتی مجموعوں نیز تاریخ شیعیت کے عظیم فقہاء اہلِ سنت کے ائمہ اربعہ اور اسلامی مذاہب کے دیگر مشہور و معروف مفتیوں کے فتاویٰ کو حسب ذیل تین ابواب کے تحت پیش کرتے ہیں تاکہ امام خمینی قدس سرہٗ کے اس قاطع و محکم حکم کی اصالت و حقیقت پورے طور سے واضح ہوجائے:

پہلا باب: فریقین کی روایات نیز ائمہ و فقہائے مذاہب خمسہ کے فتاویٰ کی روشنی میں مرتد کا واجب القتل ہونا۔

دوسرا باب: فریقین کی روایات اور ائمہ وفقہائے مذاہب خمسہ کے فتووں کی روشنی میں نبیؐ پر سب وشتم کرنے والے کا واجب القتل ہونا۔

تیسرا باب: ثقافتی حملہ آوروں اور دشمنوں سے اسلامی عقائد کی سرحدوں کا دفاع۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے مرتد کا حکم

سورۂ بقرہ کی ۲۱۷ویں آیت میں ارشاد ہے:

اور جو شخص تم (مسلمانوں) میں سے اپنے دین سے پھر جائے اور کفر کی حالت میں مرے۔ ایسے لوگوں کے اعمال دُنیا وآخرت میں ضبط ہوجاتے ہیں اور یہ لوگ اہلِ جہنم ہیں اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

مرتد کی تعریف:

ہر وہ شخص جو مسلمان ہو اور بعد میں اسلام کو ترک کر کے دوسرا دین وآئین اختیار کرلے یا اسلام اور اس کے مقدسات کا مضحکہ اُڑائے اور ان کی اہانت کرے یا پیغمبرِ اسلامؐ کی رسالت کو جھٹلائے یا کسی خاص غرض کے تحت اسلام پر اعتراضات کرے، وہ مرتد ہے، جیسا کہ امام خمینیؒ نے اپنی کتاب ''تحریر الوسیلہ'' میں اور شیعوں کے عظیم فقیہ صاحبِ ''جواہر الکلام'' نیز عقائد نسفی کے شارح نے ''مرتد'' اور ''کافر'' کی اسی عنوان سے تعریف کی ہے۔

امام خمینی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

''کافر وہ شخص ہے جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین وآئین کا انتخاب کرے یا دین اسلام کو تسلیم کرتا ہو لیکن بعض ضروریات کا اس طرح انکار کرے کہ اس کا نتیجہ پیغمبرِ اسلامؐ کی رسالت کے انکار کی شکل میں برآمد ہو یا سیدھے سیدھے پیغمبرِ اکرمؐ کی رسالت ہی کو جھٹلا دے یا دین اسلام میں نقص نکالے اور اس پر اعتراض درست سمجھے یا ہر وہ کام کرے یا ایسی بات کہے جس کا نتیجہ کفر ہو۔ کفر کی ان تمام صورتوں میں مرتد، جو پہلے مسلمان تھا اور بعد میں کافر ہوا

ہو یا جو شروع سے ہی کافر رہا ہے، کوئی فرق نہیں ہے۔" (تحریر الوسیلہ، ج-۱، ص-۱۱۸)

صاحب "جواہر الکلام" فرماتے ہیں:

"ارتداد متعدد طریقوں سے ثابت ہو جاتا ہے۔ یہاں پر آپ چند طریقے شمار کرنے کے بعد فرماتے ہیں: کبھی ارتداد ہر اس کام کے ذریعہ ثابت ہوتا ہے جس سے صاف طور پر دین اسلام کا مضحکہ اُڑایا جائے یا اس کی اہانت ہوتی ہو۔" **(جواہر الکلام، ج-۴۱، ص-۶۰۰)**

علامہ نسفی اپنی مشہور کتاب "عقائد نسفی" میں تحریر فرماتے ہیں:

"دین کا مذاق اُڑانا کفر ہے کیونکہ یہ بھی دین کو جھٹلانے کی نشانیوں میں سے ہے۔" (شرح عقائد نسفی: ص-۲۴۸، المقنع کتاب المرتد)

مذکورہ بالا دو تعریفوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ "شیطانی آیات" کا مصنف سلمان رُشدی دو جہتوں سے مرتد ہے۔ ایک یہ کہ پہلے وہ مسلمان تھا بعد میں اس نے عیسائیت کو اپنے دین کے عنوان سے منتخب کیا۔ اور دوسرے اس نے دین و وحی کا مذاق اُڑایا ہے، ان کی اہانت کی ہے اور اسلامی شریعت پر اعتراضات کیے ہیں گویا ایک جملہ میں یوں کہا جائے کہ وہ "دو آتشہ" مرتد ہے۔

مرتد کی قسمیں

مرتد فطری و مرتد ملّی: اگر کوئی شخص فطرت اسلام پر پیدا ہو (یعنی مسلمان خاندان میں پیدا ہوا اور اس کے ماں باپ یا ان میں سے کوئی ایک مسلمان ہو) پھر وہ اس دین کو چھوڑ دے اور مرتد ہو جائے تو اسے مرتد فطری کہتے ہیں۔ اور اگر کافر گھرانہ میں پیدا ہوا اور مسلمان ہو کر پھر کافر ہو جائے تو اسے مرتد ملی کہتے ہیں۔

دونوں قسموں کے مرتد کی سزا تمام اسلامی مذاہب کی نگاہ میں قتل ہے۔ جیسا کہ تمام اسلامی مذاہب اس بات کے معتقد ہیں کہ اگر مرتد ملی توبہ کرے تو قانوناً اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور وہ قتل کی سزا سے بری ہو جائے گا، لیکن اگر مرتد فطری توبہ کرے تو مذہب امامیہ

اور بعض دیگر مذاہب یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی توبہ قانوناً قبول نہیں ہوگی جبکہ بعض علماء اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی توبہ بھی قبول ہوگی جس کی وضاحت ہم اس فصل کے آخر میں کریں گے۔

فریقین کی روایات میں مرتد کا واجب القتل ہونا

(الف) مذہب امامیہ کی روایت: مرتد کے واجب القتل ہونے کے سلسلہ میں شیعوں کے یہاں بہت سی روایتیں موجود ہیں۔ ہم یہاں نمونہ کے طور پر اپنی معتبر کتابوں سے بعض روایتیں پیش کرتے ہیں:

امام محمد باقرؑ کے ایک صحابی محمد بن مسلم نقل کرتے ہیں کہ میں نے امامؑ سے مرتد کے حکم کے سلسلہ میں سوال کیا۔ حضرتؑ نے فرمایا: (مرتد) وہ شخص ہے جو مسلمان ہونے کے بعد اسلام سے پھر جائے اور جو کچھ حضرت محمدؐ پر نازل ہوا ہے اس سے انکار کردے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہے، اس کا قتل واجب ہے۔ اس کی زوجہ اس سے جدا ہوجائے اور اس کا مال وترکہ وارثوں میں تقسیم کردیا جائے۔ (وسائل الشیعہ: ج-۸، ص-۵۴۴)

اس سے امامؑ کی مراد یہ تھی کہ مرتد کو ایک مردہ سمجھنا چاہیے کہ جس کی بیوی اور مال و جائداد اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

امام جعفر صادقؑ کے صاحبزادے یعنی علی بن جعفرؑ نقل کرتے ہیں کہ میں نے اپنے بھائی امام موسیٰ کاظمؑ سے مسلمان سے متعلق حکم دریافت کیا جو عیسائی ہوگیا ہو۔ حضرتؑ نے فرمایا: ایسا شخص قتل کردیا جائے اور اس کی توبہ قبول نہ کی جائے۔ (وسائل الشیعہ: ج-۱۸، ص-۵۴۵)

عمار ساباطی کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: مسلمانوں میں سے جو شخص بھی اسلام سے روگردانی کرے اور مرتد ہوجائے حضرت محمدؐ کی نبوت کا انکار

کرے اور اسے جھٹلائے تو بلاشبہ ہر اس شخص کے لیے اس کا خون مباح ہے جو اس سے ارتداد کی باتیں سنے۔ اور مسلمانوں کے امام پر لازم ہے کہ اسے قتل کردے، اس سے توبہ کا مطالبہ نہ کرے۔ (وسائل الشیعہ: ج-۱۸، ص-۵۴۵)

حسین بن سعید نقل کرتے ہیں کہ میں نے ایک خط دیکھا جس میں ایک شخص نے امام رضاؑ کی خدمت میں لکھا تھا کہ ایک شخص مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا اور اس کے بعد کافر و مشرک ہوکر اسلام سے خارج ہوگیا، کیا اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے؟ یا اس سے توبہ کا مطالبہ کیے بغیر قتل کردیا جائے؟ حضرتؑ نے جواب میں تحریر فرمایا: قتل کردیا جائے۔ (وسائل الشیعہ: ج-۱۸، ص۵۴۶)

فضیل بن یسار امام جعفر صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: مسلمانوں میں سے ایک شخص عیسائی ہوگیا۔ اسے امیر المومنینؑ کی خدمت میں لایا گیا۔ حضرتؑ نے اس سے توبہ کرنے کو کہا لیکن اس نے انکار کیا، تو حضرتؑ نے اس کے بال پکڑ لیے اور فرمایا: اللہ کے بندو، اسے خوب مارو، تو لوگوں نے اسے اتنا پیٹا کہ وہ مرگیا۔ (وسائل الشیعہ: ج-۱۸، ص۵۴۵)

ان دو آخری حدیثوں سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جس طرح ممکن ہو مرتد کو جلد از جلد قتل کر ڈالنا چاہیے۔

ابن عباس پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: جس شخص نے اپنے دین (اسلام) کو تبدیل کیا اسے قتل کرڈالو۔ (مبسوط: ج-۷، ص۲۸۱)

محمد بن مسلم سے روایت ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: جو شخص کسی پیغمبر مرسلؐ کی تکذیب کرے اور اس کا انکار کرے اس کا خون مباح ہے۔ (مبسوط: ج-۷، ص۲۸۱)

معاذ (صحابی پیغمبرؐ) یمن میں وارد ہوئے۔ ابوموسیٰ اشعری بھی اس شہر میں موجود تھا۔ لوگوں نے معاذ سے کہا کہ ایک یہودی جو مسلمان ہوا تھا گزشتہ دو ماہ سے دوبارہ مرتد ہوگیا

ہے۔(معاذ) نے کہا، خدا کی قسم میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا (اور بعض مقام پر ہے سواری سے نہ اُتروں گا) جب تک وہ قتل نہ ہوجائے، کیونکہ رسولِ خداؐ نے یہ حکم صادر فرمادیا ہے۔ اس کے بعد اسے قتل کیا اور اس بات پر تمام امت اسلام کا اتفاق و اجماع ہے۔(مبسوط: ج-۷، ص-۲۸۱)

روایت کی گئی ہے کہ ایک مسلمان عیسائی ہوگیا۔حضرت علیؑ نے اس سے دریافت فرمایا: کیا تو مرتد ہوگیا ہے؟ کہا: ہاں۔فرمایا: کیا تمہارا یہ ارادہ ہے کہ ارتداد کے ذریعہ مال و دولت اکٹھا کرو پھر اسلام کی طرف پلٹ آؤ؟ اس نے کہا نہیں۔فرمایا: کیا تم کسی عورت سے شادی کرنے گئے اور اس نے مسلمان ہونے کی وجہ سے تمھیں قبول نہیں کیا۔ اورتم مرتد ہوگئے ہوتا کہ اس سے شادی کرو پھر اسلام کی طرف پلٹ آؤ؟ اس نے کہا نہیں۔فرمایا پھر اسلام کی طرف پلٹ آؤ۔ اس نے جواب دیا: نہیں پلٹوں گا یہاں تک کہ مسیح (عیسیٰ) سے ملاقات کروں۔ پس حضرتؑ نے اسے قتل کردیا۔(مبسوط: ج-۷،ص ۲۸۱)

❁❁❁

ناصر زیدی، پٹنہ (بہار)

جمہوریہ اسلامی ایران اور امام خمینیؒ

دُنیا میں عظیم شخصیتوں کے آنے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا، اور کبھی بھی یہ سلسلہ بند نہیں ہوا۔ ایسی بلند ہستیاں کبھی روحانی اور مذہبی پیشوا بن کر آئیں، جنھیں پیشوائے دین اور اوتار کہا گیا اور کبھی صرف مادّی اور دنیاوی رہبر بن کر، جنھیں سیاسی رہنما اور حکمراں کہا گیا۔ ان میں بے شمار ایسے بھی گذرے جو انقلاب کے بانی کہلائے یا انقلاب لائے۔ یہ انقلاب کبھی ملک گیری کی ہوس میں آیا، کبھی ظلم و تشدد کے خلاف اُبھر آیا، کبھی توسیع پسندی کا جذبہ کارفرما رہا اور کبھی قومیت ووطنیت کے خیالات ونظریات کی بنا پر اُبھرا۔ غرض دنیاوی سیاست کا ہر شعبہ وقت کے تقاضوں کے تحت اپنے اپنے رنگ و آہنگ کا انقلاب لاتا رہا اور مختلف ناموں سے ظاہر ہوا۔ مثلاً معاشی انقلاب، صنعتی انقلاب، فوجی انقلاب اور اسی قسم کے دوسرے انقلابات وجود میں آئے۔

یوں تو انقلاب اسے بھی کہا گیا کہ جب کسی بادشاہ نے دوسرے ملک پر حملہ کیا اور اسے اپنے قبضہ میں لے لیا تو وہاں کے باشندوں نے الناس علی دین ملوکھم کے اصول پر اس حکمراں کے دین کو بھی اپنا لیا۔ حالانکہ شہنشاہیت کبھی بھی اس امر کی متقاضی نہیں کہ وہ کسی مذہب کی پابند رہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اور عوام کو اس کے ذریعہ اپنے قابو میں رکھنے کے لیے کسی ایک مذہب کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے اور اس مذہب کو اپنے اصول ونظریات کے سانچے میں ڈھال لیتی ہے اور جب اس مذہب کے اثرات کو مائل بہ انحطاط پاتی ہے تو اس وقت جس مذہب کے افراد زیادہ قوی نظر آتے ہیں، وہی مذہب مقصد برآری کی خاطر اختیار کرلیتی ہے۔ گویا شہنشاہ یا شہنشاہیت پسند افراد مذہب

کے تابع نہیں ہوتے بلکہ کسی مذہب کو اپنا بنائے رکھتے ہیں۔ ان صورتوں میں جو خارجی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اسی کو انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔

لیکن انقلاب وہ ہے جو ذہنوں میں تبدیلیاں لائے، طریقۂ فکر کو کسی ایک مرکز کی طرف مرکوز کرے اور ایسی قلبِ ماہیت کرے کہ ملک و وطن کی قید سے آزاد ہوکر فکر انسانی غیر متبدل قانونِ فطرت اور نظریۂ حیات کا تابعِ فرمان ہوجائے جس سے بنی نوعِ انسان کے مادّی اور رُوحانی دونوں تقاضے کماحقہ پایۂ تکمیل تک پہنچ سکیں۔

عالمی سطح پر ایسے عظیم انقلاب میری نظر میں صرف دو ہیں۔ ایک تو وہ انقلاب جب خداوند عالم کے نور نے عالمِ تکوین میں حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیہ والثنا کی شکل میں ظہور کیا تو آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے درمیان ہی اس عہد کے نامی گرامی بادشاہوں اور مشہور ممالک کے عوام تک پہنچایا اور پھیل گیا۔ اور دوسرے چودہ سو سال کے بعد وہی انقلاب پھر احیائے دین کی خاطر امام خمینیؒ کے ہاتھوں وجود میں آیا جس کی تابناکیوں نے دنیا کے چپہ چپہ پر پہنچ کر اسلام کی سربلندی و سرفرازی کا پرچم لہرایا اور عوام کے دِلوں کو آتشِ عشقِ الٰہی سے گرمایا۔

سچ تو یہ ہے کہ پندرہویں صدی اسلام کے لیے بڑے زبردست امتحان کی صدی ہے۔ نہ جانے یہ غیبی آواز کہاں سے بلند ہوئی کہ پندرہویں صدی اسلام کی صدی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس اعلان کے پیچھے کسی مافوق البشر طاقت کا ہاتھ ہے اور حالات گواہی دے رہے ہیں کہ واقعاً یہ صدی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی صدی ہے جبکہ اس سے پہلے ہی دُنیا میں مسلمانوں کی آبادی ایک ارب سے زائد ہوچکی تھی، لیکن اسلام بھی اس منزل پر پہنچ چکا تھا کہ اب اگر اسے سنبھالا نہ ملتا تو شاید ہی نصف صدی کے بعد دنیا میں کہیں بھی روحِ اسلام جلوہ گر نظر آتی۔ اس لیے کہ گمراہی و ضلالت کی گھٹائیں حدودِ ممالک سے نکل کر عالمی سطح پر منڈلانے لگی تھیں۔ مسلمان ہر ملک اور ہر قوم کے درمیان پسپا اور ذلیل و خوار ہو رہے تھے اور اسلام

خطرے میں پڑ گیا تھا، لیکن:

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

رحمتِ خداوندی کو جلال آیا اور قدرت نے بھی عالمی سطح پر اپنے دین کے تحفظ کے لیے اسباب مہیا کیے۔ مختلف مسلم ممالک میں اسلامی تحریکیں بقائے اسلام کی خاطر اُبھر آئیں۔ یہاں تک کہ وہ تحریکیں دیگر ممالک کے مسلمانوں کے دِلوں میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے لگیں اور ساری دنیا کے مسلمانوں میں ایک اضطراب اور ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ایسے حالات میں فرانس کی اسلام کش سرزمین پر ایک مردِ مجاہد نے شمع اسلام کی مدھم لو کو تیز کیا اور اتنا بلند کیا کہ رشکِ فرانس سرزمین ایران تک اس کی شعاعیں پہنچ گئیں اور یک بیک نورِ محمدیؐ کے جلوؤں سے سارا ایران جگمگا اُٹھا۔ یہ انقلاب دُنیا کا دوسرا انقلاب ہے جس نے صدرِ اسلام کے بعد وہی حالات و کوائف پیدا کر دیئے جو تکمیلِ اسلام کے وقت موجود تھے۔ اور تمام وہی اثرات نمودار ہوئے جو انقلابِ اوّل کے وقت ظاہر ہوئے۔

رہبرِ انقلابِ اسلامی آیت اللہ سیّد رُوح اللہ الموسوی امام خمینیؒ طاب ثراہ نے ایران کی ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کا قلع قمع کر دیا۔ اب یہ مسلم ممالک کے عوام کا فریضہ ہے کہ اپنے یہاں ایسا ہی نظام قائم کریں اور استکباری طاقتوں کے پنجوں اور شکنجوں سے نجات حاصل کریں۔ اپنے اندر ایسی طاقت پیدا کریں کہ ان کے ہر اقدام اور استکباری طاقتوں کے پنجوں اور شکنجوں سے نجات حاصل کریں۔ اپنے اندر ایسی طاقت پیدا کریں کہ ان کے ہر اقدام پر مخالفینِ اسلام لرزہ بر اندام نظر آئیں۔ جیسا کہ رُشدی علیہ اللعنہ پر توہینِ اسلام کے سلسلہ میں قتل کا فتویٰ صادر ہوا تو ساری دُنیا کے مسلمانوں نے ایک آواز ہوکر امام خمینیؒ کے اس فتویٰ کی پرزور تائید کی، احتجاجات ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ انقلاب سال دو سال کی جدوجہد اور کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہے اور

دنیا میں کوئی بھی انقلاب فوری ہنگاموں اور تشدد سے نہیں آتا، بلکہ ایک طویل عرصہ کی ریاضت ومحنت کا انجام ہوتا ہے۔

اسی طرح انقلاب اسلامی ایران کا بھی ایک طویل سفر ہے جس کی ابتدا کم از کم ۱۸۸۸ء سے ہوتی ہے جب تمباکو کی تجارت سے متعلق آقائے شیرازی کے فتویٰ کی وجہ سے عوام میں ایک انقلابی لہر دوڑ گئی تھی۔ اب تک ایران میں علماء اور حکمراں دونوں عوام کے درمیان اپنا مقام رکھتے تھے اور بظاہر کوئی شدید اختلاف رونما نہیں ہوا تھا لیکن تمباکو کی تجارت سے متعلق جب ناصر الدین شاہ قاچار سے انگریزوں کا معاہدہ ہوگیا تو اس زمانہ کے اعلم آقائے مرزا شیرازی کے فتویٰ ''قلیان کشیدن حرام است'' نے حکومت کے فرمان کو مفلوج بنا دیا۔ اور یہیں سے دین وسیاست میں جدائی کی بنیاد پڑ گئی۔ فاصلے بڑھتے گئے۔ قاچاری حکمراں مغرب کی آغوش میں پہنچ گئے۔ ایران لاوارثی کی زندگی گزارنے لگا۔

۱۹۲۴ء میں پھر انقلاب کا جھٹکا محسوس ہوا۔ قاچاری دور ختم ہوا۔ رضا خاں جو ایک معمولی فوجی تھا، اقتدار پر قابض ہوگیا اور اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے علماء سے کچھ ناقص معاہدے کیے، لیکن اس مشروطیت میں بھی اسلام دشمن رضا خاں اپنی من مانی کرتا رہا اور ایران میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ مغربی تہذیب کی پیروی میں سربراہ مملکت نے اپنی بیوی کو بے نقاب مجمع عام اور جلسوں میں لا کھڑا کیا۔ بے پردگی کو فروغ دیا عورتوں پر ظلم وتشدد کیا اور انھیں گمراہی پر بھی مجبور کیا۔ ۱۹۲۵ء میں مزارات مقدسہ میں پناہ لینے والے اسلام پرست مردوں اور عورتوں پر بے دریغ گولیاں چلائی گئیں۔ مزارات مقدسہ خصوصاً روضۂ امام رضا علیہ السلام پر گولے برسائے گئے۔ علماء کی پگڑیاں اچھالی گئیں۔ اس طرح بے دینی اور لامذہبیت کو رضا خاں نے بھرپور بڑھاوا دیا اور جب مغرب کو اس کی ضرورت نہ رہی تو جوہنسبرگ جلاوطن کر کے اس سے زیادہ مغرب زدہ اس کے بیٹے محمد رضا خاں کو برسر اقتدار لایا گیا جو یورپ اور امریکہ کی منڈی کا مال تھا، جس نے اقتدار میں آتے ہی اپنے آقاؤں کے اشارے پر چار سال کے بعد

ءی ۱۹۵۴ء میں تیل کی صنعت کا نیشنلائزیشن عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے کیا اور اس طرح امریکہ کے اقتدار کو ایران میں اور زیادہ مستحکم کیا، جس کی صورت یہ تھی کہ ذہین طبقہ کے افراد کو حصولِ تعلیم کے لیے فرانس، امریکہ اور برطانیہ وغیرہ بھیجا جانے لگا۔ اور جب وہ تعلیم حاصل کر کے واپس آئے تو مغربی تہذیب وتمدن اور اس سے قلبی لگاؤ کا غلاف اوڑھ کر اپنے وطن واپس آئے جہاں انھیں بڑے بڑے عہدوں اور تعلیمی اداروں پر مسلط کردیا گیا تاکہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ ایران کے معاشرے اور تمدن کو مغرب کے سانچے میں ڈھال دیا جائے چنانچہ حکومت کی سرپرستی میں عوام مغربی شیشہ میں اُترتے چلے گئے۔

۱۹۶۲ء میں اصلاحات ارضی کا بل پارلیمنٹ سے منظور ہوا جس کا سب سے بدترین رُخ یہ تھا کہ اوقاف کو ختم کردیا گیا۔ ان اوقاف سے دین اسلام کی حفاظت کے امور رُوحانی حضرات انجام دیتے تھے۔ مدرسوں کے اخراجات اور تعلیمات اسلامی سے متعلق تمام ضروریات، سب کچھ کا دارومدار انھیں اوقاف پر تھا۔ اس لیے کہ حکومت کسی قسم کا تعاون کرنے کے عوض ہمیشہ دین اسلام اور اس کی قدروں کے استحصال میں مصروف رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام دو حصوں میں منقسم ہوگئے۔ ایک مقتدر طبقہ، جس کی حکمرانی اعلیٰ اور ادنیٰ ہر سطح پر تھی۔ اور دوسرا رُوحانی طبقہ جو حکومت کے مظالم اور اپنی بے بسی سے بیحد متفکر اور پریشان تھا۔ ایران تمام مغربی برائیوں کا مرکز بن گیا۔ ہر طرح کی غلاظتوں کا ڈھیر ہر طرف نظر آنے لگا اور ان تمام تباہیوں کے لانے میں امریکہ سرِورق تھا۔

محمد رضا خاں پہلوی کے بڑھتے ہوئے مغربی رجحانات کی زد میں سارا ایران آگیا۔ اس نے ملک میں موڈرنائزیشن اور لیبرلائزیشن کی خاطر ظلم واستبداد کی انتہا کردی۔ ہزاروں بے گناہ افراد تہہ تیغ کردیے گئے۔ ہاتھ پاؤں سے لنج اور مفلوج بنادیے گئے۔ آنکھوں میں لوہے کی گرم سلاخیں اُتاری گئیں دیدے نکال دیے گئے، بجلی کے جھٹکے دیے گئے، بچوں کو ماؤں کے سامنے قتل کیا گیا۔ عورتیں بیوہ بنائی گئیں، شوہر کے سامنے عورتوں کی عصمت دری ہوئی،

جوانوں کو تعزیر مذلت میں دھکیلا گیا، شکنجوں میں جکڑ کر جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا، خون کی ندیاں بہائی گئیں، بے راہ روی، گمراہی اور بدکرداری کو بڑھاوا دیا گیا، ذرائع ابلاغ ریڈیو، اخبارات، ٹیلی ویژن اور فلموں کے ذریعے معاشرہ کو مغرب زدہ بلکہ اس سے بھی بدتر بنانے کی تمام تر کوششیں صرف کر ڈالی گئیں۔ عورتوں میں بداخلاقیوں کو پھیلانے کے لیے اس نے اپنے باپ کی روش اختیار کی۔ جیسا کہ اس نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے:

''ترکی پہلا اور ایران دوسرا اسلامی ملک تھا جس نے پردے کے استعمال پر سرکاری طور پر پابندی عائد کی اور ہر سال ماہ دی کی ۱۷ تاریخ کو ایرانی عورتیں ایک جشن مناتی ہیں۔ جشن میرے والد کے ان بڑے کارناموں کی یاد میں منایا جاتا ہے جو انھوں نے ایرانی خواتین کی آزادی اور فلاح کے لیے انجام دیئے۔'' (وطن کے لیے میرے عزائم: ص ۲۶۴)[۱]

اس طرح ایران اپنے مغربی آقاؤں سے بھی دو قدم آگے نکل گیا، لیکن ان حالات میں بھی صالح طبیعتیں ایران میں موجود تھیں۔ چنانچہ جب دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے ہر طرف ابتری اور بے چینی پھیلی تو بعض عورتیں جو حکومت کی سختی کی وجہ سے مجبوراً پردہ نہیں کرسکتی تھیں، پھر اپنی اصلی حالت پر واپس آگئیں اور نقاب اوڑھنے لگیں۔ اگرچہ پردے پر قانونی طور پر پابندی لگادی گئی تھی اور یہ حال تھا کہ اگر کوئی عورت سڑک پر برقع اوڑھے نظر آتی تو جو بھی اس سے قریب تر پولیس کا سپاہی ہوتا فوراً وہاں پہنچ جاتا اور زبردستی برقع اُتار دیتا تھا، لیکن جنگ کی وجہ سے جو افراتفری پھیلی تو اسلام کی دبی ہوئی چنگاری پھر اُبھر کر سامنے آگئی، مگر یہ کیفیت زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہی۔ محمد رضا خاں دولت کی فراوانی سے اندھا اور امریکہ کی دخل اندازی سے مغربی طاقتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا۔ یہودیوں کی تخریب کار ایجنسیاں سارے ایران میں پھیل چکی تھیں، اسلام کی قدروں کو پامال کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگادیا، علماء کا قتل عام ہوا، اور ایران میں دو طبقے نمایاں طور پر اُبھر کر سامنے

آئے۔ ایک روحانی اور دوسرا مقتدر طبقہ۔

امام خمینیؒ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ اسلامی قدروں کی پامالی کو دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے گردوپیش فداکارانِ اسلام کا ایک دانشور گروہ تیار کیا جن میں آقائے بہشتی، آقائے مطہری، آقائے باہنری، آقائے دستِ غیب وغیرہ جیسی عظیم ہستیاں تھیں۔ انھیں میں ایک آقائے علی شریعتی بھی تھے اور ان سب کا کام درس و تدریس تھا۔ ایک منظم نظامِ تدریس قائم کیا، مسجدوں اور مدرسوں کو اسلامی تعلیمات کا مرکز بنا کر وہاں ایمان، تقویٰ، سیاست، اسلام اور جملہ ایسے علوم کی تعلیم دی جانے لگی جو عہدِ حاضر میں بقائے دین اور ارتقائے اسلام کے لیے لازم تھے۔ خود ایران میں استکباری سیاست کا جو جال بچھا ہوا تھا اس سے بھی عوام کو باخبر کرنے کے لیے انہی تعلیمی مراکز میں جدوجہد کی گئی۔

امام خمینیؒ کا مقصد یہ تھا کہ پوری دنیا میں اسلامی انقلاب نمودار ہو، ازبکستان جو کبھی ایران کا ہی ایک حصہ تھا، وہاں کے مسلمانوں میں اسلامی لہر دوڑ جائے، اسلام جو بہت پیچھے رہ گیا ہے، وہ آگے بڑھے۔ انھیں اس بات پر اعتمادِ کلی تھا کہ اسلامی نظام میں ہی ہر بحران کا صحیح حل موجود ہے، انھوں نے نیا طریقۂ فکر عطا کیا۔ کبھی افراد کو اپنی طرف نہیں بلایا بلکہ ہمیشہ حق اور باطل میں تمیز کراتے رہے۔ عوام کو صاحبِ بصیرت بنانے کی ترکیبیں اور کوششیں کیں، جس سے دانشوروں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو امام خمینیؒ کا شیدائی بن گیا، اور ان کا بھرپور ساتھ دیا، ان میں جلال الاحمد نے اپنی تحریروں سے نظریۂ مغربیت کو مجروح کیا، اور مشرقی تہذیب و تمدن کی شناخت کرائی۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے فلسفۂ اسلام اور اقتدارِ اسلام سے روشناس کرایا۔ اور یہ بتایا کہ اسلام منجمد نہیں بلکہ فعال ہے۔ شہید مطہری نے جملہ مسائل اسلام پر سینکڑوں کتابیں اور رسالے لکھ ڈالے اور طلباء میں اسلامی طرزِ معاشرت کی نئی روح پھونک دی۔ شہید محراب آقائے دستِ غیب نے احکام شرعیہ کی گتھیاں اس طرح سلجھائیں کہ طلباء نے ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ اس طرح ہر ایک نے امام خمینیؒ کے اسلامی انقلاب کی تحریک کو اپنی خدمات سے

تقویت پہنچائی اور انقلاب کی راہیں ہموار کیں۔

آخر وہ وقت آ گیا کہ انقلاب نے ایران کے دروازے پر دستک دی۔ عوام نے انقلاب کو لبیک کہا۔ شاہ گھبرا اُٹھا، مارشل لا نافذ کیا اور ساٹھ ہزار سے زیادہ ایرانی عوام کو چشم زدن میں امریکہ کی تربیت یافتہ ''ساواک'' نامی شاہی فوج کے ذریعہ موت کی آغوش میں سلا دیا۔

مگر انقلاب نہ رُکا اور قریب سے قریب تر آ گیا۔ محمد رضا خان جان بچا کر فرار ہو گیا اور اپنے مغربی ایجنٹ شاہ پور بختیار کو اقتدار سونپ گیا۔

آخر میں چند لفظوں میں یہ عرض کر دوں کہ امام خمینیؒ صرف اتنا ہی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اسلام جو بہت پیچھے رہ گیا ہے اسے آگے بڑھائیں، بلکہ ان کے سامنے ساری دُنیا کے مظلوم اور کمزور عوام بھی تھے جنھیں بڑی طاقتیں کچل رہی تھیں اور دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں جو ان کو اس مصیبت سے نجات دلا سکے۔

امام خمینیؒ نے بڑی طاقتوں کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ اس لیے انھوں نے کبھی بھی امریکہ سے کسی سطح پر مصالحت کی نہیں سوچی اور آخر تک اس کے خلاف دنیا کے کمزور طبقہ کو متحد ہو کر مقابلہ کے لیے آمادہ کرتے رہے۔

دوسری چیز اُن کے پیشِ نظر وحدت المسلمین کا مسئلہ تھا جس سے اب یقیناً مسلمانوں کا بچہ بچہ واقف ہو چکا ہے۔ وہ اپنے اس مقصد میں یقیناً کامیاب ہوئے اور آج جبکہ وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن راہِ خدا میں جہاد کرنے والا کبھی فنا نہیں ہوتا۔ آج بھی ان کی رُوح ہماری رہبری کر رہی ہے اور انشاء اللہ جیسے جیسے ہمارے اذہان دُنیا کے مسلم کش طریقۂ کار سے واقف ہوتے جائیں گے ویسے ویسے ہم مسلمان ایک دوسرے سے قریب ہوتے چلے جائیں گے اور ہم ساری دنیا میں اپنے اتحاد کا ثبوت پیش کر کے رہیں گے۔ ہم ایک، ہمارا خدا ایک، ہماری کتاب ایک، ہمارے نبیؐ ایک اور آج اپنے نبیؐ کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر ہمیں

بیدار کرنے والا اور وحدت المسلمین کا نعرہ بلند کرنے والا بھی ایک ہے۔ چنانچہ سلمان رُشدی کی کتاب کے معاملہ میں جب اس کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ صادر ہوا تو ساری دُنیا کے مسلمانوں نے متفقہ طور پر اس فتویٰ کا خیر مقدم کیا، اسلام دشمن عناصر کے کلیجہ پر سانپ لوٹ گیا اور عبداللہ بن ابی جیسے منافقین کے چہرے سے نقاب اُلٹ گئی۔

بے شک لاشرقیہ لاغربیہ جمہوریہ اسلامیہ کی آواز بلند کرنے والے، آیۂ وحدت المسلمین کا نعرہ بلند کرنے والے اور عالمِ انسانیت کو مستکبرین و مستضعفین جیسے اصلاحی و علامتی الفاظ سے موسوم فرما کر ظالم و مظلوم کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے والے امام خمینیؒ زندہ باد، انقلاب اسلامی زندہ باد اور اسلام زندہ باد۔

❁❁❁

یونیورسٹیوں کا اسلامی ہونا لازمی ہے

طالب علموں سے امام خمینیؒ کا خطاب

ملّتِ اسلامیہ عالم بالخصوص ملّتِ ایران پر سلام، ان معظم اساتذہ اور نوجوان طالب علموں پر سلام جو اسلام کے لیے ایک بہادر و جانباز سپاہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سردست میں آپ لوگوں کے سامنے اس بات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ یونیورسٹیوں کی اصلاح سے ہماری مراد کیا ہے؟ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ یونیورسٹیوں کی اصلاح کا مطالبہ کرنے والے اور انھیں اسلامی بنانے کا مطالبہ کرنے والے علم کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ مثلاً علم ہندسہ ایک اسلامی علم ہے اور ایک غیر اسلامی اور علمِ طبیعیات کی بھی گویا دو قسمیں ہیں۔ ایک اسلامی اور ایک غیر اسلامی۔ اسی خیال کے تحت ان لوگوں نے اعتراض اور مخالفت کی آواز بلند کرتے ہوئے کہا کہ علم اسلامی اور غیر اسلامی نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ یونیورسٹیوں کو اسلامی بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ان درسگاہوں میں فقط علم فقہ و تفسیر اور اصول کی تعلیم دی جائے گی یعنی قدیم مدارس میں جو چیزیں پڑھائی جاتی ہیں، اب یونیورسٹیوں میں بھی انھیں چیزوں کی تعلیم دی جائے گی۔ یہ ایسی غلطیاں ہیں جو بعض لوگ خود کرتے ہیں یا اپنے آپ کو ان غلطیوں کا شکار بنا دیتے ہیں۔ ہم جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ دراصل یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں سامراجی یونیورسٹیاں ہیں اور ہماری یونیورسٹیاں ان لوگوں کی تعلیم و تربیت کرتی ہیں جو مغرب زدہ ہیں اور ہمارے نوجوانوں کو مغربی تہذیب و تمدن کا دلدادہ بنا رہی ہیں۔ ہم فقط یہ کہتے ہیں کہ ہماری یونیورسٹیاں ایسی نہیں ہیں جو ہماری ضرورت کے مطابق نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیتی ہوں۔ ہماری یہ یونیورسٹیاں گذشتہ پچاس سال سے بظاہر تعلیم و تربیت میں مصروف ہیں اور قومی بجٹ کا ایک بہت بڑا حصہ ان یونیورسٹیوں کے لیے مخصوص

ہوتا ہے اور بجٹ کی یہ رقم محنت کش عوام کے خون پسینے کی کمائی ہوتی ہے لیکن اتنی طویل مدت گزرنے کے بعد بھی ہم یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے کسی مضمون میں خودکفیل نہیں ہوسکے ہیں۔ پچاس سال گزرنے کے بعد بھی اگر آج ہم کسی مریض کا علاج کرانا چاہتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ اس مریض کو برطانیہ لے جانا چاہیے۔ گذشتہ پچاس سال سے ہمارے ملک میں یونیورسٹیاں تعلیم وتعلم کے کام میں لگی ہوئی ہیں لیکن آج بھی ہمارے ملک میں مریضوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کی تعداد کم ہے۔ ہمارے یہاں یونیورسٹیاں تو تھیں اور آج بھی ہیں لیکن ملک و ملت کے ہر ضروری کام کے لیے ہم مغرب کے محتاج ہیں۔ پس جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یونیورسٹیوں میں بنیادی تبدیلی پیدا ہونی چاہیے اور ہماری یونیورسٹیوں کو اسلامی ہونا چاہیے، تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ انھیں فقط اسلامی علوم کی تعلیم دی جانی چاہیے اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہر علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اسلامی اور دوسری غیر اسلامی۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ گذشتہ پچاس سال کے دوران ان یونیورسٹیوں نے جو خدمت انجام دی ہے اسے ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہماری یونیورسٹیاں اس سرزمین کے نوجوانوں کی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہماری یونیورسٹیاں تبلیغاتی جنگ (Propaganda War) کے میدان میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان علم حاصل کرنے کے بعد بھی تربیت حاصل نہیں کرپاتے اور اسلامی تربیت سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں لوگ فقط ڈگری حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں ملک و ملت کی ضرورت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنی راہ و روش کا تعین کریں اور قوم کے اس سرمایہ کو تباہ و بربادی کی طرف نہ جانے دیں۔ اگر ان کی طاقت برباد ہوگئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہماری طاقت بھی ختم ہوگئی یا ان نوجوانوں کو بیرونی طاقتوں کی غلامی میں دے دیا۔ جہاں تک نوعیت کا سوال ہے ہمارے معلم اسلامی نہیں ہیں۔ ان لوگوں نے تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ پس ہماری

یونیورسٹیوں سے ڈگری حاصل کرنے والے میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے بلکہ اس کی حتیٰ الامکان کوشش یہ ہوتی ہے کہ ذاتی مفاد و مصالح کا خیال رکھے جب ہم ان یونیورسٹیوں میں بنیادی تبدیلی کی بات کرتے ہیں تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ یونیورسٹیاں ملک و ملت کی ضرورتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کام کریں اور اغیار و اجانب کے بجائے ملک و ملت کی خدمت میں سرگرم رہیں۔ ہمارے اسکولوں اور ہماری یونیورسٹیوں کے اکثر اساتذہ مغربی سامراج کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور ہمارے نوجوانوں میں بے راہ روی پیدا کرنے میں مصروف ہیں اور ہمارے نوجوانوں کو فاسد کاموں کی طرف راغب کر رہے ہیں۔ ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ ہم جدید علوم کے خواہاں نہیں ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ہر علم کی دو قسمیں ہوتی ہیں جبکہ بعض حضرات اسی موضوع پر بحث و مباحثہ میں لگے رہتے ہیں چاہے وہ عمداً یہ کام کرتے ہوں یا انجانے میں۔ دونوں ہی صورتوں میں اس موضوع پر بحث بے سود ہے۔ ہم تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہماری یونیورسٹیوں میں اسلامی اخلاق نہیں ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں اسلامی تربیت نہیں ہے، اگر ہماری یونیورسٹیوں میں اسلامی اخلاق ہوتا تو ہمارے ملک میں عقائدی جھگڑوں کی گنجائش نہ رہ جاتی۔ اگر ان یونیورسٹیوں میں اسلامی اخلاق ہوتا تو یہ مہلک و خطرناک لڑائیاں نہ ہوتیں۔ یہ جھگڑے فساد محض اس وجہ سے ہیں کہ یہ لوگ اسلام سے ناواقف ہیں اور ان میں اسلامی تربیت بالکل نہیں ہے۔ پس یونیورسٹیوں میں بنیادی تبدیلی پیدا ہونی چاہیے اور ان کی ازسرنو تعمیر کی جانی چاہیے تاکہ ہمارے نوجوانوں کی اسلامی تربیت ہو سکے۔ اگر ہمارے یہ نوجوان اسلامی تربیت کے سایہ میں علم حاصل کرتے ہیں اور انھیں مغربی تربیت نہ دیں اور یہ بھی نہ ہو کہ ایک گروہ انھیں مغربی تربیت کی طرف گھسیٹے، ایک گروہ مشرق کی طرف اور ایک جماعت ان نوجوانوں کو ان لوگوں کی طرف لے جانے کی کوشش کرے جو ہمارے دشمن ہیں اور ہم سے برسرپیکار ہیں یا ان لوگوں کی طرف لے جانے کی کوشش کرے جو ہمارے اوپر اقتصادی پابندیاں عائد کیے ہوئے ہیں اور ہمارے اردگرد

اقتصادی ناکہ بندی کا حصار کھینچ دیا ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں کا ایک گروہ ان کی مدد کے لیے آمادہ ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اگر ملتِ ایران مغرب کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی تو ہمارے نوجوان طالب علموں کو بھی چاہیے کہ مغرب کے خلاف کمربستہ ہوجائیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اگر ہماری قوم کمیونسٹوں کے مقابلے کے لیے کھڑی ہوجائے تو یونیورسٹی کے طالب علموں کو بھی کمیونسٹوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے جبکہ اپنی سادہ لوحی اور باطل تربیت کی وجہ سے ان طالب علموں نے کچھ اساتذہ کو پسند کرلیا اور آج جب ہم ایک آزاد یونیورسٹی تشکیل دینا چاہتے ہیں اور اس میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ یونیورسٹیاں آزاد ہوجائیں اور مغرب سے ان کا کوئی تعلق نہ رہے اور یہ کمیونزم اور مارکسزم سے وابستہ نہ رہیں تو یہ طالب علم گروپ بندی اور محاذ آرائی کرنے لگتے ہیں۔ اسی دلیل کی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایسی یونیورسٹیاں نہیں ہیں جو اسلامی ہوں اور اسلامی تعلیمات کے سایہ میں ہمارے نوجوانوں کی تربیت کریں۔ نیز یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ ہمارے نوجوان کی صحیح تربیت نہیں ہوئی اور دوسری طرف وہ علم حاصل کرنے میں بھی دلچسپی نہیں رکھتے۔ وہ ساری عمر نعرہ بازی اور جھوٹے و بے بنیاد پروپیگنڈے میں بسر کردیتے ہیں، کبھی روس کی طرفداری کرتے ہیں تو کبھی امریکہ کی طرفداری کرتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان آزاد رہیں، اپنے اعمال کا محاسبہ کریں۔ اپنی لازمی ضرورتوں کے بارے میں خود ہی غور وفکر کریں اور مشرقی یا مغربی بلاک سے وابستہ نہ ہوں۔

ہم آج امریکہ کے خلاف نبردآزمائی میں مصروف ہیں۔ ہمارا مقابلہ دنیا کی ایک بڑی طاقت سے ہے۔ پس ایسے حالات میں ان نوجوانوں کو بھی امریکی سامراج کے مقابلے کے لیے پوری طرح کمربستہ ہوجانا چاہیے۔ ہم یونیورسٹیوں کو ایسا بنا دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان خود اپنے اور اپنی ملت کے لیے کام کریں۔ دراصل یہ لوگ دور بیٹھ کر فتنہ آمیز بات کیا کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انقلابی کاؤنسل کے اراکین یونیورسٹیوں کو اسلامی بنانے کا

مطلب نہیں جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر علم کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک اسلامی علم ہندسہ اور ایک غیر اسلامی علم ہندسہ۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ انقلابی کاؤنسل کے بعض ممبران ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں اور بعض مجتہدین ہیں۔ کیا ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ اسلامی علوم و معارف کی تعلیم مدارس میں ہوتی ہے اور یونیورسٹیوں میں دیگر علوم کی تعلیم دی جاتی ہے؟ لیکن یونیورسٹیوں کا اسلامی ہونا لازمی ہے تا کہ اس جگہ جو علم حاصل کیا جارہا ہے وہ ملک و قوم کی تقویت اور ملت کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ یونیورسٹیوں میں آج جو تعلیم دی جارہی ہے اس کے نتیجے میں ہمارے نوجوان کو یا کمیونزم کی طرف گھسیٹا جارہا ہے یا انھیں مغربی تہذیب کا دلدادہ بنایا جارہا ہے جبکہ ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ یونیورسٹی کے اساتذہ ہمارے نوجوانوں کو صحیح تعلیم نہیں حاصل کرنے دیتے اور ان کی ترقی میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یہ اساتذہ مغرب کے غلام ہیں اسی وجہ سے یہ ہم لوگوں کو ہر شعبۂ حیات میں مغرب کا محتاج بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔

یونیورسٹیوں کے اسلامی ہونے کا مطلب استقلال اور مکمل آزادی ہے

یونیورسٹیوں کے اسلامی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کو مشرق و مغرب کے سامنے سر جھکانے کی نوبت نہ آئے بلکہ انھیں مکمل استقلال و آزادی حاصل ہو جائے۔ یہ خود کو مشرق و مغرب سے علیحدہ کرلیں اور ہم لوگ ایک آزاد مملکت، آزاد یونیورسٹی اور ایک آزاد غیر وابستہ تہذیب و تمدن سے مالامال ہو جائیں۔

عزیزانِ من! ہم سامراجی یونیورسٹی سے ڈرتے ہیں اور ہم اس یونیورسٹی سے خوفزدہ ہیں جو ہمارے نوجوانوں کی تربیت اس طرح کرتی ہے کہ وہ مغرب کی غلامی کو باعث عزت و شرف سمجھنے لگتے ہیں اور ہم ایسی یونیورسٹی سے ڈرتے ہیں جو ہمارے نوجوانوں کو کمیونسٹ بنادیتی ہے اور وہ ملک و ملت کی خدمت کے بجائے کمیونزم کی غلامی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہم ایسی یونیورسٹی نہیں چاہتے جو اپنے تربیت یافتہ لوگوں میں اتنی صلاحیت بھی نہ پیدا

کر سکے کہ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکیں کہ یونیورسٹی کی آزادی و اسلامیت کا مفہوم کیا ہے۔

میں صدر جمہوریۂ ایران اور اعلیٰ انقلابی کاؤنسل کی جانب سے پیش کی جانے والی اس تجویز کی بھرپور تائید کرتا ہوں جس میں یونیورسٹیوں کے اصلاح کی بات کہی گئی ہے تا کہ ان یونیورسٹیوں کو آزادی و استقلال حاصل ہوجائے اور ہم لوگ ان کی آزادی و اسلامیت کی حفاظت کرسکیں۔ میں بارگاہِ خداوندی میں ملتِ اسلامیہ بالخصوص مسلمان نوجوانوں کی سعادت کا طالب ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تجویز کے مطابق یونیورسٹیوں کو مخرب عناصر کے وجود سے پاک کردیا جائے گا اور ایک صحیح وسالم اور اسلامی اخلاق و اسلامی تہذیب وتمدن پر مبنی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آجائے گا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مورخہ ۲۱/اپریل ۱۹۸۰ء

❁❁❁

محترمہ زہرا مصطفوی (دختر حضرت امامؒ)

امام خمینیؒ قدس سرہ اور اسلام میں خواتین...

اس موضوع کے ضمن میں میں دو اہم باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسلام میں خواتین کے حقوق کا تحقیقی تجزیہ پیش کرنا چاہتی ہوں۔

پہلے مرحلہ میں کوشش یہ ہوگی کہ اس موضوع کے سلسلہ میں یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اسلام اور اس کی روشنی میں حضرت امام خمینیؒ عورت کو مرد سے جدا ایک الگ وجود نہیں سمجھتے اور اسے پیدائش وخلقت، بندگی واطاعت نیز جزا وسزا میں مرد کے برابر جانتے ہیں۔ کبھی کبھی تو بعض امور مثلاً ''یوم خواتین'' کے سلسلہ میں نہ کہ ''مردوں کا دن'' پر اس قدر اصرار ومطالبہ اور اس کے مانند شبہ میں ڈالنے والے مقاصد یوں نظر آتے ہیں گویا، ایک کم قیمت اور حقیر چیز کو بیش قیمت بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

دوسرے یہ کہ عورت کی حقیقت اور اس کے حق بجانب حقوق کے سلسلہ میں ہر طرح کے سطحی اور غلط افکار کو دور کرنے کی راہ میں تحقیق وتجسّس کا ایک خلاء محسوس ہوتا ہے اور وہ دوسرے تمام موجودات کی معرفت ان کی حیثیت اور قدر و قیمت کے مانند، اسلامی مکتب فکر میں، عورت کے پاکیزہ وجود کی صحیح پہچان اس کے حقیقی مرتبہ اور اس کی طبیعی واجتماعی حیثیت کی شناخت کا مسئلہ ہے۔ اس کائنات، میں، جس کا یقیناً ایک وسیع اور عالمی پیمانہ پر مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ چونکہ اقدار کا ہر سرچشمہ نظریات ہوا کرتے ہیں لہٰذا عورت یا مرد کے حدود یا دائروں کی تعیین کا سرچشمہ بھی یہی افکار ونظریات ہیں اور اس انتظار میں نہ رہنا چاہیے کہ ایک الٰہی معاشرہ عورت کو جس نگاہ اور جس توجہ سے دیکھتا ہے مادی۔ بنیادوں پر استوار معاشرہ بھی عورت کو اسی حیثیت سے دیکھے گا۔ دوسرے لفظوں میں جس کی فکری بنیادیں اقتصادی ستونوں

پر استوار ہوں وہ توحیدی نظریہ رکھنے والے کے برخلاف عورت کو ایک دوسری نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لیکن بحث یہ ہے کہ سبھی اس بات کے مدعی ہیں کہ عورت کو اس کے صحیح و حقیقی حقوق ملنا چاہیے اور شاید اس کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن ان میں سے کون اس سلسلہ میں واقعیت سے زیادہ نزدیک ہے؟ سرمایہ دارانہ نظام اقتصادی نظام یا اسلامی نظام؟

ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ جب تک نظریات میں تبدیلی نہ آئے اور تصور کائنات سے متعلق افکار میں فرق نہ پیدا ہو اور اس عالم ہستی کے اندر عام طور سے انسانی منزلت و مقام اور خاص طور سے عورت کی حیثیت سے متعلق تحقیق و مطالعہ نہ کیا جائے تمام بحث و کوشش بے کار ہے۔ خلقت کائنات کے مقصد سے لاتعلق ہوکر یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ ہم نے عالم ہستی میں عورت کے لیے اس کے مرتبہ کے مطابق حقوق عطا کردیئے۔ اس بنا پر ہمارا عقیدہ ہے کہ خداوند عالم جو خالق بشر اور اس کے وجود کے ہر پہلو نیز اس کی تمام ظاہری و باطنی خواہشوں سے آگاہ نیز عالم و آدم پر مکمل تسلط و احاطہ رکھتا ہے، صرف وہی بشریت کے لیے قانون اور عادلانہ نظام معین کرنے والا ہے۔

مغربی افکار نے تمام ملکوں پر جو ماہرانہ تسلط ونفوذ پیدا کررکھا ہے اور اکثر و بیشتر انسانی معاشروں کے اعمال و عادات و اطوار پر اپنی اجارہ داری قائم کررکھی ہے اس کا سرسری جائزہ لینے سے شاید میری یہ بات قبول نہ کی جائے کہ ایک مسلمان عورت اپنے دقیق اور منظم منصوبوں اور اپنے ان قیمتی اخلاقی فرائض کے تحت جو خداوند عالم کی جانب سے اس پر عائد کئے گئے ہیں موجودہ دنیا میں اپنا تشخص منوانے کے ساتھ ہی اپنے شائستہ و ممتاز مرتبہ کو بھی محفوظ رکھ سکتی ہے، چہ جائیکہ وہ عورتوں سے متعلق جدید ترین اور ترقی یافتہ افکار کی قافلہ سالاری بھی کرے۔

لیکن اس سلسلہ میں غور و فکر ہمیں یہ نوید بخشتی ہے کہ مسلمان عورت، قرآنی تربیت اور حقیقی مسلمان حکام و سرپرستوں کی حمایت و رہبری کے سایہ میں، تیزی کے ساتھ عورتوں سے

متعلق ذلت آمیز و رسوا کن افکار و خیالات کو غلط اور بے حقیقت ثابت کرسکتی ہے اور ان کے ظاہری رنگ و روپ کو زائل کرسکتی ہے، نیز مغرب زدہ افراد کی طرف سے اسے جو ہمیشہ یہ جھڑکیاں ملتی ہیں کہ مغربی تہذیب نے عورت کو آزاد بنایا ہے اور اسے استقلال بخشا ہے، وہ یہ ثابت کرسکتی ہے کہ اس نے اسلام اور قرآن سے ناحق دل نہیں لگایا ہے بلکہ تمام انسانوں اور خصوصاً ان کے انسانی حقوق کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ مساوات کی بنیاد پر دیگر افکار و خیالات سے برتری رکھتا ہے، عورت اس بات کی حقدار ہے کہ دنیا میں اپنے با ارزش مقام و مرتبہ کو دوبارہ حاصل کرے چنانچہ دقیق نظر کے ساتھ غور و فکر و تحقیق کے بعد ہر انصاف پسند اس کی حقانیت اور اس کی اہمیت کا اعتراف کرے گا جیسا کہ گفتگو کے مفہوم سے ظاہر ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے تحقیقات و مطالعات اور سیمیناروں کے ساتھ ساتھ تسلط پسند استعماری نظاموں کی سازشوں اور حیلہ بازیوں کی شناخت سے متعلق بحث سے بھی گریز نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ عورت جیسے با ارزش اور قابل قدر وجود کی ماہیت اور اس کی ذاتی حقیقت کے سلسلہ میں تحقیق نیز ان خرابیوں کی چھان بین کے بجائے جن کا سرایت کرنا عورت میں شر و فساد خود پسندی اور مجموعی طور پر اس کے انحطاط و تباہی کے لیے زمین ہموار کرتا ہے دوسری ساری کوششیں لاحاصل و بیکار ہیں۔

البتہ اس بات سے کسی بھی صورت میں میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے مکتب فکر کی غیر معقول جانبداری اور دوسرے مکاتب فکر اور طور طریقوں کی خرابیاں بیان کرنے پر اڑے رہیں۔ کیونکہ غیر معقول اور اوچھی طرفداری اور بلاوجہ کی ملامت و سرزنش دونوں ہی اسلامی عقل و خرد کے شایان شان نہیں ہیں بلکہ یہاں غیر جانبدارانہ طور پر ایک ایسی حقیقت کو پہچنوانا مقصود ہے جو حتیٰ دوستوں کے نزدیک بھی محروم و بے کس رہی ہے۔ البتہ یہ بات بھی کہنے کے قابل ہے کہ یہ بے کسی و تنہائی نہ صرف بیرونی عوامل کا نتیجہ ہے بلکہ اس تباہی کے سلسلے میں عورت کو خود اپنے آپ پر، مسلمان امراء و سلاطین پر اور ظاہر بیں فقہی و دینی بزرگوں پر بھی گریہ کرنا

چاہیے۔[1]

بس ایک جملہ میں میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس انہدام و تاسیس اور تخریب و تعمیر کی دنیا میں ایک تحقیقی روش کی بنیاد پر اور مغربی و مشرقی صنعتی ترقیات کی تائید وحمایت کے ضمن میں جہاں تک دوسروں کے نظریات و اعمال ہمارے اسلامی مسلک و مشرب اور عورتوں کی ترقی کے موافق ہیں ہم ان سے ہم آہنگ ہیں، دوسری صورت میں ان کی آگ میں جلنے اور ان کی آواز میں آواز ملانے کے بجائے بغیر کسی چشم پوشی اور بے جا شرم وحیا کے ان سے جدائی کی آواز بلند کریں گے اور اگر ضرورت ہوئی تو فراق وجدائی سے بڑھ کر قہر وغضب پر آمادہ ہوجائیں گے۔ امام خمینیؒ ۲۰ر دی ۵۷ھ (۱۰ جنوری ۷۹ء) کو لگزمبرگ کے ٹیلی ویژن کو انٹرویو دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسلامی حکومت رجعت پرست نہیں ہے اور تمام تہذیبی مظاہر کے موافق ہے، مگر یہ کہ ان سے قوم کی بحالی کو نقصان پہنچتا ہو اور وہ ملت کی عمومی عفت و پاکیزگی کے خلاف ہوں۔ اسلام نہ صرف عورت کی آزادی کا حامی ہے بلکہ وہ خود عورت کے تمام وجودی پہلوؤں کی آزادی کا بانی ہے۔"[2]

پس یہ ضروری ہے کہ عورت کی حقیقت اس کے حقوق نیز اس کی جسمی و روحی ضروریات توقعات اور فطری خواہشات کی معرفت و آگاہی حاصل کی جائے اور اس حقیقت کو محسوس کیا جائے کہ غلطی سے صرف عورت کا جسم ہی مرد کی توجہ کا مرکز قرار پایا ہے اور بس۔ اس کے بعد صحیح تدبیروں کے ذریعہ کج فکریوں کا مقابلہ کیا جائے۔ وہ غلط اور بے جا تصورات جو ماضی میں مشرقی اور مغربی دونوں معاشروں کے اندر عورت کو سماج سے دور گھر کی چار دیواری میں محدود کرنے یہاں تک کہ شادی اور خاندان کی تشکیل حتیٰ کبھی کبھی دین کے نام سے اس پر طاقت فرسا روحی وجسمی بوجھ ڈالنے کا جو عمل جاری رہا ہے اور آج بھی جاری ہے۔ ان دباؤں، سختیوں اور بندشوں کے نہ ٹوٹنے کا براہِ راست ردعمل مغرب میں بڑی تیزی کے ساتھ

گمراہی و کجروی کی گہری کھائی میں گرنے اور حقیقی مذہب اور دین کے متوازن قوانین اور بلند احکام کی طرف سے بے توجہی و بے اعتمادی کی شکل میں ظاہر ہوا اور یہی حال مشرق کا ہوا جہاں خدا اور وحی وغیرہ سے سراسر انکار کا دور دورہ تھا اور یہ تمام تصورات اوہام شمار کئے جاتے تھے اور سب کے لیے ضروری تھا کہ مشین کی طرح معاشرہ کے پہیہ کو گردش میں لائیں اور چونکہ انسان بھی مادی ہے لہٰذا مادیات کے ذریعہ اس کی ضرورتیں پوری ہونا چاہئیں۔

لیکن دراصل مشرق ومغرب دونوں کی حقیقت وماہیت ایک ہی ہے اور دونوں ایک ہی مقصد کی طرف رواں دواں ہیں فقط اس تک پہنچنے کے وسائل میں فرق ہے۔ ایک اجتماع کو بنیادی حیثیت دیتا ہے اور دوسرا فرد کو محور قرار دیتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے دونوں کا آزمودہ ہتھیار سب سے پہلے دین کی ظاہری صورت کی نفی ہے اس کے بعد دین کے اصل مقصد اور ماحصل کی نفی ونابودی کا منصوبہ ہوتا ہے۔ دونوں نظاموں نے اس تصور کو وسعت دی اور اسے اپنے زیر تسلط ممالک نیز تیسری دنیا تک کھینچ لائے کہ امام خمینیؒ آئے اور انھوں نے ان چنگاریوں کو جو زمانہ کی راکھ کے نیچے دبی رہ گئی تھیں پھر سے شعلہ ور کر دیا اور اپنی دور رس نظروں کے ذریعہ اس اسلام کو جس میں نہ کلیسائی نظام کی گھٹن تھی نہ کمیونزم کی دہریت بلکہ یہ وہی حضرت محمدؐ کا حقیقی و خالص اسلام تھا جسے آپ نے دوبارہ زندہ کیا اور انسان کو نیز اسی کے ساتھ عورت کو گمراہی سے نکلنے اور خود اپنے آپ کو پہچاننے کی دعوت دی۔

پس جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، امام خمینیؒ نے پہلی منزل میں مسلمان عورت میں یہ یقین و اعتقاد پیدا کیا کہ وہ خود کو اسلامی معارف کے صاف وشفاف سرچشمہ میں تلاش کرے اور اپنی حقیقی معرفت حاصل کرے، بیدار ہو، گمراہیوں اور کج رویوں کو بھی اچھی طرح پہچانے اسے اس بات سے بھی آگاہ کیا کہ ایک مسلمان عورت انقلاب لاتی ہے، خود منقلب نہیں ہوتی تغیر پیدا کرتی ہے خود متغیر نہیں ہوتی..... وہ یہ جان لے کہ عورت کے سلسلہ میں غلط تصورات کے ناخوشگوار نتائج اور ان کے بُرے اثرات انسانی تہذیب کے دوسرے تمام پہلوؤں کو بھی

متاثر کریں گے اور ان پر غالب ہوجائیں گے۔ لہٰذا عورت اپنے آپ کو پہچانے کہ وہ ایک ایسا وجود ہے جو انسانی کمال کی بلندترین منزل تک آسانی کے ساتھ پرواز کرسکتا ہے اس کے وجود نے تاریخ کو تابناک بنایا ہے نیز انقلابوں اور تحریکوں کو روشنی بخشی ہے۔

عورت تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانوں کو جہالت اور طاغوتیت کے پنجوں سے رہائی دلانے والی تحریکوں کی روح رواں رہی ہے پھر بھی مختلف معاشروں میں اس پر ظلم وستم روا رکھا گیا اور اس کی شخصیت کو پامال کیا گیا ہے جبکہ اس کی ذات کو اہمیت و وقعت دی گئی ہے۔ اگر پندرہ صدیوں پہلے عرب کے بدو انسان عورت کے جسم کو زندہ درگور کردیتے تھے تو آج کے خلائی دور میں اس کی روح کو زندہ درگور کیا جاتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ''عجبت لمن ینشد ضالته وکیف لاینشد نفسه'' مجھے تعجب ہے اس پر جو اپنی کھوئی ہوئی چیز کو تلاش کرتا ہے اور خود اپنے آپ کو تلاش نہیں کرتا۔ اور امام خمینیؒ فرماتے تھے: ''سلوک کی پہلی منزل ''یقظ'' ہے یعنی بیداری اور خواجہ عبداللہ انصاری نے کتاب منازل السائرین میں، جس میں انھوں نے اہل سلوک کے منازل بیان کئے ہیں۔ تحریر فرمایا ہے: پہلی منزل کو منزل یقظ یعنی بیداری کی منزل کہتے ہیں اور دلیل کے طور پر یہ آیت بھی ذکر کی کہ خداوند عالم فرماتا ہے ''اَنْ تَقُوْمُوا.....'' یعنی بیدار ہوجاؤ۔ بیدار ہونا بھی ایک طرح کا قیام ہے اور تمام تحریکیں جو دنیا میں برپا ہوتی ہیں یہ بھی قیام ہیں۔ خواب سے قیام، بیداری کے بعد قیام اور ہم جو کیف عالم طبیعت کی بنا پر کھوئے ہوئے ہیں اور خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، ہماری آنکھیں اور ہمارے کان عالم طبیعت کی طرف لگے ہوئے ہیں۔ یہاں خدا کی جانب سے یہ موعظہ ونصیحت ہے کہ اس غفلت اور گہری نیند سے بیدار ہوجاؤ۔''[۳]

لیکن چونکہ ''تعرف الاشیاء باضداها'' (یعنی چیزیں اپنی ضدیا مقابل سے پہچانی جاتی ہیں) لہٰذا پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ یہ اپنے آپ سے غفلت کیسی ہے اور یہ کاہلی

انسان میں کیسے پیدا ہوئی ہے؟ اس کا جواب ہم اپنے عظیم رہبر کی لفظوں میں دیتے ہیں، آپ نے فرمایا:

جو کام غلط ہیں وہ ظلمت و تاریکی ہیں، بداخلاقی ظلمت ہے، نور وہ ہے جس کی طرف خداوند عالم نے دعوت دی ہے اور اسلام نے جس کی ہدایت فرمائی ہے۔ اسلامی احکام پر عمل کرنے کی کوشش کیجیے اور دوسروں کو بھی اس پر مائل کیجیے۔[۲]

یہ فطری بات ہے کہ اگر حقیقی الٰہی و انسانی اقدار بے رنگ ہوجائیں اور اپنی رونق کھو بیٹھیں۔ فطری و ذاتی اچھائیاں رخصت ہوجائیں۔ جو خیر ہے شر میں اور وجود، عدم میں تبدیل ہوجائے تو گویا غفلت نے انسانی وجود میں اپنا گھونسلا بنالیا ہے اور وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہوگیا ہے اور انگریزوں کی اصطلاح میں Alienation یعنی بیزاری کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، لیکن اس خلا کو کوئی نہ کوئی دوسری چیز ضرور پُر کردے گی اور یہی وہ منزل ہے جہاں حیلہ باز افراد اور تسلط پسند طاقتیں اپنا کام شروع کرتی ہیں تاکہ انسانی وجود خاص طور سے عورت کو جو انسانوں کو تربیت کرنے والی اور انھیں انسان بنانے والی ہے، خود فراموشی، غیر پرستی، علمی احساس کمتری اور اسی جیسی دوسری زہر آلود باتوں سے آشنا کریں تاکہ جو کچھ خود اس کے پاس ہے وہی وہ غیروں سے طلب کرے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے تیسری دنیا کے انسانوں، خاص کر مسلمانوں کی تحقیر کی جائے۔ ان کے مذہب، ان کے افکار ان کے ماضی اور تاریخ سب کی تحقیر کی جائے اور ان کو یہ جتلایا اور یقین دلایا جائے کہ ان کی تمام تر کوشش، جدوجہد، خواہشیں اور آرزوئیں یہ ہونی چاہئیں کہ زیادہ سے زیادہ ان (مغربیوں) سے مشابہت پیدا کریں اور خود کو ان کے جیسا بنائیں۔

جی ہاں! مسلمان عورت کو اپنے آپ سے بیگانہ بنادینے کی راہ میں اب نوبت یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی خواہشوں و آرزوؤں اور ان کے استعماری منصوبوں و فارمولوں کے مطابق ایک نسل وجود میں آجائے لہٰذا مورخین، جامعہ شناس، اقتصاد داں اور تعلیم و تربیت کے

ماہرین سرمایہ اور طاقت کے بل بوتے پر اپنے اپنے کام میں مشغول ہوتے ہیں اور عورت کو جو بذات خود اصیل و الہی فطرت ''فطرۃ اللّٰہ التی فطرالناس علیہا'' کی بنیاد پر خلق ہوئی ہے کھوکھلا اور ذلیل بنادیتے ہیں اس طرح اس کے سامنے یہ بحران پیدا ہوجاتا ہے کہ خود اس کی اپنی حقیقی حیثیت معدوم ہوجاتی ہے اور پھر مغربی استعمار اسے اپنے خود ساختہ قالب میں ڈھال لیتا ہے۔

یہ وہ منزل ہے جہاں امامؒ کی تیغ بیان کی تیز دھار عورت کو اس کی حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہے اور اسے اغیار کے پیدا کردہ امراض سے نجات دلاتی ہے۔ امام ''یومِ خواتین'' کی مناسبت سے — مورخہ ۱۵/۲/۵۹ھ مطابق ۲۰ جمادی الثانی ۱۴۰۱ھ کو اپنے ایک پیغام میں فرماتے ہیں۔

فاطمہ (س) ایک عورت ہیں جن کے فضائل پیغمبر اکرمؐ اور خاندان عصمت و طہارت کے لامحدود فضائل کے ہم پلہ ہیں۔ ہمیں عورت کے فضائل کی طرف توجہ دینا چاہیے، کیونکہ پہلوی دور کی اس تاریک و ذلت آمیز نصف صدی میں زہریلے قلموں اور غیر متمدن و بدتہذیب زبانوں نے عورت کو خریدی اور بیچی جانے والی ایک چیز بنادینا چاہا تھا۔؎۵

آپ موضوع کی تعیین اور اس کے ذاتی صفات و خصوصیات کی شناخت کراتے ہوئے مستقبل قریب ہی میں اس کے براہ راست اور درخشاں نتائج کا وعدہ دیتے نظر آتے ہیں، عورت کو معاشرہ کی مربیہ اس کی آغوش کو انسانوں کے لیے جائے امن اور کمال و معراج کی تعبیر سے یاد کرتے ہیں۔ اسے تعمیر انسانیت کے لیے ماں اور زوجہ جیسا اٹوٹ کردار شمار کرتے ہیں اہل طاقت و اہل دولت کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں سمجھتے اور بین الاقوامی حقوق انسانی کے ادارہ (ایمنسٹی انٹرنیشنل) کے نمائندہ کو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: عورتیں اسلام کی نگاہ میں معاشرہ کی تعمیر میں ایک حساس کردار رکھتی ہیں۔ اسلام عورت کو اس حد تک بلندی عطا کرتا ہے کہ وہ معاشرہ کے اندر اپنے انسانی مقام و مرتبہ کو دوبارہ حاصل کرلے۔ ایک ''چیز'' ہونے

کی حد سے باہر نکل آئے اور اپنی اس ارتقا کی مناسبت سے وہ اسلامی حکومت کے نظام میں مختلف عہدوں و منصبوں پر فائز ہوسکتی ہے۔[۶]

کیونکہ ''عورت انسانی آرزوؤں کی تکمیل کا مظہر ہے''[۷]

اور ''ماں کی آغوش خیر یا شر کا گہوارہ بن سکتی ہے''[۸]

اور عورت عظیم عورتوں و مردوں کو پروان چڑھانے والی ہے۔ عورت ہی کی آغوش سے مرد معراج کو پہنچتا ہے۔[۹]

نیز ''ماں کے فرائض کو حقیر و ذلیل ظاہر کرنا اغیار کی سازش ہے۔[۱۰]

یعنی امامؒ ان فکر سے عاری روشن خیالوں اور غیر متمدن مہذب نماؤں کے خلاف آواز اُٹھاتے ہیں جنھوں نے نادانستہ یا خودغرضانہ طور پر عورت کو اس کی حقیقی روش کے خلاف چلنے پر مجبور کیا اور بلاسوچے سمجھے اس کے معنوی ارتقاء کمال یعنی اس کے کارساز کردار سے اسے جدا کرکے اس کے لیے ظاہری و بیہودہ قسم کی کھوکھلی ترقی یعنی دفتری میز کے پیچھے بیٹھنے کے قائل ہوئے ہیں۔ کیونکہ آپ اس اصل کو ترقی نہیں بلکہ تنزل و رجعت پسندی کی اصل و اساس قرار دیتے ہیں۔ ارتقاء کی اصل، معنوی و حقیقی کمال کی جانب پیش قدمی ہے نہ کہ تن پروری و مادہ پرستی۔

اب میں یہاں اپنی پہلی بات یعنی توحیدی تصور کائنات کی بنیاد پر مرد و عورت کے درمیان نہ کوئی فرق ہے اور نہ کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل ہے۔ عرض کرنا چاہوں گا کہ ۱۹۷۵ء کو عورتوں کا بین الاقوامی سال اعلان کئے جانے کے بعد سے عورتوں کے مسائل کے سلسلہ میں عالمی پیمانہ پر بہت کچھ کہا اور سنا گیا ہے، لیکن معاشرہ میں عورت کی موجودہ صورت حال پر توجہ یورپ میں ''ماڈرنائزیشن'' کے آغاز کے بعد شروع ہوئی اور چونکہ موجودہ مغربی معاشرہ کا رُخ ''مشینی کیٹپلرم'' کی طرف ہے اور اس نے اپنی سرگرمیوں کا محور اجتماعی اور اقتصادی بنیادوں پر قائم کرکے رفتہ رفتہ تہذیبی و تمدنی بنیاد کو ذہن سے دُور کردیا ہے نتیجہ میں

مختلف مسائل میں تغیر و تبدل پیدا ہونے کے سبب عورت و مرد کے روابط میں بھی گہرے اور بنیادی تغیرات پیدا ہوگئے ہیں۔ موجودہ معاشرہ کی حیرت انگیزترین خطاؤں میں سے ایک مختلف قسم کی موجودات کے درمیان تمام کیفیاتی فرق کو مٹا کر ڈیموکریسی کے نام پر سب کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لاکھڑا کرنے کی خطا ہے۔

ہمارے زمانہ میں ہر چیز کی قیمت مادی اعتبار سے لگائی جاتی ہے، ساتھ ہی ساتھ کیفیت کے بجائے مقدار پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ رجحان موجودہ معاشرہ کو نقصان اور صدمہ پہنچانے کا سبب بنا ہے اور یہ غلطی خاص طور سے مرد و عورت کے درمیان رابطہ اور معاشرہ میں عورت کے کردار کے سلسلہ میں محسوس طور پر سامنے آچکی ہے۔ اسلام کی پوری تاریخ میں عورتوں کی حالت مسلمان معاشرہ کے اندر کبھی مکمل طور پر اسلامی احکام وقوانین کے مطابق نہ رہی، مسلمانوں کے اندر اسلامی احکام کی اطاعت میں تنزلی کا اوسط مسلمان معاشروں کی فکری سطح نیچے آنے اور مختلف مشکلات کے پیدا ہونے کا سبب بنا ہے جبکہ اسلام انسانی فطرت کے سلسلہ میں اور یہ کہ انسان دو جنس سے خلق کیا گیا ہے اپنے دامن میں خاص تعلیمات رکھتا ہے ساتھ ہی ساتھ توحید کا بھی ذکر کرتا ہے اور اسے کائنات ہستی کی خلقت کا محور قرار دیتا ہے۔ یعنی تمام مخلوقات اپنے اجزا کے درمیان لامحدود فرق و تفاوت کے باوجود ایک ہی سطح پر قائم ہیں، یعنی تمام موجودات خداوند عالم کی مخلوق ہیں، لیکن چونکہ انسان سب سے زیادہ قوی و توانا ہے لہٰذا نظام ہستی کا ذمہ دار ہے۔ مغربی معاشرہ کے برخلاف اسلام میں جنسیت کی اہمیت اور عورت و مرد کے درمیان فرق، صرف تعلقات و روابط کی حد تک ہے، حیثیت اور نظام کی بنیاد پر نہیں۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

"یَا اَیُّھَا النَّاس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃٍ و خلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیراً ونساء واتقوا اللہ الذی تسائلون بہ والارحام ان اللہ کان علیکم رقیباً"[1]

ملاحظہ کیجیے کہ پہلے مرحلہ میں خداوند عالم نے ایک ''نفس واحدہ'' کو پیدا کیا جو ابوالبشر ہے، اس کے بعد اس کا جوڑا خلق فرمایا، اب خلقت کے بعد یہ دونوں ایک دوسرے کے کفو اور ہمسر اور حقیقت انسانیت میں ایک دوسرے کے شریک ہیں اور ان دونوں کے درمیان فقط تقویٰ کا رابطہ پایا جاتا ہے۔ توحید کا عقیدہ رکھنے والے معاشرہ میں ہر فرد کو چاہیے کہ اپنا مخصوص کردار ادا کرے اور اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کرے۔ ایک باایمان انسان کا سب سے پہلا فریضہ ہے کہ ایک بامقصد اور شریعت پر مبنی معاشرہ وجود میں لائے۔ اسی طرح مومن اپنے آزادی بخش پیغام کے ذریعہ ان لوگوں کے افکار وعقائد پر خط کھینچ دیتا ہے جنھوں نے عورت کی شخصیت کو نظر انداز کیا، یا اسے حقارت و اہانت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور وہ عورت میں قرب پروردگار اور معنوی کمالات کے ادراک تک، جو بندگی کا عالی ترین رتبہ ہے، معراج حاصل کرنے کی توانائی پاتا ہے جیسا کہ خداوند عالم حضرت مریم (س) کے سلسلہ میں فرماتا ہے۔ ''لیس الذکر کالانثیٰ''[۱۲]

امامؒ یوم خواتین کی مناسبت سے اپنے ایک پیغام میں فرماتے ہیں:

''عورت کے مختلف پہلو ہیں، جیسا کہ مرد اور (مجموعی حیثیت سے) انسان کے مختلف پہلو ہیں یہ صوری وطبیعی ورق (ظاہری شکل وشمائل) انسان یا عورت و مرد کا سب سے نچلا وادنیٰ مرتبہ ہے لیکن اسی ادنیٰ مرتبہ سے کمال کی جانب سیر بھی ہے۔ انسان ایک متحرک وجود ہے۔ طبیعت کے مرتبہ سے غیب کی منزل تک اور وہاں سے فنافی اللہ تک۔''[۱۳]

استاد شہید مطہریؒ فرماتے ہیں: علم کی یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ جس طرح وہ انسان کو دنیا و مافیہا سے آگاہ کرتا ہے خود اپنے آپ سے بھی اسے آشنا کرے لیکن اس طرح کی معرفت عطا کرنا نہ علم کا کام ہے نہ فلسفہ کا کیونکہ علم وفلسفہ کبھی کبھی غفلت کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ پس الٰہی بنیاد پر اپنے آپ کو پہچاننے والا انسان خلقت کی ساری عظمت کو سمیٹے ہوئے ہے، اس میں خدا سے منسوب سارے خصوصیات پائے جاتے ہیں لیکن نچلی سطح پر، وہ بھی خدا کی

طرح عالم، مرید انتخاب کرنے والا، خلق کرنے والا، تربیت کرنے والا، مسخر کرنے والا اور اپنی تقدیر اور معاشرہ اور تاریخ کو بدل دینے والا ہے یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان سب سے عظیم انسانی قدرو منزلت یعنی نفی کے بعد اثبات کی منزل حاصل نہ کرلے۔ برائیوں اور پستیوں، ظالموں اور جابروں کی نفی اور ان سے دوری اختیار کرنا اس کے بعد خوبیوں، کمالات اور حقائق کا اثبات اور انھیں اپنانا اسی کو "لا الہ الا اللہ" کہتے ہیں۔ چنانچہ امامؒ بزرگوار فرماتے ہیں:

لا الہ الا اللہ ایک عبارت ہے لیکن اس کی عظمت اکثر و بیشتر اوراد و اذکار سے زیادہ اور اس کی معنویت کا حجم کہیں وسیع تر ہے اعمال کے اندر اخلاص، عمل کی روح کی حیثیت رکھتا ہے اور تمام حیوانات سے انسان کے امتیاز کا سبب اس کی معنویت کا پہلو اور انسانی روح ہے۔ [۱۲]

اپنی گفتگو کے اس حصہ میں چاہتی ہوں کہ قرآن کریم اور سیرت ائمہ ہدیٰ میں موجود احکام کی حضرت امامؒ کے بیانات کی روشنی میں حسب ذیل عنوان سے دستہ بندی کروں:

(الف) عورت کے انسانی حقوق، جو عالم ہستی میں اس کی خلقت اور اس کے وجود سے مربوط ہیں۔

(ب) عورت کے سیاسی حقوق، جو انقلاب، جنگ اور اسلام کی خدمت میں اس کے کردار کو مشخص کرتے ہیں۔

(ج) عورت کے سماجی حقوق جس کے تحت ہم سماج میں اس کے کردار اور اس کے وجود کی حیثیت کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

(د) عورت اور مرد کے ایک دوسرے پر حقوق، جن کے ذریعہ شادی، طلاق نیز خاندان میں عورت کے رول پر روشنی پڑتی ہے۔

(ہ) آیندہ نسل کی نگرانی وحفاظت کے سلسلہ میں عورت کے حقوق۔

عورت کے انسانی حقوق

حضرت امامؒ ایک انٹرویو کے دوران فرماتے ہیں۔ عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں

ہے، کیونکہ دونوں انسان ہیں ہاں بعض موارد میں عورت اور مرد کے درمیان کچھ فرق پائے جاتے ہیں جو ان کی انسانی حیثیت سے ربط نہیں رکھتے۔[۱۵] یہ اس سوال کا جواب ہے جو عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں کیا گیا تھا اور آپ نے بڑے ہی دلچسپ اور نپے تلے انداز میں انسانی حقوق سے متعلق اپنی بات کا آغاز کیا ہے اور عورت کے انسان ہونے پر زور دیتے ہوئے اس بات کی تاکید کی ہے کہ عورت، عورت ہونے سے پہلے ایک انسان ہے اور اس کے بعد آپ نے ''تفاوت'' وفرق کے مسئلہ پر خاص طور سے توجہ کی ہے کہ یہ فرق انسانی حیثیت کی طرف نہیں پلٹتا، بلکہ چونکہ عورت ومرد کے یہ دو وجود اس عالم طبیعت وفطرت میں ایک دوسرے کے مکمل ہیں اس لیے دونوں آپس میں کچھ عرضی فرق رکھتے ہیں کہ ایک مناسب زندگی برقرار کرنے کے لیے ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص حقوقی نظام کے تحت تمام نعمتوں اور انسانی حقوق کی آزادیوں سے بہرہ مند ہے اور یہ عورت کے سلسلہ میں عالمی افکار کا ایک قابل توجہ جواب ہے کیونکہ وہ لوگ مرد کو جسمانی طاقت اور ظاہری توانائی وسختی کی بنا پر، جس کے ذریعہ وہ دشوار کاموں کو انجام دینے پر بھی قادر ہے، عورت سے برتر جانتے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مرد حاکم اور اطاعت کے قابل ہے اور عورت حکم بجالانے والی ہے۔ مثلاً جب ارسطو یہ دیکھتا ہے کہ غلام تلوار اپنے آقا کے ہاتھ میں دے کر یہ کہتا ہے مجھے سزا دو، حتیٰ مجھے جان سے مار ڈالو۔ تو وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ خداوند عالم نے دو طرح کے بندے پیدا کئے ہیں، ایک آقا دوسرا غلام۔ اس مثال سے مقصد یہ تھا کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اکثر خود عورتیں اس ذلت وحقارت کو قبول کرتے ہوئے اس پر راضی رہتی ہیں، جبکہ ہم نے کئی مرتبہ حضرت امام خمینیؒ سے یہ سنا ہے کہ نہ عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خود کو ایک ''چیز'' ہونے کی حیثیت تک گرائے اور نہ مرد، عورتوں کے سلسلہ میں ایسا سوچنے کا حق رکھتے ہیں۔ آپ ہمیشہ فرماتے تھے کہ عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی انسانیت کے بلند مقام پر فائز رہیں کیونکہ خداوند عالم نے انھیں کرامت وبزرگی کے ساتھ خلق فرمایا ہے اور عرفان پروردگار عالم یہ ہے کہ: ''لَقَدْ

کرّمنا بنی آدم"۔ (ہم نے بنی آدم کو بزرگی و عظمت عطا کی ہے) پس عورت یا مرد ہونا یا بازوؤں کی قوت و توانائی دونوں کی انسانی حیثیت میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتی اور اس طرح کا فرق کسی کے کمزور اور کسی کے طاقتور ہونے کی بنیاد ہرگز نہیں بن سکتا۔ کیونکہ ایسی صورت میں حیوانات اور درندے تو زیادہ قوی ہوتے ہیں لہٰذا وہ سب سے برتر ہوئے! پس اس جواب کے ذیل میں چند قیمتی نکتے سامنے آتے ہیں۔

(۱) عورت انسان ہونے کے اعتبار سے مرد کے دوش بدوش اور دنیائے آفرینش میں اس کی ہم خلقت ہے۔

(۲) اسے خود "معاشرہ یا فرد" کی طرف سے کسی بھی طرح کی ذلت یا حاکیت قبول نہ کرنا چاہیے۔

(۳) مردوں کے غلط اعمال اور بیہودہ افکار خود بہت اہم پیمانہ ہیں لہٰذا خود مردوں کو چاہیے کہ عورتوں کو ان کے حقوق دلائیں چنانچہ عورت کے انسانی حقوق میں سے ایک اس کی اپنی آزادی ہے۔

لیکن آزادی کا مطلب کیا ہے؟ افسوس کہ ہر تہذیب اور ہر مکتب فکر میں لفظ آزادی کا ایک خاص مطلب و مفہوم ہے لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ "پرندہ پنجرہ سے آزاد ہوگیا" تو یہ آزادی کا صحیح مفہوم ہے کیونکہ پرندہ اڑنے کے لیے خلق ہوا ہے اور پنجرہ اس کی یہ آزادی اس سے چھین لیتا ہے، لیکن عورت کے سلسلہ میں اس لفظ کے استعمال سے کون سا مفہوم نکلتا ہے؟ عورت کیسی مخلوق ہے؟ اس کی قوت پرواز اور اس کا کمال کس چیز میں ہے؟ اس کا پنجرہ کیا ہے؟ آزادی کا مفہوم اس کے سلسلہ میں کیا تعبیر رکھتا ہے؟ بہتر ہے کہ اب ہم آزادی کے دوسرے اصطلاحی مفہوم پر غور کریں، یہ مفہوم عالمی استعمار کی زبان میں اپنے غیر انسانی اعمال کی توجیہ میں رائج ہے اور اس کا مطلب یہ ہے ہر اس پابندی اور قانون سے رہائی و آزادی جو انسان ہونے کے اعتبار سے اس پر نافذ و حاکم ہے۔ چنانچہ یہ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے

عورت کو آزاد کردیا ہے تو کس چیز سے آزاد کردیا ہے؟ کیا عورت اسیر و مقید خلق ہوتی ہے کہ یہ لوگ اسے آزاد کرنا چاہتے ہیں؟ خود یہ دعویٰ ہی عورت کی خلقت و آفرینش کی سراسر تحقیر و اہانت ہے۔ فکر کی یہ بے مائیگی اور عورت کے سلسلہ میں ان افکار سے پیدا ہونے والے سوالات روزنامہ گارڈین کے ایک انٹرویو میں بخوبی واضح نظر آتے ہیں۔ محترمہ الیز بتھ تارکود سوال کرتی ہیں کہ: کیا عورتیں اسلامی حکومت کے پرچم تلے اس پر قادر ہوں گی کہ انھیں پردہ اور مغربی لباس میں سے کسی ایک کو آزادی کے ساتھ انتخاب کا حق حاصل ہو؟ اور جواب میں امامؒ فرماتے ہیں کہ ''عورتیں اپنے کام اور سرگرمیوں اپنی قسمت کے فیصلہ اور اسی طرح اپنے لباس کے انتخاب میں قوانین کی رعایت کے ساتھ پوری طرح آزاد ہیں۔'' [۱۱] اس سوال و جواب پر ذرا غور کرنا ضروری نظر آتا ہے۔ پہلی بات تو اس عظیم انقلابی تحریک کے بارے میں جو اپنے آخری مراحل میں ہے اور یقیناً ایسے انقلاب کا قائد و رہبر تحریک کی اصل بنیاد اس کے حقیقی زاویوں پر غور کررہا ہے اور انھیں مستقبل کے آئینہ میں دیکھ رہا ہے۔ وہ انقلاب جو کاخ سفید اور قصر کریملن کی بنیادوں کو متزلزل کرنے والا ہے اور وقت کے قیصر و کسریٰ کو خدا کی نصرت لیکن ان ہی عورتوں و مردوں کی مدد سے ان کے تخت سے اُتار پھینکنے والا ہے گویا سوال کرنے والی کی نگاہ میں عورت کی پوری شخصیت اس کی توانائی اور حقانیت نیز اس کی تمام تخلیقی صلاحیتیں صرف پردہ ہی کے مسئلہ میں چھپی ہوئی ہیں کہ وہ سوال کرتی ہے کہ مغربی لباس یا پردہ؟

اور دوسری طرف امامؒ جو ''یقیناً سوال کی بے مائیگی اور کھوکھلے پن کی طرف متوجہ ہیں'' جواب میں ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جو ان کی دور اندیشی کے دریائے بے کراں نیز اسلام کی اطاعت و پیروی کے سلسلہ میں عورتوں سے ان کے عظیم توقعات اور عورتوں کے اندر ان توقعات کو پورا کرنے کی پوری صلاحیت و توانائی کو اُجاگر کرتے ہیں۔ مشاغل و سرگرمیاں، قسمت کے فیصلے اور لباس و حجاب (وہ بھی اس لیے کہ سوال بے جواب نہ رہے)

جیسی عبارت اپنے تمام حقوق اور زندگی کے تمام امور پر عورتوں کے مکمل تسلط کو ظاہر کرتی ہے یعنی کام اور مشاغل جو اصطلاحاً معاشرہ میں انسان کے وجود اور سماج کے امور میں اس کی براہ راست شرکت کو ظاہر کرتے ہیں ان کا انتخاب عورت کا مسلّم حق ہے۔ اس کے بعد اس سے بلند تر مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ گویا ان تمام لوگوں کے نظریہ پر خط کھینچ دینا چاہتے ہیں جو انسانوں کے مقدر کو ثابت، اٹل اور پہلے سے تحریر شدہ سمجھتے ہیں، اس طرح امام قدس سرہ عورت کو اس امر میں انتخاب کا حق دیتے ہیں کہ یہ کوئی اٹل فیصلہ نہیں ہے بلکہ عورت اپنی قسمت کے فیصلہ میں خود مختار اور صاحب ارادہ ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:

"اِنَّ اللّٰہ لایغیر مابقومٍ حتّٰی یغیروا ما بانفسھم" (سورہ رعد/۱۱)

"بلاشبہ خداوند عالم اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ لوگ خود اپنے آپ کو نہ بدلیں۔"

اور یہ جواب بذات خود ایک بلند نعرہ ہے کہ عورت کی آزادی کا مطلب نہ تو لباس سے اس کی آزادی ہے کہ یہ خود ایک طرح سے عورت کو ضائع اور تباہ کرنا ہے۔ اور نہ گھر اور خاندان سے علاحدگی اس کی آزادی ہے کہ اس سے بھی اس اکائی کے بنیادی ستون متزلزل ہوجاتے ہیں اور نہ ہر طاقت فرسا کام کے انتخاب میں آزاد ہونا اس کی آزادی ہے کہ یہ بھی اس کی فطرت اور خلقت کے لیے ناسازگار ہے، بلکہ معاشرہ میں اس کا وجود اس کے مشاغل اور اس کا لباس وحجاب سب کچھ دستورات وقوانین کے مطابق ہونا چاہیے کیونکہ ہر انسان، انسان ہونے کی بنا پر ایک پُرسکون اور آرام دہ زندگی کا محتاج ہے اور یہ بات اس قانون کی برقراری کے بغیر جس کی پیروی سب پر واجب ہو ممکن ہی نہیں ہے۔ پس عورت کو بھی نہ صرف اپنے لباس وحجاب بلکہ اپنے کام کے انتخاب نیز اپنی قسمت کے فیصلوں کے سلسلہ میں قوانین کا پاس ولحاظ رکھنا چاہیے۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ ہر معاشرہ اپنے خاص نظریہ پر مبنی قانون رکھتا ہے اور اسلامی معاشرہ بھی اس کلیہ سے الگ نہیں ہے یہاں معاشرہ پر حاکم قانون الٰہی

قانون ہے جو انسانی فطرت کے مطابق اور اس کے وجودی رشد و کمال کی طرف گامزن ہے عورتوں کو اجتماعی و سیاسی کاموں میں اسی عمومی صفت کے ساتھ حصہ لینا چاہیے کیونکہ یہ طے ہے کہ اگر عورت ان تمام قوانین کی رعایت کئے بغیر۔ جو اسلام میں اس کی اور معاشرہ کی حفاظت کے لیے معین کئے گئے ہیں معاشرہ میں قدم رکھتی ہے تو وہ اپنی صلاحیت نیز تخلیق اور رشد و کمال میں اپنی تاثیر کی قوت سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے اور فساد کی راہ پر لگادی جاتی ہے۔ پھر نہ صرف وہ معاشرہ کے اعلیٰ مقاصد کو آگے بڑھانے کا سبب نہیں رہ جاتی بلکہ ایک سالم معاشرہ کو ترقی سے روکنے اور خراب کرنے کا کردار ادا کرتی ہے اور اس کی تباہی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

عورت کے سیاسی حقوق اور خدمت اسلام:

اب رہے عورت کے سیاسی حقوق اور انقلاب و جنگ میں اس کا کردار نیز دوسرے انسانی، اجتماعی و سیاسی تغیرات میں اس کا حصہ لینا تو حضرت امام قدس سرہٗ نے فرمایا کہ:

''خواتین سیاست میں حصہ لینے کا حق رکھتی ہیں اور یہ ان کا فریضہ ہے۔'' [۱۷] اور اس سے بڑھ کر ''عورت کے لیے لازمی ہے کہ وہ حکومت کے بنیادی مقدرات و امور میں حصہ لے'' [۱۸] اور ''اسلام کی حفاظت، ملت کے دفاع، اسلامی وقار کے تحفظ اور آخری حد تک اسلامی ملک کا دفاع، عورتوں، مردوں اور بچوں سب پر واجب ہے، دفاع کا مسئلہ سب کے لیے ایک عمومی امر ہے، جو بھی طاقت رکھتا ہے اسلامی ملک کا دفاع کرے۔'' [۱۹]

عورت کے سیاسی حقوق کی وضاحت کرنے کے سلسلہ میں شاید امام خمینیؒ کے محکم و قاطع ارشادات کے مانند کوئی اور بیان نہ مل سکے۔ جو بات طے ہے وہ یہ ہے کہ سیاسی امور میں حصہ لینے۔ اپنی اور معاشرہ کی سرنوشت میں دخل و اختیار نیز دیگر امور مثلاً انتخابات میں ووٹ دینے اور لینے قوم کی طرف سے منتخب ہونے اور اس کی نمائندہ اور نجات دہندہ ہونے، مختلف حکومتوں سے ارتباط یا قطع تعلق کرنے، جنگ و صلح یا ملکی و غیر ملکی ثقافتی و اقتصادی قوانین

بنانے کے سلسلہ میں ایک تو عورت خود انسانی حیثیت سے ایک شخصیت کی مالک ہے دوسرے وہ خود مختار اور صاحب ارادہ ہے اور تیسرے وہ ایک قوی، سیاسی فکر اور خلاق و فعال ذہن کی مالک ہے کہ حضرت امامؒ نے عورتوں کو ان خصوصیتوں کی طرف اپنے مندرجہ بالا ارشادات اور ان سے مشابہ دوسرے بیانات میں متوجہ فرمایا ہے۔ حتیٰ دفاع اور جنگ کے سلسلہ میں بھی اسے مردوں کے برابر اور ان کے دوش بدوش قرار دیتے ہیں اور مذکورہ بالا تمام امور کو اس کا فریضہ قرار دیتے ہیں آپ عورت کی رائے کو قیمتی قرار دیتے ہوئے اسے عقیدتی و سیاسی افکار و نظریات کا اظہار کرنے میں آزاد و خود مختار جانتے ہیں کہ جیسا وہ چاہتی ہے سوچے سمجھے اور صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اس طرح امام نے ہمیشہ کے لیے اور پوری قاطعیت کے ساتھ ا ن تمام دل کے اندھوں کو— جو عورت کو کبھی دین کے نام پر اور کبھی معاشرتی خرابیوں اور بلاؤں سے محفوظ رکھنے کے نام پر گھر اور اس کے امور میں محصور و محدود کر دیتے ہیں اور ان کی ہدایت اور قیادت و رہبری کو مردوں کے سپرد کر دیتے ہیں فریضہ اور حکم کی صورت میں خبردار کرتے ہیں۔ انھیں اس کج فکری سے روکتے ہیں اور عورتوں کو ان کے ضائع شدہ حقوق کا حقدار ثابت کرنے کے لیے انھیں عورتوں کی توانائیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔

عورت کے معاشرتی حقوق و کردار

امریکہ کی روٹگرز یونیورسٹی کے اُستاد ڈاکٹر جیم کوکلر فتھ کے ساتھ انٹرویو میں حضرت امامؒ عورت کے اجتماعی حقوق سے متعلق بڑا واضح اور صریح انداز اختیار کرتے ہیں کہ ”ہم عورت کے کام کرنے کے مخالف کیوں ہوں؟ عورت حکومتی امور کیوں انجام نہیں دے سکتی؟ اسلام نے عورت کو جو احترام و آزادی بخشی ہے کسی بھی قانون یا مکتب فکر نے نہیں دی ہے۔“ [۹۷]

آپ نے مختلف موقعوں پر فرمایا ہے:

”عورتیں اسلامی معاشرہ میں آزاد ہیں۔ انھیں یونیورسٹیوں، دفتروں، اور اسمبلی و پارلیمنٹ میں جانے سے ہرگز روکا نہیں جاتا۔ لیکن جہاں تک اخلاقی فساد کی بات ہے اس میں

عورت اور مرد دونوں برابر ہیں اور یہ دونوں کے لیے حرام ہے۔'' ۲۱ ''عورت اور مرد دونوں یونیورسٹی جانے کے لیے آزاد ہیں'' ۲۲ '' اسلامی نظام میں عورت کے بھی وہی حقوق ہیں جو مرد کے ہیں، کام کا حق تعلیم حاصل کرنے کا حق، مالکیت کا حق.....'' ۲۳

عورت کے اجتماعی و معاشرتی حقوق میں سے ایک تعلیم حاصل کرنے اور فکر میں کمال و بلندی لانے کا حق ہے۔ اگرچہ کیا ماضی اور کیا موجودہ زمانہ مختلف سماجوں کے اندر عورت کو اس کے اس مسلّم حق سے محروم رکھا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا امامؒ عورت کو نہ صرف اس عمل خیر و سعادت کا حقدار سمجھتے ہیں بلکہ اعلیٰ مراتب و مدارج کے حصول کے لیے جہاں تک اہل علم کی راہ مردوں کو میسر ہے عورتوں کے لیے بھی اس راہ کو باز دیکھتے ہیں۔

لیکن امامؒ جو عورتوں کے سلسلہ میں صراحت کے ساتھ حکومتی سرگرمیوں میں کام اور مالکیت کے حق کا ذکر فرماتے ہیں وہ اس اعتبار سے ہوسکتا ہے کہ ایسے اعتقادات ونظریات موجود ہیں جو ایک تو عورت کو گھر ہی میں محدود اور منحصر رکھتے ہیں اور اسے اجتماعی جدوجہد نیز بنیادی اور حکومتی کاموں کے لائق نہیں جانتے ساتھ ہی اسے اپنی محنتوں اور کوششوں کی پاداش کا مستحق شمار نہیں کرتے۔ دوسرے الفاظ میں چونکہ اسے ایک مکمل انسان نہیں جانتے یعنی ایک مستقل و عاقل انسان نہیں جانتے جس کے اندر اپنے حقوق کی مالکیت اور ان سے استفادہ کرنے کے شرائط موجود ہوں، لہٰذا ان موارد میں بھی ہمیں امامؒ کے صریح اور راہ گشا ارشادات نظر آتے ہیں۔ لیکن مذکورہ بالا تمام امور میں عورت کی شرکت کو آپ نے ہمیشہ اس کی عفت و پاکدامنی کے ساتھ واجب قرار دیا ہے جس کا ذکر اور اسباب وعلل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

شادی اور طلاق کے سلسلے میں عورت اور مرد کے باہمی حقوق

اپنی گفتگو کے اس حصہ کو بھی میں حضرت امامؒ کے کلام سے شرف بخشتی ہوں کہ شادی بیاہ کے سلسلہ میں اسلام نے عورت کو شوہر کے انتخاب میں آزادی عطا کی ہے۔

''ہر عورت جس مرد کو اپنا شوہر منتخب کرنا چاہے، اسلامی قوانین کے دائرہ میں اسے

اُس کا پورا اختیار ہے۔''۲۴ یا اس استفتاء کے جواب میں کہ طلاق کے سلسلہ میں عورت کے اختیار کی کیا صورت ہے؟ فرماتے ہیں ''محترم عورتوں کے لیے شارع مقدس نے آسان راہ معین فرمائی ہے تا کہ وہ خود طلاق کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے سکیں اور وہ اس صورت میں کہ عقد و نکاح کے دوران اگر وہ یہ شرط کرلیں کہ بطور مطلق یعنی جب بھی ان کا دل چاہے گا یا مشروط طور پر یعنی اگر مرد بد تماشی یا ظلم پر اُتر آئے گا یا مثلاً دوسری عورت سے شادی کرلے گا تو وہ شوہر کی طرف سے وکیل ہوں گی کہ خود کو طلاق دے لیں۔ ایسی صورت میں عورتوں کے لیے کوئی دُشواری پیش نہیں آتی اور وہ خود کو طلاق دے سکتی ہیں۔''۲۵

جیسا کہ ظاہر ہے حق ازدواج وطلاق کے سلسلہ میں امامؒ کا کلام اس قدر صریح اور واضح ہے کہ اس میں کسی طرح کے شبہ یا وضاحت کی گنجائش نہیں ہے۔ امامؒ عورتوں کو اپنے پسندیدہ شریک زندگی کے انتخاب میں مکمل آزادی دیتے ہیں۔ البتہ ''اسلامی قوانین کے دائرہ میں'' کی قید اس عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ شادی چاہے عورت کے لیے ہو یا مرد کے لیے، صرف جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اہم اور بلند مقصد بھی ہے اور وہ ان گلوں کی پیدائش جو نسل انسانی اور امت اسلامی کی بقاو دوام کا سبب ہیں اور یہ عظیم مقصد اس وقت تک ہاتھ نہیں آسکتا جب تک عورت و مرد شادی سے پہلے اس سلسلہ میں خوب غور وفکر نہ کریں۔ وہ ایسے شریک زندگی کا انتخاب کریں جو ایک سالم اور صالح نسل کو وجود عطا کرنے میں ان کا مددگار ہو جیسا کہ صادقِ آل محمدؑ علیہم السلام نے فرمایا ہے ''الولد الصالح ریحانة من ریاحین الجنة''۲۶ نیک وصالح فرزند جنت کے پھولوں میں سے ایک پھول ہے یہ پھول جو الٰہی امانتیں ہیں، سالم پیدا ہوں۔ اچھی تربیت پائیں اور رسولؐ خدا کی آنکھوں کا نور قرار پائیں اس کے لیے بہت ہی مناسب اور صالح شریک حیات کے انتخاب کی ضرورت ہے۔

اب رہا طلاق تو چاہے یہ مسئلہ عورت کی جانب سے ہو یا مرد کی جانب سے ناپسند

اور مذموم ہے اور ایک ایسا امر ہے جو عرش الٰہی کو بھی لرزا دیتا ہے۔ لیکن (آخری چارہ کار اور راہ حل کی حیثیت سے) بعض ادیان کے برخلاف جو راہ حل کو سرے سے بند اور مسدود جانتے ہیں اسلام نے یہ راہ بند نہیں رکھی ہے۔ لیکن چونکہ عورت! مرد ممکن ہے غلط راہ اختیار کریں اور ہوا و ہوس میں مبتلا ہوں، خودسری اور لڑائی جھگڑے پر اُتر آئیں لہٰذا اس نکتہ کو کہ عورتیں اگر چاہیں تو حق طلاق کی شرط کرلیں مکمل طور سے جائز شمار کیا ہے۔ اس طرح امامؒ نے طرفین کی بہت سی مشکلوں کو حل کیا ہے۔ زوجین کو مزید اطمینان خاطر بخشا ہے اور خاندان کو بہتر استحکام وثبات عطا فرمایا ہے۔

عورتوں کے حقوق اور نسل آئندہ کی حفاظت ونگہداشت

یہ کلام یوم خواتین کی مناسبت سے حضرت امام خمینیؒ کے ایک پیام سے انتخاب ہوا ہے تاکہ گفتگو کے اس حصہ کو واضح کرسکے ''دنیا میں عورتوں کا ایک مخصوص کردار رہا ہے۔ کسی معاشرہ کی اچھائی یا برائی اس معاشرہ کی عورتوں کی اچھائی یا بُرائی سے پیدا ہوتی ہے۔ عورت ہی وہ تنہا وجود ہے جو اپنی آغوش سے ایسے افراد معاشرہ کے حوالہ کرسکتی ہے جس کی برکتوں سے ایک معاشرہ کیا بہت سے معاشرے استقامت و پائداری اور بلند انسانی اقدار سے ہم کنار ہوسکتے ہیں یا اس کا اُلٹا بھی ہوسکتا ہے۔ ۲۷

جیسا کہ ماہرین نفسیات کی تلاش وتحقیق سے پتہ چلتا ہے۔ ایک بچہ کی شخصیت سات سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ایک ڈھرہ اور ایک رُخ اختیار کرلیتی ہے اور بچے زیادہ تر اپنی عمر کے یہ سال ماں کے سایہ میں بسر کرتے ہیں اور مہر ومحبت، ایثار وفداکاری، فرحت ونشاط، دلگرمی وخوش بینی ایمان وعقیدہ عزم وثبات نیز دوسرے بلند اخلاقی مفاہیم یا اس کے برعکس بغض وکینہ، رشک وحسد بے اعتقادی و بے ایمانی، خست وبخل، بدبینی وتعصب، غم واندوہ، کاہلی وسستی کا پودا ماں کی طرف سے اس کے دل ونہاد میں لگایا جاتا ہے اور اس میں شگوفے

پھوٹتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام بزرگوار ماں کو اصلاح وفساد کا منبع ومصدر قرار دیتے ہیں۔

آخر کلام میں وہ باتیں جو حضرت امامؒ سے نسبی قرابت ہونے کی بنا پر مجھ سے مربوط ہیں اور جنھیں میں نے تحقیق ومطالعہ سے نہیں بلکہ ذاتی مشاہدہ سے حاصل کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت امامؒ کی باتیں اور ان کی گفتگو حقیقت وعینیت پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ دوسرے الفاظ میں جن چیزوں پر ان کو یقین اور عقیدہ تھا دقیق طور سے وہی کچھ ان کی زبان پر جاری اور ان کے اعمال پر طاری ومسلط تھا حقیقت میں وہ عورتوں کی جس شخصیت، قدروقیمت اور حقانیت کے زبان سے قائل تھے عمل کے ذریعہ بھی اس کا اظہار فرماتے تھے۔ یہ امامؒ ہی تھے جنھوں نے ایک نئی بنیاد رکھی اور اپنی بات پر عملی طور سے بھی جمے رہے۔ اپنی گفتگو میں پیغامات میں نیز عملی طور سے بھی ایک عورت کو پیغام بر کی صورت میں روس بھیج کر برابری ومساوات کو مستحکم کردیا۔ انھوں نے ہر موقع پر چاہے لفظاً ہو یا عملاً اپنی صداقت کا ثبوت پیش کیا اور اس صداقت وسچائی کے ساتھ جو ان کا ملکہ تھی انھوں نے کسی طبقہ یہاں تک کہ عورتوں سے بھی قول وعمل میں دو رنگی اختیار نہیں کی، لہٰذا جب وہ آواز بلند کرتے تھے کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان کسی بھی حقوقی امر میں کوئی فرق نہیں ہے تو اسے سچ کر دکھاتے تھے اور عملی جامہ بھی پہناتے تھے۔

میں یہ بات پورے زور اور تاکید کے ساتھ کہتی ہوں کہ وہ کسی بھی سلسلہ میں کوئی بات لاف وگزاف یا تکلف کے انداز میں یا اپنی شہرت ومحبوبیت کے لیے نہیں کہتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے الٰہی احکام کے اجراء اور رضائے پروردگار کے حصول کے لیے فرماتے تھے، جس نے آپ کے پورے وجود کو پر کر رکھا تھا اور اس سلسلہ میں اس قدر دقت نظر سے کام لیتے تھے کہ اکثر اس کا تصور بھی دشوار ہے۔ ایک مثال یہاں پیش کرتی ہوں جو شاید کسی حد تک اس بات کو واضح کرسکے۔

ایک روز آپ نے کسی مناسبت سے ایک پیغام لکھا تھا لیکن فوراً ہی حکم دیا کہ وہ پیغام واپس کیا جائے فوراً حکم کی اطاعت کی گئی۔ غالباً لشکر اسلام کے نام پیغام تھا، انھوں نے اس

پیغام میں کچھ تبدیلی کی اور واپس کردیا۔ جب میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں نے لکھا تھا کہ میں اپنی تمام آرزوؤں کے ساتھ تم سب کے لیے دعا کرتا ہوں لیکن بعد میں یہ احساس ہوا کہ شاید یہ بات حقیقت کے مطابق نہ ہو لہٰذا دوبارہ لکھا کہ میں اپنی بیشتر آرزوؤں کے ساتھ تم سب کے لیے دُعا کرتا ہوں۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص اس طرح اور اس حد تک اپنے قلم اور بیان کو اپنے ضمیر و باطن سے ہم آہنگ رکھتا ہے کہ اس کے دشمن بھی اس پر دورنگی اور ریاکاری کا الزام نہیں لگا سکے، یہ محال ہے کہ انھوں نے تمام مسائل اور خاص طور سے عورتوں کے بارے میں جو باتیں کہی ہیں اور جن کا بہت مختصر نمونہ یہاں ذکر کیا گیا ہے ان میں ذرہ برابر بھی حقیقت سے دُوری، ظاہر داری، تکلفات اور لاف وگزاف سے کام لیا ہو۔

اس منزل پر جیسا کہ میں عرض کرچکی ہوں اپنی قرابت کی بنیاد پر چاہتی ہوں کہ تحریری مثالوں کے علاوہ کچھ عینی مثالیں بھی پیش کروں اور اس تہذیب کی طرف اشارہ کروں، جو انھوں نے گھر میں رائج کر رکھی تھی۔ محبت و مفاہمت کی بنیاد پر استوار روابط اور ذمہ داریوں کا احساس جو اسی تہذیب کی دین تھا، دوسروں کے حقوق کا احترام اپنے فرائض پہچاننے اور ذمہ داریوں کو انجام دینے کی تہذیب حریم اہل خانہ کی حرمت و پاسداری کی تہذیب نیز احباب و اقربا سے مسالمت آمیز برتاؤ کا ماحول۔

میں اپنی والدہ محترمہ کا قول نقل کرتی ہوں، فرماتی ہیں: ''حضرت امامؒ نے شادی کے بعد مجھ سے فرمایا کہ میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ واجبات پر عمل کرو اور محرمات سے پرہیز کرو۔ تمہارے مستحب و مباح ذاتی امور میں کوئی دخل نہیں دوں گا۔ اپنی خصوصی زندگی پر تمھیں پورا پورا اختیار ہے۔'' یعنی دقیق طور پر امامؒ نے اپنی بیوی سے اسلام پر عمل کا تقاضا کیا ہے اور بس۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ آپ والدۂ گرامی کے مسائل میں کسی طرح کی مداخلت نہیں فرماتے تھے حتیٰ کہ ان سے ایک گلاس پانی کا تقاضا کرنے سے بھی گریز کرتے تھے اور صرف یہ

کہنے پر اکتفا فرماتے تھے کہ ''محترمہ حکم دیجئے کہ میرے لیے فلاں چیز لے آئیں۔''

میری والدہ محترمہ ایک واقعہ اور بیان فرماتی ہیں کہ ''بچوں کی پرورش کے دوران راتوں میں دو گھنٹہ وہ بچہ کی نگرانی فرماتے تھے، میں سوتی تھی اور دو گھنٹہ میں بچہ کی دیکھ بھال کرتی تھی، وہ سوتے تھے، حتیٰ کہ یہ مقدار بھی میری رضامندی کے مطابق تھی۔'' اے کاش! میں ان تمام مناظر و لمحات کو قلم بند کر کے ان کی تصویر کشی کر سکتی جن میں وہ اپنی زوجہ، اولاد اور اقربا کے حقوق کی رعایت فرماتے تھے۔

آج امام خمینیؒ کے تمام ماننے والوں خصوصاً عورتوں کا یہ فرض ہے کہ ان کی جلائی ہوئی اس فروزاں مشعل کو خاموش نہ ہونے دیں اور اسلام و امامؒ کے پیرو بھائیوں پر لازم ہے کہ اسلام نے عورتوں کے لیے جو حقوق معین کیے ہیں اور امامؒ نے جنھیں نافذ فرمایا ہے اپنی مسلسل سعی اور بھرپور طاقت کے ساتھ ان کی رعایت کریں کیونکہ ان کا لحاظ نہ کرنے کے برے نتائج زیادہ سے زیادہ خود ان ہی بھائیوں اور ساتھ ہی معاشرہ کو بھگتنا ہوں گے اور خاندانوں کا سکون وقرار جو نسل آئندہ کے پھلنے پھولنے کے لیے ضروری ہے غارت ہو کر رہ جائے گا۔

حوالے:

۱۔ کتاب پیامِ انقلاب: ص-۵۱۔ خواہرانِ مکتب توحید سے امامؒ کا خطاب، مورخہ ۱۲/۷/۵۷ ھ ش

۲۔ کتاب پیامِ انقلاب: ص۱۵۸۔ انجمن خیریہ اصفہان کی ممبر خواتین سے ملاقات کے موقع پر امامؒ کا خطاب، مورخہ ۲۰/۸/۵۸ ھ ش

۳۔ کتاب صحیفۂ نور: جلد-۱۲، ص-۷۲

۴۔ کتاب طلیعۂ انقلاب اسلامی: ص-۱۰۰، مورخہ ۱۹ آبان ۵۷ ھ ش مطابق ۱۰ نومبر ۷۹ء

۵۔ صحیفۂ نور: جلد۲، ص ۱۹۴

۶۔ صحیفۂ نور: جلد ۸، ص ۱۲۲

۷۔ صحیفۂ نور: جلد ۸، ص ۱۲۲

۸۔ صحیفۂ نور: جلد ۲، ص ۱۹۴

۹۔ سورہ نساء، آیت نمبر ۱

۱۰۔ سورہ آل عمران: ۳۶

۱۱۔ صحیفۂ نور: جلد ۲، ص ۱۵۸، مورخہ ۲۶ / ۲ / ۵۸

۱۲۔ پیام انقلاب: ص ۵۲، مکتب توحید کی خواتین سے خطاب، مورخہ ۸ / ۱۰ / ۷۹ء-۱۲ / ۷ / ۵۸ھ ش

۱۳۔ ہالینڈ کے ایک روزنامہ "دی راست گرانٹ" کو انٹرویو: ۱۲ / ۸ / ۵۷ ۱۳ ھ (۷ / ۱۱ / ۷۸ء) از کتاب صحیفۂ نور: ج ۳، ص ۲۶

۱۴۔ مورخہ ۱۰ / ۸ / ۵۷ھ پیرس

۱۵۔ شہر لنگرود کے تعلیمی محکمہ والوں سے خطاب، ۲۶ / ۲ / ۵۸ھ ش۔ از کتاب سیمائے زن در کلام امام خمینیؒ

۱۶۔ سپاہ پاسدار کے کمانڈروں سے خطاب، ۲۸ / ۵ / ۶۰ ھ ش۔ از کتاب سیمائے زن در کلام امام خمینیؒ

۱۷۔ مورخہ ۷ / ۱۰ / ۵۷ ش۔ از سیمائے زن در کلام امام خمینیؒ

۱۸۔ سیمائے زن در کلام امام خمینیؒ مورخہ ۱۵ / ۱۲ / ۵۷ھ (۲ / ۲ / ۷۹ عیسوی)

۱۹۔ لاس اینجلس ٹائمز امریکہ کے نامہ نگار سے انٹرویو، مورخہ ۱۲ / ۹ / ۵۷ (۱۷ / ۱۲ / ۷۸ عیسوی)

۲۰۔ مورخہ ۲ / ۹ / ۵۷ (۱۱ / ۱۲ / ۷۸ عیسوی)

۲۱۔ صحیفۂ نور جلد چہارم، ص ۳۲ (اٹلی سے انٹرویو مورخہ ۱۲ / ۹ / ۵۷ھ (۷ / ۱۲ / ۷۸ عیسوی

۲۲۔ از کتاب سیمائے زن در کلام امام خمینیؒ، مورخہ ۷ / ۱۰ / ۵۷

۲۳۔ طلاق کے سلسلہ میں امام خمینیؒ کا ایک فتویٰ، کتاب سیمائے زن در کلام امام خمینیؒ، تاریخ ۷ / ۸ / ۵۸ ۳۔ وسائل الشیعہ

۲۴۔ کتاب سیمائے زن در کتاب امام خمینیؒ، تاریخ ۲۵ / ۱۲ / ۵۸

❁❁❁

ڈاکٹر اختر مہدی
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر منتخب
ڈاکٹر احمدی نژاد کا بیان
طاقتور اسلامی ملک کی تشکیل ہمارا نصب العین
اور
آپسی اتحاد اس مشن کی کامیابی کا راز ہے۔

۱۱ر فروری ۱۹۷۹ء کو امام خمینی کی قیادت میں رونما ہونے والے عظیم اسلامی انقلاب کے نتیجہ میں ایران میں ہی نہیں بلکہ دنیا میں پہلی بار ایک اسلامی جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے قبل دنیا میں اسلامی حکومتوں کا تصور تو موجود تھا لیکن اسلامی جمہوری حکومت کی کوئی عملی مثال موجود نہ تھی بلکہ اکثر و بیشتر یہ پروپگنڈہ کیا جاتا تھا کہ اسلام اور جمہوریت کے درمیان گہرا فاصلہ ہے اور اسلام میں جمہوری تقاضوں کو پورا کرنے جمہوری صلاحیت نہیں ہے لیکن خالص اور ٹھوس اسلامی بنیادوں پر قائم ایران کی گذشتہ ۲۶ سالہ جمہوری حکومت نے اسلام دشمن طاقتوں کی جملہ قیاس آرائیوں کو پوری طرح بے بنیاد ثابت کردیا ہے۔ اس طویل مدت کے دوران استصواب عامہ، بلدیاتی اور پارلمانی انتخابات کے علاوہ متعدد بار ملک گیر پیمانہ پر صدارتی چناؤ ہوئے اور بنی صدر، محمد علی رجائی، آیت اللہ خامنہ ای، آیت اللہ رفسنجانی اور حجت الاسلام خاتمی عہدہ صدارت پر فائز رہے۔ اکثر صدارتی چناؤ کے دوران عالمی اور مغربی سیاسی ماہرین ان میں سے کسی ایک کو اصلاح پسند تو دوسرے کو بنیاد گرتا تے رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح ایران بھی ایک مفصل آئین کا حامل ہے جو قرآنی تعلیمات اور احادیث پر مبنی ہے جس میں دنیا کی کسی بڑی طاقت کی سرپرستی میں بنائے جانے

والے آئین کی جھلک بھی نہیں دکھائی دیتی۔ ملک کے اس آئین میں چناؤ کے سلسلے میں جو قوانین بنائے گئے ہیں۔ اس کے بموجب پارلمانی حلقہ انتخابات کی نمائندگی کا مرحلہ ہویا صدارتی چناؤ کی منزل چناؤ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے امیدوار کو 1+50% ووٹ حاصل کرنا لازمی ہے اور اگر چناؤ کے پہلے مرحلہ میں ۵۰ فیصد سے زیادہ ووٹ حاصل نہ ہوسکیں تو دوبارہ چناؤ کرائے جائیں جس کو ایرانی آئین میں ''مرحلہ دوم'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

۱۷ر جون ۲۰۰۵ء کو ایران میں ملک گیر پیمانے پر صدارتی چناؤ ہوئے لیکن عہدہ صدارت کے کسی بھی امیدوار کو ۵۰ فیصد +1 ووٹ حاصل نہ ہوئے چناؤ الیکشن کمیشن نے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والے دو امیدوار کے درمیان چناؤ کے دوسرے مرحلہ کا اہتمام کیا اور ۲۴ر جون کو آیت اللہ رفسنجانی اور ڈاکٹر احمدی نژاد کے درمیان ملک گیر پیمانے پر چناؤ ہوا جس میں ڈاکٹر احمدی نژاد نے ۳۶ فیصد کے مقابلہ میں ۶۲ فیصد ووٹ کے ساتھ عظیم الشان کامیابی حاصل کرلی۔ اس صدارتی چناؤ میں ۶۰ فیصد لوگوں نے بھرپور حصہ لیا جس میں سرکاری اطلاع کے بموجب ڈاکٹر محمود احمدی نژاد کو ۱۷۲۴۷۸۲ ووٹ اور آیت اللہ رفسنجانی کو ۱۰۰۶۷۰۱ ووٹ حاصل ہوئے اور ۶۶۳ ہزار ۷۷۰ ووٹ باطل قرار دیئے گئے۔ اور ڈاکٹر محمود احمدی نژاد ایران کے چھٹے صدر جمہوریہ منتخب ہوگئے۔

صدارتی چناؤ میں اس عظیم الشان کامیابی کے بعد ڈاکٹر احمدی نژاد نے ملک وملت کے نام ایک خصوصی پیغام جاری کیا جس میں انہوں نے چناؤ میں شریک لاکھوں کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ چناؤ میں عوام کی بھرپور شرکت سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ ایرانی عوام اسلامی انقلاب اور امام خمینی کے ارمانات کی تکمیل کے لئے پوری طرح آمادہ اور اٹل ارادہ کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس چناوی سرگرمیوں کے دوران ایران عوام نے یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ انصاف دوست، ترقی ومعنویت پسند اورعوام کی صادقانہ خدمت کے متمنی

ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ اس چناؤ میں عوام کی غیر معمولی شرکت دوستان ملت اسلامیہ کی مسرت اور ان کے دشمنوں کی مایوسی کا باعث ثابت ہوئی۔ میں بارگاہ عالیہ خداوندی میں جبیں سائی کرتے ہوئے ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس ناچیز کو اس عہدہ کے لائق قرار دیا۔ میں پوری ایرانی قوم کا خادم ہوں۔ میری حکومت محبت، رحمت مہربانی، انسانی عظمت کی حفاظت، ہر فرد کے حق کی حفاظت پر مشتمل ہوگی اور ہر ایرانی کی خدمت کرنا میرے لئے باعث شرف وافتخار ہوگا۔

نو منتخب صدر جمہوریہ ایران کی حیثیت سے جاری کئے گئے اپنے پہلے پیغام میں ڈاکٹر احمدی نژاد نے بین الاقوامی سطح پر اعلان کیا کہ میری حکومت درحقیقت صلح وعدالت اور معنویت کی حکومت ہے ہم دنیا کے تمام ملکوں کی طرف خصوص دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اور ہم دنیا کی ان تمام حکومتوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو مستحکم کریں گے جو مفاہمت عدالت اور برابری کی بنیاد پر تعلقات قائم رکھنا چاہتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ایران عزیز کی ترقی مسلسل اور کڑی نظارت، آگاہانہ نقد وتنقید اور عوام کے جائز مطالبات کی تکمیل میں مضمر ہے۔ اور اس چناؤ کے دوران ملت ایران نے یہ ثابت کردیا کہ ایران کی باگ ڈور ایرانی عوام کے ہاتھوں میں ہے۔

واضح رہے کہ ڈاکٹر احمدی نژاد ۱۹۵۶ء میں ایران کے گرمسار نامی علاقے میں ایک عام گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لوہاری کا کام کرتے تھے۔ ان کی سات اولادیں تھیں اور احمدی نژاد کے ساتھ تہران آگئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم تہران میں واقع مختلف مدارس میں ہوئی اس کے بعد انہوں نے تہران انجینئرنگ کالج سے انجینئر کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور لازمی استعداد وامتیازی مرتبہ کے ساتھ انہوں نے انجینیرنگ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلی اور اسی کالج میں لکچرر ہوگئے۔ اب تک دس سے زیادہ لوگ ان کی رہنمائی میں اپنے تحقیقی مقالات پیش کرکے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل

کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر احمدی نژاد اسلامی انقلاب کی کامیابی سے قبل ایک طالب علم کی حیثیت سے اس انقلاب سے وابستہ تھے اور طالب علموں پر مشتمل اسلامی انجمنوں کی تشکیل اور انقلابی اعلانات وپیغامات کی ارسال وترسیل میں ہمہ تن سرگرم رہا کرتے تھے اور انھیں امام خمینی وآیت اللہ خامنہ ای کی قربت حاصل تھی۔ ۱۹۸۶ء میں رضا کارانہ طور پر وہ پاسداران انقلاب اسلامی بریگیڈ میں شامل ہوئے اور فوجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے بعد وہ مختلف بڑے اور ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۹۳ء میں انھیں اردبیل کا گورنر مقرر کیا گیا اور اپنی غیر معمولی خدمات کی وجہ سے وہ ''با امتیاز گورنر'' کی سند حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ۱۹۹۶ء میں وہ دوبارہ اپنے کالج میں درس وتدریس کے کام میں مشغول ہوگئے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد ۲۰۰۳ء میں ان کی غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انھیں تہران کا شہر دار یعنی Mayor تعینات کردیا گیا اور موجودہ صدارتی چناؤ کے دوران ایرانی عوام نے انہیں اپنی بھرپور حمایت کے ذریعہ ملک کے بالاترین عہدہ پر پہونچا دیا۔

مذکورہ پیغام کے علاوہ ڈاکٹر احمدی نژاد نے تہران میں ایک عظیم پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا جس میں سیکڑوں خبر نگاروں اور مقامی وبیرونی اخبار نمائندوں کے علاوہ ایرانی عوام کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اس پریس کانفرنس کے دوران انھوں نے مختلف اہم داخلی اور خارجی مسائل ومعاملات کے بارے میں اپنے خیالات کی وضاحت فرمائی۔ انھوں نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا۔ اسلامی جمہوریہ ایران میں چناؤ ایک امر واقعی ہے جس میں فقط قوم کا ارادہ ہی کارفرما ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ آپ لوگوں نے خود ہی اندازہ کرلیا ہوگا کہ اس چناؤ میں مال ودولت کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہی اور ایرانی عوام کے حافظہ پر تبلیغات وپروپگنڈہ کا کوئی اثر نہیں رہا۔ یہاں تک کہ خارجی دھمکیوں کا بھی الٹا اثر پڑا اور ان دھمکیوں سے ملت ایران کے ارادہ میں ذرہ برابر لچک محسوس نہیں ہوئی۔

انہوں نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اعتدال اور میانہ روی آئندہ حکومت کی بنیادی روش ہوگی اس حکومت میں کسی قسم کی افراط وتفہیم کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ ملک کی خارجہ سیاست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر احمدی نژاد نے بتایا کہ ۷ کروڑ لوگوں کی یہ حکومت صلح اور ہم خیالی کو خارجہ سیاست کی بنیاد قرار دے گی۔ ہم باہمی اور ہمہ جہتی عادلانہ روابط کے فروغ کو ترجیح دیں گے لیکن بیرونی ممالک کے ساتھ محض سیاسی تعلقات کی وسعت کو اہمیت نہیں دی جائے گی بلکہ باہمی ثقافتی اور اقتصادی روابط کی ترقی کو خصوصی اہمیت حاصل ہوگی اور ملک میں سماجی انصاف کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں اپنی بھرپور طاقت وصلاحیت کا استعمال کروں گا۔

ملک میں ایٹمی سرگرمیوں کے بارے میں منتخب صدر جمہوریہ ایران نے کہا کہ ہمارے ملک میں جو ایٹمی انرجی اور ایٹمی ٹکنولوجی موجود ہے وہ ملک کے نوجوانوں کی علمی کوشش کا نتیجہ اور ہماری قوم کا بنیادی حق ہے اور تمام صلح آمیز وعلمی شعبوں میں ترقی حاصل کرنے سے ہمیں محروم نہیں کیا جاسکتا۔ علم کی دنیا میں ترقی حاصل کرنے کے لئے ہمیں اس ٹکنولوجی کی ضرورت ہے اور ہم اپنے جائز حقوق کا استعمال کرتے رہیں گے۔

ملک کی خارجہ سیاست سے جڑے ہوئے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ایران کی خارجہ سیاست پوری طرح واضح اور آئینہ کی طرح صاف ہے۔ ہم دنیا کی تمام قوموں اور تمام ملکوں کے ساتھ عادلانہ روابط کی توسیع کے خواہاں ہیں۔ امریکہ کے ساتھ ہمارے تعلقات کے سلسلے میں اسلامی جمہوریہ ایران اپنی سیاست کا اعلان بارہا کرچکا ہے۔ ہماری قوم خود اعتمادی اور خود انحصاری کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس کو امریکہ کی چندان ضرورت نہیں ہے۔ ایران سے دشمنانہ رویہ رکھنے والے دنیا کے ہر ملک کے ساتھ ہم دوستانہ روابط قائم کرنے چاہتے ہیں۔ پس دنیا کے جو ممالک ایران کے ساتھ روابط کے خواہاں ہیں انھیں اپنی سیاست کو واضح انداز میں پیش کرنا چاہئے تاکہ ہماری حکومت اس کا تجزیہ کرسکے۔

جب ان سے امریکی صدر جارج بش کے اس بیان پر تبصرہ کے لئے کہا گیا جس میں انہوں نے صدارتی چناؤ کو غیر جمہوری قرار دیا ہے تو ڈاکٹر احمدی نژاد نے کہا کہ اظہار خیال ہر شخص کا حق ہے لیکن وہی خیال قابل توجہ ہوا کرتا ہے جس میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور پائی جاتی ہو۔

ایران کی آئندہ حکومت میں انسانی حقوق کی حفاظت مغربی ممالک کی تشویش پر اپنا رد عمل ظاہر کرتے ہوئے ڈاکٹر احمدی نژاد نے کہا کہ آزادی ہمارے انقلاب کی روح اور انسان کے لئے عظیم عطیہ وہدیۂ خداوندی ہے۔ البتہ بعض یوروپی ممالک میں مذہبی آزادی انسانی حقوق کی پامالی یقیناً تشویش ناک ہے۔

غور طلب بات تو یہ ہے کہ ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی اور اسلامی جمہوریہ حکومت کی تشکیل کے بعد چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس ملک کے خلاف فوجی حملات، اقتصادی ناکہ بندی، انسانی حقوق کی پامالی، آزادی خیال کی نابودی، خواتین کے حقوق کی طرف سے لاپرواہی اور دیگر بیشمار و بے بنیاد تبلیغات کا جو لامتناہی سلسلہ شروع کیا گیا تھا وہ آج بھی جاری ہے۔ ساری دنیا اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ ایران گذشتہ چوتھائی صدی کے دوران متعدد بار دہشت گردی کا نشانہ بن چکا ہے۔ ایران کے موجودہ قائد آیت اللہ خامنہ ای اور حالیہ صدارتی چناؤ کے دوسرے اہم امیدوار آیت اللہ رفسنجانی کے سینے پر عالمی دہشت گردی کے داغ آج بھی موجود ہیں اور طاقت ور دھماکہ کے میں ایرانی پارلیامنٹ کی نابودی ایرانی صدر محمد علی رجائی اور وزیر اعظم محمد جواد باہنر اور ایرانی عدالت عالیہ کے سربراہ آیت اللہ محمد بہشتی کی دردناک شہادت ایران کے خلاف عالمی دہشت گردی کی دردناک داستان آج بھی سنا رہی ہے پھر بھی انتہائی بے شرمی کے ساتھ ایران کو دہشت گردی کا سرغنہ قرار دینے کی کوشش جاری ہے اور بے شرمی کا یہ عالم ہے کہ عالمی سطح پر حقیقی جمہوری قدروں کو اُجاگر کرنے والے ایرانی صدارتی اور پارلمانی چناؤ کو غیر جمہوری قرار دیتے ہوئے اس ملک

کے مقبول وہر دلعزیز عوامی رہنما ڈاکٹر احمدی نژاد کو سخت گیر اور انتہا پسند بنا کر پیش کیا جارہا ہے اور اس الزام کی حمایت میں کسی قسم کا کوئی معمولی ثبوت موجود نہیں ہے جبکہ اس کے برعکس ڈاکٹر احمدی نژاد ایک طاقتور اسلامی ملک کی تشکیل کے خواہاں اور اتحاد کو اس الٰہی وانسانی مشن میں کامیابی کا اہم ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ دنیا میں ہر ملک کے عوام کا یہ بنیادی جمہوری حق ہے کہ وہ اپنے ملک میں اپنی پسندیدہ حکومت قائم کریں پس اگر ایرانی عوام اسلامی جمہوری اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنی پسندیدہ حکومت قائم کرتے ہیں تو اس حکومت کے سربراہ کو شدت پسند اور سخت گیر قرار دینا ہرگز مناسب نہیں ہے۔

❁❁❁